UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224598
UNIVERSAL
LIBRARY

کِسان

(اس کے افلاس کے اسباب اور ان کا علاج)

مصنّفہ

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم۔ال اے ایم۔ال سی
ممبر سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی
منیجر دوراہہ شوگر ورکس میرٹھ

مترجمہ

محمود علی خاں صاحب

فہرست

مقدمہ	۷
دیباچہ	۳۳
حصہ اول :۔ مغالطوں کا ازالہ	۵۳
تمہید۔ افلاس کے فرضی اسباب	۵۵
باب اول۔ کیا ہندوستان میں زمین کی اوسط پیداوار کم ہے اور کیا یہ زراعت کے دقیانوسی طریقوں کے سبب سے ہے	۵۷
باب دوم۔ کیا عدم اشتمال آراضی افلاس کا سبب ہے۔	۷۵
باب سوم۔ کیا اضافۂ آبادی افلاس کا سبب ہے	۸۰
باب چہارم۔ کیا بارش کی قلت افلاس کا سبب ہے۔	۹۰
باب پنجم۔ کیا کسان کی فضول خرچی افلاس کا سبب ہے	۹۵
باب ششم۔ کیا مہاجن کسان کے افلاس کا سبب ہے۔	۱۰۳
حصہ دوم: تفتیش	۱۰۹
تمہید۔ پرانا اصول	۱۱۱
باب اول۔ قدیم گاؤں کی تفصیلات	۱۱۵
باب دوم۔ گاؤں کا نظم و نسق	۱۲۰
باب سوم۔ گاؤں کا مہاجن	۱۳۸
باب چہارم۔ تعلیم	۱۴۴

باب پنجم - تبدیلی اور اس کا اثر	۱۵۵
باب ششم - کیا ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے	۱۷۳
باب ہفتم - طرز زندگی یا پیشہ	۱۹۲
حصہ سوم :- زراعت کی خصوصیات	۲۰۳
تمہید - زراعت پر اثر انداز ہونے والی چیزیں	۲۰۵
باب اول - نظام حقوق آراضی	۲۰۸
باب دوم - ملک کی مالی تنظیم اور زراعت کی مالی امداد	۲۲۱
باب سوم - زراعتی تعلیم	۲۳۹
باب چہارم - اقتصادی تنظیم	۲۵۸
باب پنجم - مویشی اور فصلوں کی اصلاح و ترقی	۲۶۷
باب ششم - ذرائع نقل و حمل	۲۸۳
باب ہفتم - سرکاری و غیر سرکاری ادارے	۳۰۰
باب ہشتم - زراعت کی خصوصیات	۳۰۹
حصہ چہارم :- علاج	۳۳۰
باب اول - بالواسطہ علاج	۳۳۲
باب دوم - بلاواسطہ علاج	۳۵۹

شکریہ

اس کتاب کے ترجمہ کے سلسلہ میں پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے استاذ جامعہ اور محمد حسین حسّان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم کا میں خاص طور پر ممنون ہوں کہ انھوں نے نہایت مفید اور گرانقدر مشورے عنایت فرمائے۔

علاوہ ازیں خود جناب مصنف نے زحمت فرما کر شروع سے آخر تک ترجمہ پر نظر ثانی فرمائی۔ میں ان کا بھی بیحد ممنون ہوں۔

کتاب کو عام فہم بنانے کی غرض سے ترجمہ میں اصطلاحات کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

مترجم

ہدیہ

اُنکی میں یہ ناچیز تصنیف اپنے محترم لیڈر اور محب وطن پنڈت مدن موہن مالویہ
کی خدمت میں اُنکی قومی خدمات کے اعتراف اور اظہار عقیدت کے طور پر پیش کرنے
کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

مقدمہ

(از پنڈت مدن موہن مالویہ)

اس کتاب کے قابل مصنف نے مجھے اس پر مقدمہ لکھنے کا اعزاز بخشا ہے۔ چونکہ ملک کے لاکھوں مصیبت زدہ کسانوں کی بہبود سے مجھے خود گہری دلچسپی ہے اس لئے میں بھی پُرخلوص شکریہ کے ساتھ اس فرمائش کی تعمیل کرتا ہوں۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے اور میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک قادرانہ تصنیف ہے۔ گذشتہ صدی کے وسط میں سب سے پہلے دادا بھائی نوروجی نے ہندوستانی کسان کے افلاس اور اس کی بہبود کی جانب لوگوں کو توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد "دیہی ہند" کے متعلق بہت سی مفید کتابیں لکھی گئیں۔ یہ تصنیف ان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کو ایک یہ سہولت بھی تھی جس کی وجہ سے ان کی رائے زیادہ وقیع ہے) کہ وہ خود ایک کاشتکار ہیں وہ ان ہی میں پیدا ہوئے اور ان ہی میں پرورش پائی۔ اس لئے ان کو چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں میں رہنے سہنے اور دونوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔ وہ ان کی مصیبت اور ان کے رنج و غم میں برابر شریک رہے انکی تکلیفوں اور پریشانیوں کو اپنی تکلیف اور

پریشانی سمجھا۔ اس لئے فطرتاً یہ دیکھ کر اُن کو رنج ہونا چاہیئے تھا کہ کسانوں کی حالت روز بروز ردی ہوتی جاتی ہے پھر کوئی تعجب نہیں اگر انھوں نے اس کتاب میں اپنے اس رنج و غم کا پوری طرح اظہار کیا ہے جو ان کو اور ان کی طرح کے اور بہت سے لوگوں کو کسانوں کی حالت میں یہ دردناک انقلاب دیکھ دیکھ کر عرصہ سے ہوتا تھا۔

مصنف ہذا شکست خوردہ ذہنیت کے شکار نہیں ہیں۔ اگرچہ صورت حالات بڑی ہمت شکن ہے لیکن بے بسی کے جذبہ کو آپ نے حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ آپ ہمت اور کوشش کے قائل ہیں قسمت کے قائل نہیں۔ آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کسانوں کی مفلسی اور اس کے اسباب کو غور سے دیکھنے اور سمجھنے میں صرف کیا ہے "دیہی ہند" کے ذاتی علم کے علاوہ آپ نے اس سلسلہ میں بہت کافی ہندوستانی اور بیرونی لٹریچر بھی پڑھا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں سائنس کی امداد اور حکومت کی حمایت سے دوسرے ملکوں میں زراعت نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے اس کا بھی آپ نے نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اس وسیع مطالعے۔ کافی غور و خوض اور ذاتی علم ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے اس مرض کے معقول علاج تجویز کئے ہیں اور آپ کو یقین ہے کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو کسانوں کی حالت بہت کچھ بہتر ہو جائے گی۔ کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام علاج صرف اس خواہش کے ماتحت تجویز کئے گئے ہیں کہ ہندوستانی کسان کی اقتصادی حالت بہر صورت بہتر ہو جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر مصنف نے صرف ان مسائل پر بحث کی ہے جن کا تعلق کسان کی خوش حالی یا زبوں حالی سے ہے مثلاً سکہ۔ شرح تبادلہ۔ شرح بنک اور سرکاری قرضہ جات وغیرہ اور وہ بھی صرف اس حد تک جہاں تک کسان پر ان کا اثر پڑتا ہے۔

یعنی آپ نے نہایت احتیاط سے سیاسی مسائل سے قطع نظر کی ہے۔ مثلاً انتظام حکومت خصوصاً فوج کے غیر معمولی اخراجات وغیرہ۔ حالانکہ بلاشبہ ان چیزوں کا بھی کسان پر بالواسطہ اثر پڑتا ہے۔

مصنف نے جو نتائج اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کئے ہیں ان کی تائید میں بے شمار دلائل بھی دئے ہیں اور یورپین مصنفوں کی رائے بھی پیش کی ہے۔ ظاہر ہے ان مصنفوں پر اس حکومت کے خلاف سیاسی تعصب برتنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا جو ڈیڑھ سو سال سے ہمارے یہاں قایم ہے اور جس پر بلاشبہ رعیت کی موجودہ خراب حالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مصنف نے اپنے موضوع پر اس باقاعدگی اور خوبی سے بحث کی ہے کہ جیسے جیسے پڑھتے جائیے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے حتی کہ علاج کے آخری باب پر پہنچ کر یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو تجویزیں پیش کی گئی ہیں وہ کسان کے موجودہ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔

کتاب کے دیباچے میں قابل مصنف نے اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر زرعی طبقہ کی موجودہ حالت بڑے دردناک الفاظ میں بیان کی ہے اور جائز طور پر انھیں "قابل رحم" کہا ہے۔ کسان کی مفلسی تو ہر شخص کو تسلیم ہے لیکن جیسا کہ سائمن کمیشن نے لکھا ہے "اس کی شدت کا آسانی سے احساس نہیں ہو سکتا حالانکہ ہر جگہ وہ نظر آتی ہے۔" رعیت کے مقروض ہونے کے سلسلہ میں شاہی زراعتی کمیشن نے لکھا ہے "ہمیں یقین ہے کوئی شخص بھی اس حالت کو جاری رکھنا گوارا نہ کرے گا کہ یہ لوگ مقروض پیدا ہوتے ہیں مقروض زندگی گذارتے ہیں اور مقروض مرجاتے ہیں اور اپنا بار اپنے ورثا کی طرف منتقل کر جاتے

ہیں۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ دیہاتوں میں بے شمار ایسے قرضدار موجود ہیں جن کے پاس ایک کوڑی بھی کبھی نہیں ہوتی لیکن ان کو بے یار و مددگار بے کسی کے عالم میں چھوڑ دینا قومی تعمیر کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔" موجودہ حالات میں صورت یہ ہوتی ہے کہ "جہاں فصل تیار ہوئی لگان کے لئے زمیندار غریب کسان کی گردن پر سوار ہو جاتا ہے اور قرض خواہ اس کی کھڑی فصل قرق کر لینے کی دھمکی دیتا ہے۔" اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "اس کسان کو جو فصل تیار کرتا ہے پیٹ بھرنے کے لائق بھی اناج نہیں ملتا اور اسے سب سے ادنیٰ قسم کی خوراک پر قناعت کرنا پڑتی ہے جس میں سب سے کم غذائیت ہوتی ہے۔"

مصنف کی اس رائے کی تائید "ہندوستانی دیہی اقتصادیات" کے مؤلف مسٹر ایس کے آئنگر نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ہندوستانی کسان شکم سیر ہو کر کھانے کے بجائے بھوک کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس چیز کا لحاظ نہیں کرتا کہ آیا اس کی غذا حیات آور اور صحت بخش بھی ہے یا نہیں۔" گویا سب سے بڑا خیال یہی ہوتا ہے کہ جتنے کم سے کم اناج پر بسر کیجا سکتی ہو کرنا چاہئے۔ بمبئی کے ڈائرکٹر زراعت ڈاکٹر ہیرلڈ مین نے بھی مصنف کے اس نظریے کی تائید کی ہے۔ انھوں نے اپنی طویل اور ممتاز ملازمت سے سبکدوش ہوتے وقت لکھا تھا کہ "میرا آخری پیام اس ملک کے باشندوں۔ قومی کام کرنے والوں، اور ارباب حکومت کے لئے یہی ہے کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے کسان کو کافی خوراک مل سکے۔" بقول مصنف حکومت کے ایک ذمہ دار افسر نے شاہی زراعتی کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ "اس ملک میں قحط یا وبا سے اتنے آدمی نہیں مرتے ہیں جتنے غذا کی خرابی اور کمی سے مرتے ہیں۔"

اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں صغر سنی کی اموات دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ ہوتی ہیں اور متوقع عمر سب سے کم ہے۔ یعنی مردوں کی ۲۲٫۵۹ اور عورتوں کی ۲۳٫۲۱ ہے۔ حالانکہ انگلستان میں مردوں کی متوقع عمر ۴۶٫۰۴ ہے اور عورتوں کی ۵۰٫۰۲ ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں آمدنی فی کس کا اوسط ایک تخمینہ کے مطابق تو برطانیہ کی آمدنی فی کس کا بارھواں حصہ اور ایک دوسرے تخمینہ کے مطابق بیسویں حصے سے بھی کم ہے۔ بنکنگ انکوائری کمیٹی کی مرکزی کمیٹی (۱۹۲۸ء) کے مطابق ہندوستان کی آمدنی فی کس کا اوسط ۴۲ روپیہ سالانہ یا ۳½ روپیہ ماہانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "کسان کی خوفناک مفلسی ایک امر واقعہ ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ملک کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ ایسی صورتیں پیدا کرے جس سے کسان کی حالت بہتر ہو سکے اور ملک سماجی انقلاب کی تباہیوں سے محفوظ رہے ورنہ ظاہر ہے کہ اگر مفلسی کا یہی عالم رہا تو ایک نہ ایک دن یہ انقلاب ہو کر رہے گا۔"

کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں مصنف نے ہندوستانی کسان کے افلاس کے اُن چھ اسباب کی تنقیح کی ہے جو عام طور پر بیان کئے جاتے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یا تو یہ غلط ہیں یا بعض صورتوں میں تشریح کے محتاج ہیں۔ حصہ دوم میں جس کا عنوان "تفتیش" ہے آپ نے مرض کی تاریخ بیان کی ہے اور اب تک جس علاج کے وہ زیر مشق رہا ہے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ بڑی حسرت کے ساتھ آپ نے اُس اچھے زمانہ کا تذکرہ کیا ہے جب دیہاتی سماج میں کسان کا درجہ بہت بلند تھا اس کے بعد نہایت افسوس کے ساتھ موجودہ حالت سے اس کا مقابلہ کیا ہے پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس تبدیلی کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ہمیں پرانے زمانے کے دیہاتوں کے

نظام زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس لئے ہمارا ارادہ ہے کہ گذشتہ حالات کی صحیح تصویر کھینچیں تاکہ موجودہ حالات سے پوری طرح مقابلہ ہوسکے۔ ان کے مقابلے ہی سے صحیح صورت ہماری سمجھ میں آسکے گی اور ہم اس مرض کے اصلی اسباب کی تشخیص کرسکیں گے۔"

باب پنجم میں ان تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "جدید دور میں سب سے زیادہ نقصان ملک کی گھریلو صنعت اور دستکاری کو پہنچا ہے۔ یکے بعد دیگرے تمام صنعتیں تباہ کردی گئیں اور لاکھوں کاریگر بے کار ہوگئے اس لئے مجبوراً انھیں کاشتکاری یا کھیتوں کی مزدوری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اس طرح صدیوں کا فن تباہ ہوگیا ..... ہندوستانی کاریگری کے اعلیٰ نمونوں کی جگہ نمائشی اور بھڑکیلی چیزیں رائج ہوگئی ہیں۔ بیرونی ممالک کی بیکار چیزوں سے ہندوستانی بازار بھرے پڑے ہیں اور کروڑوں روپیہ ہندوستانیوں کی جیبوں سے کھنچا چلا جارہا ہے۔ ہندوستان پر جو اقتصادی تباہی آئی ہے دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ مشین کی بنی ہوئی سستی چیزیں دور دراز ملکوں سے لاکر کسان کے گھر پر پہنچادی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کاریگروں کی خدمات کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ اب کسان کی بیوی نہ روئی اوٹتی ہے نہ سوت کاتتی ہے ....

اس طرح بے شمار لوگ بے روزگار ہوگئے ہیں اور سارا بار زراعت پر آپڑا ہے۔ زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد ہندوستان میں آئے دن بڑھ رہی ہے حالانکہ دوسرے ممالک میں برابر گھٹ رہی ہے۔" شاہی زراعتی کمیشن کی تصدیق پیش کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ گذشتہ تیس برس میں زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد میں ۱۲ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ "کوئی اسے تسلیم نہیں کرسکتا کہ ہندوستان

صنعتی ملک بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر لوگ پختہ ارادہ کرلیں اور حکومت کافی امداد دے اور سرپرستی فرمائے تو ہندوستانی بہت تھوڑی مدت میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور زراعت کے بجائے صنعتوں میں لگ سکتے ہیں۔"

حصہ سوم میں مصنف نے زراعت کی وہ خصوصیات بیان کی ہیں جو دوسری صنعتوں میں نہیں پائی جاتیں تاکہ ناظرین کو اس اہم فن کی پیچیدگیوں کا اندازہ ہوسکے۔ تمہید میں آپ نے ان تمام چیزوں کا تذکرہ کیا ہے جو زراعت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اُن خاص خاص چیزوں میں سے جن پر زراعت کی فلاح منحصر ہے سب سے پہلی جگہ آپ نے نظام حقوق آراضی کو دی ہے اور باب اول میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے باب میں آپ نے ملک کی مالی تنظیم خصوصاً زراعت کو مالی امداد دینے اور درآمد پر محصول لگانے کے مسائل پر بحث کی ہے۔ قیمتوں پر جو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں ان میں سے سب سے پہلے آپ نے ملک کی کرنسی پر توجہ کی ہے۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں کے استحکام پر رپورٹ پیش کرنے کے لئے حال ہی میں انگلستان میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس کمیٹی نے جان اسٹورٹ مل کے اس مشہور نظریہ کی تائید کی تھی کہ "کرنسی کے اضافہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور کمی سے قیمتیں گر جاتی ہیں مسئلہ کرنسی کا یہ بالکل ابتدائی اصول ہے اور اس کے بغیر ہم کوئی مسئلہ حل نہیں کرسکتے۔"

عرصہ سے ہندوستانی تاجر کرنسی کے مصنوعی انتظام کے خلاف احتجاج کرتے آئے ہیں۔ یعنی روپیہ کی مصنوعی قیمت برقرار رکھنے کے لئے حکومت نے جو ترکیبیں اختیار کی ہیں اس سے انھیں سخت اختلاف ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۲۶ء سے

سنہ ۳۰ء تک یعنی صرف ۴ سال میں مروجہ سکہ میں ۹۹ کروڑ ۶۷ لاکھ کی کمی ہوگئی اس کی وجہ سے کسان کو ہر سال بلاسبب سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے "کسان کا مفاد اسی میں ہے کہ سونے کا سکہ جاری کیا جائے تاکہ دوسرے ممالک کے سکوں سے خود بخود تبادلہ ہوسکے۔ اگر ملک میں سونے کا سکہ جاری ہو تو پھر تبادلہ کے لئے مصنوعی طریقے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اگر سونے کا سکہ جاری نہ کیا جائے تو پھر چاندی کو تبادلہ کا معیار قرار دیا جائے" حکومت نے روپیہ کی قیمت ایک شلنگ ۶ پنس مقرر کرکے سخت زیادتی کی کیونکہ ملک متفقہ طور پر ایک شلنگ ۴ پنس کا حامی تھا" اس طرح کسان کو گویا مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال بہت سستے داموں میں فروخت کردے۔ روپیہ کو پونڈ سے منسلک کردینے سے اور اپنی قیمت خود قایم کرنے کا موقع نہ دینے سے بھی کسان کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ یعنی اگر ہندوستان دوسرے ممالک کو اپنا مال بھیجے تو ایک پونڈ کے عوض بیس روپیہ کا مال بھیجنا پڑتا ہے لیکن اگر انگلستان کو مال بھیجے تو ایک پونڈ کے عوض صرف ۱۳ روپیہ ۴ آنہ کا مال بھیجتا ہے۔ ملتا بہرحال ایک پونڈ ہے لیکن اس طرح ہندوستان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال صرف انگلستان بھیجے . . . . . زرعی مال کی قیمتوں کے سلسلہ میں ہندوستان کے راستہ میں ایک ایک قدم پر رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں جس کی وجہ سے قیمتیں بہت زیادہ گر جاتی ہیں اور کسان کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے"

ہندوستان میں شرح بنک بھی ناجائز طور پر زیادہ رکھی جاتی ہے۔ اس سے بھی کسان کو نقصان پہنچتا ہے" یہاں شرح بنک ۵ فیصدی سے کم نہیں ہونے دیجاتی حالانکہ دوسرے ممالک میں عموماً ۳ فیصدی رہتی ہے . . . . . اگر شرح بنک

کم کر دیجائے تو کسان کو بھی کم شرح سود پر قرض مل سکے۔" سرکاری قرضوں سے بھی قیمتوں پر بہت خراب اثر پڑتا ہے۔ حکومت بہت زیادہ شرح سود پر قرض لیتی ہے۔ اس طرح ملک کا تمام پس انداز سرمایہ سرکاری خزانہ میں چلا جاتا ہے اور نئی صنعتوں یا زرعی اصلاحوں کے کام نہیں آسکتا۔" فصل کٹنے کے وقت کسان کو روپیہ کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وقت حکومت قرضہ لیتی ہے اور شرح سود بڑھا دیتی ہے جس سے قیمتیں گر جاتی ہیں۔" عام طور پر فصل کٹنے کے وقت کرنسی میں اضافہ ہونا چاہئے اور بعد کو جب مانگ کم ہو جائے تو کرنسی بھی کم ہو جانا چاہئے۔ اس طرح فصل کو کم قیمت پر فروخت کرنے سے کسان کو جو نقصان ہوتا ہے اس سے وہ محفوظ رہ سکتا ہے۔"

محصولوں کے سلسلہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ" حال ہی میں شکر کے کارخانوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر مناسب طریقہ سے محصول لگایا جائے تو اس سے صنعتوں کو بہت کچھ امداد مل سکتی ہے۔"

باب سوم میں مصنف نے عام تعلیم اور زرعی تعلیم پر ایک نظر ڈالی ہے اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ یہ ناکافی بھی ہے اور نامکمل بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دراصل عدم ترقی کی جڑ یہی چیز ہے۔

اسی طرح باب چہارم میں انھوں نے زراعت کی اقتصادی تنظیم۔ امداد باہمی کے ذریعہ خرید و فروخت کا انتظام۔ امداد باہمی قرضہ۔ زرعی قرض کی انجمنیں اور امداد باہمی بیمہ پر بحث کی ہے اور ہر موضوع پر نہایت مفید مشورے دئے ہیں۔

باب پنجم میں آپ نے مویشیوں کی اصلاح اور سستے اور بے میل دودھ کی فراہمی کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں

کہ "اس ملک میں جہاں کسی زمانہ میں دودھ گھی کی افراط تھی اب دنیا کے تمام ملکوں سے کم دودھ استعمال ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں صغر سنی کی اموات سب سے زیادہ ہیں" اس سلسلہ میں آپ نے چند تجویزیں بھی پیش کی ہیں کہ کس طرح اچھا اور سستا دودھ لوگوں کو افراط سے مل سکتا ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ سفارش کی ہے کہ شہر والوں کے لئے دودھ مہیا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ گوشت خور ہونے کی وجہ سے یہ ان کی صحت کے لئے نہایت ضروری ہے اور چونکہ اچھا دودھ انھیں آسانی سے نہیں ملتا ہے اس لئے میونسپلٹیوں کو ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ لوگوں کو اچھا اور سستا دودھ کافی مقدار میں مل سکے" مصنف لکھتے ہیں کہ "دودھ کے معاملہ میں موجودہ نقائص کی یہ وجہ بیان کیجاتی ہے کہ بے کار جانوروں کی نسل بڑھنے دیجاتی ہے اس لئے ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ خیال قطعی بے بنیاد ہے۔ عملی حیثیت سے اس چیز کا لحاظ کرتے ہوئے کہ "ہندو مذہبًا گائے کو مقدس سمجھتے ہیں بوڑھے اور بے کار جانوروں کو ہلاک کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیئے۔ یہ مسئلہ تو صرف زیادہ چراگاہوں کا انتظام کرنے سے اور زیادہ چارہ مہیا کرنے سے حل ہو سکتا ہے"

باب ششم بھی ذرائع نقل و حمل کے متعلق مفید مشوروں سے پُر ہے جس میں خاص طور پر بہت سے ضروری مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً ریلوں کا گراں ہونا یعنی زراعتی پیداوار کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے پر بہت زیادہ کرایہ کا مضر اثر۔ کرایہ کے کم کرنے کی ضرورت۔ بحری رسل و رسائل کے فائدے بجلی اور لاسلکی کا انتظام ضمنی دیہی صنعتوں کی امداد۔ نئے جنگل لگانے کی اہمیت وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح باب ہفتم میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے قیام پر زور دیا ہے تاکہ مرکزی اور مقامی طور پر زرعی پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جا سکے مصنف نے اس سلسلہ میں پرزور سفارش کی ہے کہ حکومت ہند اور صوبہ جاتی حکومتوں کی ایک مقررہ زرعی پالیسی ہونا چاہئے اور کسانوں کی بہبودی ہمیشہ ان کا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ سرکاری افسروں کو چاہئے کہ اعتراض کرنے والوں اور قومی کام کرنے والوں کو دشمن نہ سمجھیں بلکہ ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کریں اور ان کے مشورے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔"

کتاب کے پہلے تین حصوں میں ان متعدد امور پر مکمل اور مفصل بحث کی گئی ہے جو کسان کی مفلسی کا سبب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد چوتھے حصہ میں مصنف نے وہ علاج تجویز کئے ہیں جن سے آپ کو امید ہے کہ افلاس خوشحالی سے بدل جائے گا۔ آپ نے اس بنیادی اصول پر زور دیا ہے کہ عوام اور حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ کاشتکار کے تحفظ کی تدبیریں کریں۔ اور سفارش کی ہے کہ ہمیں جلد از جلد ایسا پروگرام مرتب کرنا چاہئے جس سے کسان کی حالت سدھر سکے۔

پہلے باب میں آپ نے وہ خاص خاص علاج بیان کئے ہیں جن سے یہ مصیبت دور ہو سکتی ہے۔ سوویٹ روس نے اپنے کاشتکاروں کی بہبودی کے لئے جو پروگرام طے کیا ہے مصنف نے اپنے آپ کو اس کا پابند نہ کرتے ہوئے وہاں کی قومی خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کے جذبہ کی تائید کی ہے یعنی روس کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ "قوم کا بس ایک مرتبہ یہ طے کرنا تھا کہ پنج سالہ اسکیم پر عمل کیا جائے کہ ہر مرد و زن اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے حکومت کے دوش بدوش کھڑا ہو گیا۔ . . .

اس لئے قوم کو قعرِ مذلت سے نکالنے کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم خود اپنی قسمت کے بدلنے کا فیصلہ کرلے"۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے "ہمیں یقین ہے کہ تمام مشکلوں، رکاوٹوں اور کمزوریوں کے باوجود اگر ایک مرتبہ قوم یہ طے کرلے کہ اصلاح و ترقی کے مقررہ پروگرام پر عمل کرنا ہے تو خوشحالی کا دور دورہ پھر شروع ہوجائے گا . . . . اور اگر قوم پوری سرگرمی سے کام شروع کردے تو حکومت بھی اشتراک عمل کرنے پر مجبور ہوگی"۔" دوسری نہایت ضروری چیز یہ ہے کہ کسان کے اس جمود اور بے عملی کو دور کیا جائے جو تقدیر پرستی عموماً پیدا کردیتی ہے اگر کسی قوم یا طبقہ میں سے خود اعتمادی مفقود ہوجائے تو ترقی کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلسل اور طویل مصیبت نے عوام میں ایسی بے حسی پیدا کردی ہے کہ اگر انھیں ترقی کی صورت معلوم بھی ہوجائے تب بھی وہ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے۔ لہٰذا سب سے پہلے ان میں حوصلہ مندی کا تخیل پیدا کرنا چاہیئے۔ اور انھیں یقین دلانا چاہیئے کہ آسودگی اور خوشحالی کے لئے جس مستعدی۔ ذہانت اور جن وسائل کی ضرورت ہے قدرت نے انھیں وہ سب کچھ عطا کئے ہیں۔ اگر انھیں تعلیم یافتہ بھائیوں کی ہمدردی اور امداد کا مزید اطمینان دلایا جائے تو ان کی زندگی کا سارا منظر ہی بدل جائے اور درخشاں اور امید افزا نظر آنے لگے پس یقین کیجئے کہ اس وقت نصف جنگ فتح ہوگئی . . . . حوصلوں کی پستی اور تقدیر پرستی نے ہمارے سینوں میں امیدوں کو فنا کردیا ہے اور ہماری روحوں کو کچل ڈالا ہے اس لئے ہمیں پژمردہ دلوں میں امید اور ہمت کی برقی رو دوڑانا چاہیئے۔ خود اعتمادی کا سبق سکھانا چاہیئے اور مستقبل کی امیدوں کو بیدار کرنا چاہیئے۔ اگر ہم واقعی اس پر عمل شروع کردیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کسان زیادہ عرصہ تک قسمت کا کھلونا بنے رہیں۔ پستی کا ہلی

اور نا امیدی کے دیو کا شکار ہوں اور مستقبل پر اعتماد پیدا نہ ہو سکے . . . . امید کی یہ فضا پیدا کرنے کے لئے منظم کوشش اور عزم بالجزم کی ضرورت ہوگی۔ سارے ملک میں اس پروپگنڈے کو کامیاب بنانے کے لئے ایک مضبوط جماعت ترتیب دینا ہوگی۔ اور کام کرنے والوں کو زبردست مشکلات اور ہمت شکن مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" مصنف نے اس چیز کو صاف کر دیا ہے کہ وہ قدیم سماج کو نئے سرے سے زندہ کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "اب لوگوں کو قدیم اور ابتدائی طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرنا ایک مہمل سی بات ہوگی . . . . . اس وقت ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم اس نام نہاد مہذب دنیا کے موجودہ اصولوں کی پیروی کریں۔" اس مقصد کے لئے عوام کو تنظیم کی برکتیں بتانے کی ضرورت ہے۔ جدید تہذیب میں بھی یہ کامیابی کی پہلی سیڑھی سمجھی جاتی ہے . . . . آپ چاہے کتنے ہی طاقتور کیپ نہوں لیکن اگر آپ غیر منظم ہیں تو منظم دنیا کے مقابلے پر ٹھہر نہیں سکتے . . . تنظیم کے لئے خاص طور پر تنظیم کی نہیں بلکہ مستقل تربیت اور مکمل نظم کی ضرورت ہے۔ دنیا کی اقوام میں سرفراز ہونے کے لئے سب سے پہلے ہمیں تربیت اور ڈسپلن حاصل کرنا چاہیئے۔

یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا کہ "دوسرے ملکوں نے سائنس میں جو ترقی اور ایجادیں کی ہیں ان کی موجودگی میں یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہندوستانی محض زمین کی پیداوار پر بسر کر سکیں . . . . علاوہ ازیں بین الاقوامی رسل و رسائل کے موجودہ دور میں یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اپنے درواز ے ساری دنیا پر بند کر لیں اور دوسرے ملکوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں . . . . دوسرے ملکوں کی قوت خرید ہماری قوت خرید سے بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اناج اور دیگر اشیاء خوردنی باہر بھیجدی جاتی ہیں اور یہاں

ہزاروں آدمی فاقوں مرتے ہیں"۔ مصنف نے اس امر پر جس کا بار بار اعادہ کیا جا چکا ہے خاص طور پر زور دیا ہے کہ "جبتک ہندوستان تیار شدہ سامان کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج رہے گا لازمی طور پر وہ اپنی زراعتی پیداوار اس کے بدلے میں باہر بھیجتا رہے گا۔ اس لئے جب تک صنعت وحرفت کو یہاں رواج نہ دیا جائے موجودہ حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی گویا اس مرض کا صرف یہی علاج ہے کہ جو کثیر آبادی آج زراعت پر بسر کر رہی ہے اس میں سے کچھ لوگوں کو کسی دوسرے کام پر لگایا جائے"۔ قحط کمیشن نے اب سے ۵۰ سال پہلے اس امر پر بہت زور دیا تھا۔ اور بہت سے ماہرین بھی برابر یہی مشورے دیتے آئے ہیں لیکن اس ۵۰ سال میں کمی ہونا تو کجا۔ زراعت پر بسر کرنے والی آبادی ۷۰ فیصدی سے بڑھ کر ۷۳ فیصدی ہوگئی ہے۔

صنعت وحرفت کی ترقی کے راستے میں ہندوستان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ دوسرے ملک والوں کی یہاں حکومت ہے "جنھیں اہل ملک سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور جو ملک کے صنعتی مفاد کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔" حکومت کی امداد سے جاپان نے صنعت وحرفت کے سلسلہ میں تھوڑے ہی عرصہ میں حیرت انگیز باتیں کر دکھائیں اور آج ہندوستان ہی میں تمام ملکوں کے مقابلے میں ستا مال بیچ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماضی سے قطع نظر ہمیں امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہماری گورنمنٹ بھی ہماری قومی صنعتوں کی امداد کے لئے اپنا ہاتھ بڑھائیگی لیکن اس عرصہ میں ہمیں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہ چاہیئے۔ بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ حکومت کی امداد کے بغیر بھی بعض صنعتوں کا انتظام کرنا ہمارے امکان میں ہے۔ اگر باقاعدہ کوشش کیجائے تو ہر ضلع میں صنعتی کاموں پر

لگانے کے لئے کافی روپیہ جمع ہوسکتا ہے . . . . لیکن یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ملک میں ولایتی مال کے مقابلے میں دیسی مال کی سرپرستی کی عام فضا پیدا ہو جائے۔ سرمایہ دار تو عوام سے صرف اتنا اطمینان چاہتے ہیں کہ ان کے تیار کردہ مال کی سرپرستی کیجائے گی اور جہاں انھیں یہ اطمینان ہوگیا تو وہ بلا پس وپیش صنعتی کاروبار میں روپیہ لگانے اور ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے . . . . جس ملک کا خرید و فروخت کا بازار اتنا وسیع ہو اسے بھلا حکومت یا دوسرے ملکوں کی امداد کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں مگر ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کا بچہ بچہ قسم کھالے کہ اپنے ہی ملک کا بنا ہوا مال خریدے گا چاہے کچھ قربانی ہی کرنا پڑے اور چاہے وہ مال کچھ بھدا اور مہنگا ہو یا دیر پا نہ ہو . . . . اگر ہم یہ اصول طے کرلیں تو ہماری تمام اقتصادی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہزاروں آدمی فوراً زراعت چھوڑ کر صنعت و حرفت میں لگ جائیں گے۔ زمین کے معاملہ میں مقابلہ کم ہو جائے گا۔ لگان میں تخفیف ہو جائے گی۔ زراعتی پیداوار کی قیمت بڑھ جائے گی اور کسان آسودہ اور خوش حال ہو جائے گا۔ اس لئے کسانوں کو اپنے ذاتی نفع کی خاطر یہ عہد کرنا چاہئے کہ صرف اپنے ہی ملک کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں گے۔ مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "دیسی مال خریدنے کا عہد کرنے سے کسان کو اپنی حیثیت سے زیادہ قربانی کرنا ہوگی لیکن بہرحال اسے اس قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے کیونکہ اسی میں اس کی نجات ہے اور اگر وہ سرتاسر سودیشی کا حامی نہ ہوگا تو اس کی تباہی یقینی ہے۔"

اس کے بعد مصنف نے تعلیم کی جانب توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سب سے

پہلی اور اہم چیز یہی ہے کہ عوام کو جن میں کسان بھی شامل ہیں لکھنا پڑھنا سکھایا جائے
. . . . . لازمی ابتدائی تعلیم ملک کی اہم ترین اور شدید ترین ضرورت ہے اور اس
ضرورت کا پورا کرنا دنیا کی ہر حکومت کا اولین فرض ہے۔" ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے
پرزور سفارش کی تھی کہ عوام میں ابتدائی تعلیم پھیلانے کی تدبیر کیجائے۔ ۱۸۹۳ء میں
حکومت نے ڈاکٹر وولکر کو ملک کے زرعی حالات کی تفتیش کے لئے مقرر کیا تھا انھوں نے
بھی یہی سفارش کی تھی کہ زرعی ترقی کے لئے عام ابتدائی تعلیم سب سے پہلی ضروری
چیز ہے اس کو ۴۹ سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن اب تک عوام میں تعلیم پھیلانے کے
لئے حکومت نے کوئی معقول کارروائی نہیں کی ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے
ہندوستان میں ۱۲ فیصدی مرد اور ۸ر۱ فیصدی عورتیں تعلیمیافتہ تھیں۔ سائمن
کمیشن نے بھی لکھا ہے کہ "جہاں تک زیر تعلیم طلبہ کی تعداد کا تعلق ہے۔ اصلاحات کے
نفاذ کے بعد سے غیر معمولی ترقی ہوئی ہے" اسی زمانہ سے ابتدائی تعلیم کے اخراجات
میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی ترقی نہایت ہی حقیر ہے بخلاف
اس کے ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے مطابق سوویٹ روس میں گذشتہ چودہ سال میں تعلیم
کا اوسط اتنا بڑھا کہ مردوں میں ۵ر۶۵ فیصدی اور عورتوں میں ۰ر۲۰ فیصدی ہوگیا۔
شاہی زراعتی کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں صحیح لکھا ہے کہ "عام تعلیم اور تعلیم نسواں
کے اعداد سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کے کمزور ترین پہلو کیا
ہیں۔ تعلیم کا سب سے ضروری مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کم از کم معمولی طور پر لکھنا پڑھنا
سکھایا جائے۔ اس کے بغیر دیہاتوں میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔" مصنف نے عوام
سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ اپنی ذاتی کوششوں سے ابتدائی تعلیم کو رواج دیں۔

وہ لکھتے ہیں" ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل وطن نے ابتک یہ محسوس ہی نہیں کیا ہے کہ تعلیم غذا سے بھی زیادہ ضروری اور قابل قدر چیز ہے۔ اگر کہیں وہ یہ محسوس کر لیتے تو ابتک جتنا روپیہ کالجوں، ہائی اسکولوں اور دوسرے گراں خرچ مدارس پر صرف کیا گیا ہے وہ سب ابتدائی تعلیم پر خرچ کیا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ لازمی تعلیم آئین ساز جماعتوں کی امداد کے بغیر رائج نہیں ہو سکتی لیکن جیسا ہم نے اکثر لکھا ہے رائے عامہ کی طاقت حکومت کی طاقت سے کسی طرح کم نہیں ہوتی ..... اس لئے ہم ہر طبقہ کے سیاسی رہنماؤں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ عوام میں تعلیم پھیلانا اپنا پہلا مقصد قرار دیں ..... قومی بیداری کی رضاکارانہ جدوجہد کے سلسلہ میں کاش گاؤں کا ہر اسکول طالب علموں سے بھر جائے اور کاش ہر بالغ مرد اور عورت اپنے قریب ترین پنڈت کے پاس جاکر ان سے تعلیم حاصل کرنے کی درخواست کرے اگر ہر مندر۔ مسجد۔ گرجا۔ دھرم شالہ اور چوپال کچھ عرصہ کے لئے مدرسہ بن جائے تو بہت تھوڑے عرصہ میں ہم لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔ اگر بے روزگار تعلیم یافتہ لوگ سچے دل سے اس کام پر لگ جائیں تو آئندہ نسلیں ان کی احسانمند ہوں گی اور انھیں کم از کم کھانے پہننے کو بھی کافی مل جائے گا۔ اس کوشش میں ہر فرد بشر کو ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے ..... اگر حکومت یا پبلک کسی خاص مقصد کے حاصل کرنے کا عہد کر لے تو تمام مشکلات اس طرح رفع ہو جائیں گی جیسے گرمی سے برف پگھل جاتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ تمام اصلاحات سے پہلے قوم کے چہرے سے جہالت کا یہ بدنما داغ مٹانے کی ضرورت ہے۔" قوی اُمید ہے کہ تعلیم کی برکات حاصل کرنے کے لئے عنقریب ساری قوم ایک منظم جدوجہد کرے گی۔

آخری باب میں مصنف نے وہ خاص خاص علاج تجویز کئے ہیں جن سے کسان کے افلاس کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ "کس طرح ہم کسانوں سے صحیح قسم کی خوراک کافی مقدار میں پیدا کرائیں اور اس کا انتظام کریں کہ انھیں کھانے کے لئے بھی کافی ملجائے اور بازار کی حالت بھی اور زیادہ خراب نہونے پائے . . . اس وقت کسان پیدا کرنے والا اور بیچنے والا۔ مزدوری کرنے والا اور سرمایہ لگانے والا سب کچھ خود ہی ہوتا ہے۔ ایک بے پڑھے کسان سے جو تجارتی اصولوں سے بالکل ناواقف ہوتا ہے ان تمام اہلیتوں کی توقع کرنا گویا محالات کی توقع کرنا ہے۔ ایسی صورت میں اس امر کی ضرورت ہے کہ کسان اور تاجر کو مشترک کر دیا جائے۔ ان دونوں کو باہمی رضامندی سے ایک دوسرے سے منسلک کر دینا چاہیئے تاکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی کمی کو پورا کر سکے۔

روس نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا ہے کہ تمام زمین حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لی ہے۔ ہر شخص سے کام لیتی ہے اور اسے کھانے پہننے کو دیتی ہے۔ ہمارے بہت سے اہل ملک کو یہ طریقہ بہت پسند ہے لیکن (مصنف نے لکھا ہے کہ) ہمارے نزدیک یہ صحیح علاج نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اس غریب سے جس کی آپ اصلاح اور ترقی کرنا چاہتے ہیں اس کا پیشہ چھین لیتے ہیں اور اسے عمال حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ روسی نظام کا بنیادی اصول بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند اعلیٰ افسر ساری قوم کے عوض کام کریں اور سوچیں گویا اس نظام میں انفرادی طور پر عمل کی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے ایک انسان دوسرے کا آلۂ کار بنا دیا جائے۔ ہندوستان میں کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوگا کہ افسروں

کو اتنے وسیع اختیارات دیدئے جائیں . . . . علاوہ ازیں انسان کو ایک مشین تصور کرنے یعنی دوسرے کی مرضی کے مطابق کام کرنے کا تخیل ہی ہندوستانیوں کے نزدیک نہایت مکروہ ہے۔ ہندوستانی عقیدہ تو یہ ہے کہ خدا نے ہر شخص کو اپنے اعمال و افعال کا مختار کل بنایا ہے۔ اس لئے اس قسم کی کوئی اسکیم یہاں نہ تو کامیاب اور نہ مقبول ہو سکتی ہے . . . . ہمیں اس سے قطعی اتفاق نہیں ہے کہ کسان کو اپنی آزاد پیشہ کی وجہ سے سماج میں جو عزت کسی وقت حاصل تھی اس سے وہ محروم کر دیا جائے لیکن ساتھ ہی ہم اسے فاقوں مرتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

"ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ خوردنی اشیاء آج کل کے مقابلے میں زیادہ پیدا کیجائیں اور یہ زائد پیداوار کسان کے ذاتی استعمال کے لئے چھوڑ دی جائے تاکہ بازار کا نرخ بھی گرنے نہ پائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہماری تجویز یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہوشیار اور مخلص لوگ مشترک اور اجتماعی کاشت کی تنظیم کریں اور کسانوں میں اسے رواج دیں۔"

اجتماعی کاشت سے مصنف کی مراد یہ ہے کہ "گاؤں کے تمام کسانوں کو چند گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے اور وہ لوگ سارا کام مشترکہ کریں جن کسانوں کے کھیت قریب قریب ہوں انھیں اس خیال سے کہ بہتر طریقہ پر کاشت ہو سکے ملا دینا چاہئے اور تمام وسائل کو ایک جگہ جمع کر دینا چاہئے تاکہ کافی بڑا کھیت نکل آئے اور موجودہ چھوٹی چھوٹی جوتوں کو جن پر اب بعض وجوہ سے کافی توجہ صرف نہیں کیجا سکتی زیادہ اچھی طرح کاشت کیا جا سکے۔ ہر کاشتکار کو محنت اور سرمایہ کے تناسب سے جنس کی صورت میں معاوضہ ملنا چاہئے۔ اس طرح پھر کھیتوں کو یکجا کرنے کی ضرورت

بھی باقی نہ رہے گی۔ اور زرعی سہولتیں (یعنی بہتر قسم کے اوزار۔ بیج اور آبپاشی وغیرہ) بھی آسانی سے مہیا کیجا سکیں گی۔ روپیہ بھی جو آج کمیاب ہے بہتر ضمانت کی وجہ سے کم شرح سود پر مل سکے گا اور مختلف لوگوں کی ذہانت اور تجربہ سے اجتماعی فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔" ان اقتصادی فوائد کے علاوہ "بہت سے بالواسطہ فائدے بھی پہنچیں گے مثلاً کاشتکاروں کو تنظیم کی قوت کا احساس ہو جائے گا۔ منڈی ان کے موافق ہو گی۔ وہ بہتر قسم کی فصل مہیا کر سکیں گے۔ مقدمہ بازی کی لعنت بڑی حد تک دور ہو جائے گی اور ان کا مستقبل زیادہ درخشاں اور امید افزا ہو جائے گا۔"

مشترک[1] کاشت سے مصنف کی مراد "زراعت کے ساتھ ساتھ دودھ گھی کے کام سے بھی ہے۔ اس کی وجہ سے دودھ دہی کسان کے کھانے میں آ سکیگا۔ اگر وہ خالص دودھ اور مکھن نہ بھی استعمال کر سکے گا تو کم از کم مکھن نکلا ہوا دودھ تو اسے ملے گا۔ جو بہرحال موجودہ خوراک سے تو بہتر ہی ہو گا۔ بہترین قسم کا کھاد کثرت سے مل سکے گا۔ اس کے علاوہ کسان اور اس کے خاندان کو کافی کام بھی مل جائے گا۔ مشترک کاشت اور اجتماعی کاشت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ایک کے بغیر دوسری کامیاب ہو سکتی ہے . . . تفصیلات تو مقامی حالات کے

---

(۱) Mixed farming. کے لئے اردو میں کوئی اصطلاح نہیں ہے اور مشترک کاشت سے اس کا صحیح مفہوم بھی ادا نہیں ہوتا ہے لیکن چونکہ تشریح سے ترجمہ کی خوبی میں نقص پڑتا تھا اس لئے مجبوراً "مشترک کاشت" کی اصطلاح ہی استعمال کی گئی ہے۔

مطابق طے کیجا سکتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"لیکن مصنف کے نزدیک یہی سب سے اہم اور عملی علاج ہے۔ مصنف کو کامل یقین ہے اور مجھے بھی ان سے پورا اتفاق ہے کہ اگر بے غرض اور ایماندار لوگ سچے دل سے اس اسکیم پر عمل کرنا شروع کر دیں تو اس کا کامیاب ہونا یقینی ہے اور غریب کسان کی بہت سی مصیبتیں اس سے دور ہو جائیں گی۔ اس لئے میں پرزور سفارش کرتا ہوں کہ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے معقول اور منظم کوشش ہونا چاہیئے۔

مصنف نے دوسرا علاج یہ تجویز کیا ہے کہ "نظام حقوق آراضی" میں بنیادی اصلاح ہونی چاہیئے۔ وہ پرزور درخواست کرتے ہیں کہ "نظام حقوق آراضی" اس طرح ترتیب دینا چاہیئے جس سے کسان کو یہ اطمینان رہے کہ زمین کی پیداوار میں سے لگان وغیرہ ادا کرنے کے بعد میرے لئے بھی کچھ بچ رہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے ملک کے ہر بہی خواہ کی یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کسان کو جو کھیت پر محنت اور مشقت کرتا ہے اپنی محنت کا کافی معاوضہ ملجائے۔ وہ قوم کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی جو اس ابتدائی اصول کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اس شخص کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھتی جو ملک کے لئے کھانے اور کپڑے کا سامان مہیا کرتا ہے" میری رائے میں ہر معقول شخص اس رائے کی تائید کرے گا مصنف نے لکھا ہے کہ پہلے پہل برطانوی دور میں زمیندار کو زمین کا مالک تسلیم کیا گیا۔ انھوں نے اس طریقے کے بہت سے نقائص پیش کئے ہیں جس میں کسان خود زمین کا مالک نہیں ہوتا اور اس امر پر زور دیا ہے کہ کسان کو زمین کا مالک قرار دیا جائے۔ زمیندار اور کسان دونوں کا اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہے اس لئے بہت غور و خوض کے بعد اس کا فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال مصنف اگرچہ کسان

کی ملکیت کے زبردست حامی ہیں لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستان میں بالشوزم نہیں چاہتے وہ لکھتے ہیں کہ "ہماری یہ تجویز نہیں ہے کہ زمینداروں کو ان کی مقبوضہ جائداد سے جو انھیں وراثت میں ملی ہو یا انھوں نے خریدی ہو ساقط الملکیت قرار دیا جائے کیونکہ یہ ناقابل عمل ہے۔ ہم انفرادی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قوم یا ملک کے مفاد کی خاطر انفرادی مفاد کو قربان کر دینا چاہیئے۔ ہماری یہ رائے ہے کہ حکومت اور پبلک دونوں کو متواتر اور مسلسل یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ کاشتکاروں کو حق ملکیت پہنچ جائے۔ حکومت کی امداد سے یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔" مصنف نے کسان کو روپیہ مہیا کرنے کی متعدد صورتیں تجویز کی ہیں تاکہ وہ علالت کے ذریعہ سے مناسب قیمت پر اپنی زیر کاشت زمین خرید سکے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "حکومت کو کم از کم ساکھ والے کسانوں کو تو کم شرح سود پر روپیہ مہیا کرنا چاہیئے . . . . زمین کی قیمت قسط وار وصول کیجائے۔ کسان اپنے لگان کے ساتھ قسط بھی ادا کر دیا کرے اور مقررہ میعاد کے بعد وہ اپنی زمین کا مالک ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے زمینداروں کو نقصان پہنچائے بغیر کاشتکار آراضی کے مالک ہو سکتے ہیں۔"

دوسرے ممالک میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے پیش نظر اس مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہوگی ملک کا مفاد اسی میں ہے کہ ہر زمیندار ہر کاشتکار اور ہر اس شخص کو جس کا ملک کے نظام حکومت میں آئندہ کوئی حصہ بھی ہوگا اس مسئلہ کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے اور وقت آنے پر نیک نیتی اور انصاف پسندی سے اسے حل کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کے خاص حالات کا اندازہ کرتے ہوئے

مستقبل قریب میں اس مسئلہ کے متفقہ فیصلے کی کوئی امید نہیں معلوم ہوتی کہ کسان کو کم شرح سود پر رقم مہیا کیجائے تاکہ وہ اپنی زیر کاشت زمین زمیندار سے خرید سکے۔ اور اگر یہ تصفیہ ہو بھی جائے تب بھی مالی مشکلات کی وجہ سے عرصہ تک اس اصول کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکے گا۔ لیکن اس عرصہ میں اکثر زمینداروں کے اشتراک عمل اور قانون ساز جماعتوں کی امداد سے دوسری اہم اور ضروری کارروائیاں کیجا سکتی ہیں جن سے کسان کی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔ بہرحال میں بلا پس و پیش یہ کہہ سکتا ہوں کہ خواہ ناظرین کو اکثر جگہ مصنف سے اتفاق رائے نہ ہو لیکن اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

زراعت کی ترقی آبپاشی اور کھاد کی سہولتیں بہم پہنچانے سے ہو سکتی ہے۔ زرعی ترقی کے لئے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ نہروں سے یا دیگر ذرائع سے آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں . . . . کسان کو ذریعہ آمدنی بنانے کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دینا چاہئے . . . . اور آبپاشی کے محصول کی شرح فصل کی مالیت اور خرچ کے لحاظ سے مقرر کرنا چاہئے . . . . ملک میں بے شمار کنویں ہیں لیکن چونکہ پانی نکالنے کے لئے سستی قوت متحرکہ میسر نہیں ہے اس لئے وہ بے کار پڑے ہیں۔ لہذا حکومت اور پبلک کے سامنے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ کافی تعداد میں کنویں مہیا کئے جائیں۔ اور سستے داموں نل سے پانی نکالنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے علاوہ نہر کے نظام میں جو نقص ہیں انھیں دور کر دیا جائے تاکہ صحیح وقت پر کافی مقدار میں پانی مل سکے اور محصول کھیت کی آمدنی کے لحاظ سے وصول کیا جائے۔

کسان کی دوسری شدید ضرورت یہ ہے کہ اچھی اور سستی کھاد کافی مقدار میں مہیا کیجائے۔ ماہرین زراعت کی تمام تر کوششیں مصنوعی کھاد پر مرکوز ہیں اور دیسی کھاد کی طرف قطعی بے التفاتی برتی جاتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ مصنوعی کھاد کے مقابلے میں دیسی ہوئی کھاد شورہ اور کھار پر ریل کا محصول زیادہ لیا جاتا ہے۔ لیکن مصنوعی کھاد ہندوستانی کسانوں میں مقبول نہیں ہو سکتی۔ ان کے عملی نقطہ نظر سے گوبر وغیرہ بہترین کھاد ہے۔ یہ بہت ہی سادے قسم کی کھاد ہے اور اپنے طور پر بالکل مکمل ہوتی ہے۔ سرکاری ماہرین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں ..... ہندوستان میں زیادہ تعداد میں لوگ گوشت نہیں کھاتے اس لئے ان کی نجات تو صرف مشترک کاشت میں ہے۔ ہمیں اپنی تمام کوششیں مشترک کاشت کو پر منفعت بنانے پر صرف کر دینا چاہیئے۔ اس سے کھاد کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔"

سب سے آخری لیکن نہایت ضروری کام یہ ہے کہ دیہاتوں میں گھریلو صنعتیں رائج کیجائیں۔ اولاً کاتنے اور بننے کے ذریعہ سے سب سے زیادہ آدمی بارروزگار ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد دودھ گھی کے کام کا نمبر ہے۔ اگر مشترک کاشت کی اسکیم کامیاب نہ ہو تو ملک کی اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں سب سے پہلی جگہ دودھ گھی کے کام کو ملنی چاہیئے۔ یقین ہے کہ یہ کام ہمارے ملک میں بہت زیادہ کامیاب رہے گا۔" لیکن اس وقت تک کامیابی ناممکن ہے جبتک دودھ گھی میں ملاوٹ کو جرم قرار نہ دیدیا جائے۔ "تمام ریلوں کو باربرداری کی اور برف میں محفوظ کر کے لیجانے کی سہولتیں بہم پہنچانا چاہیئے اس کے بعد نسل کی ترقی کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔" کسانوں کی اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں مصنف نے اس صنعت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ بالکل درست ہے۔

" دوسری اہم صنعت ترکاریوں اور پھلوں کا تحفظ اور ان کا ٹین کے ڈبوں میں بند کرنا ہے۔ ہندوستان میں ۶۶ لاکھ روپیہ سالانہ کے ڈبوں میں محفوظ کئے ہوئے پھل باہر سے آتے

ہیں . . . انکے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی اور معمولی صنعتیں بھی ہیں مثلاً صابون۔ سرش، نشاستہ چھلکے اترے ہوئے جو پھل اور ریشم تیار کرنا۔ یہ بھی بڑے اہم اور پر منفعت پیشے ہیں اور ان سے کسان کی قلیل آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہو سکتا ہے۔ حکومت اور رہنمایان قوم دونوں کو ان صنعتوں کی ترقی کے لئے متواتر کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ سرکاری ماہرین کے تجربہ اور حکومت کی مالی امداد سے بڑی بڑی زرعی صنعتیں کسان خود بھی جاری کر سکتے ہیں۔ مثلاً شکر سازی۔ نشاستہ سازی۔ کاغذ کی دفتی بنانا وغیرہ وغیرہ "

میں نے ابتدا میں ایک مختصر سا مقدمہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن یہ کتاب مجھے اتنی دلچسپ اور اسقدر مفید معلوم ہوئی کہ میں ناظرین کی خدمت میں اس کتاب کا ایک خاکہ کھینچنے اور تمام خاص خاص چیزوں کی جانب انکی توجہ مبذول کرانے پر مجبور ہو گیا۔ ممکن ہے ناظرین مصنف کی ہر رائے کی تائید نہ کریں لیکن کتاب کو پڑھ کر وہ اس امر سے ضرور اتفاق کریں گے کہ مصنف نے ہندوستانی کسان کے افلاس کے مسئلہ پر مکمل اور علمی حیثیت سے بحث کر کے ملک کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ کسان کے معاملے کو اس خوبی سے پیش کرنے کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ کسان کی حمایت میں زبردست رائے عامہ پیدا ہو جائیگی اور سارے ملک میں یہ تحریک شروع ہو جائیگی کہ کسان کی حالت کو سدھارنے کے لئے ان طریقوں پر جو مصنف نے تجویز کئے ہیں نیز ان طریقوں پر جو ماہرین زراعت کے عقل و تجربہ کا نتیجہ ہوں فوراً عمل کیا جائے۔ اس قسم کی تحریک شروع کرنے کے لئے یہ موقع بھی نہایت موزوں ہے۔ کسان کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر اس وقت قوم کا دل بہت بیچین ہے۔ بہت سی تجویزیں ہو رہی ہیں کہ کس طرح ان کی حالت سدھاری جائے سوویٹ روس نے پنج سالہ اسکیم کے ذریعہ سے جو حیرت انگیز کام کیا ہے۔ ہمارے سرکاری افسر بھی اس سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ بعض افسر کسان کی اصلاح و ترقی کے لئے

ایک دس سالہ اسکیم مرتب کرنے کا تذکرہ کرتے ہیں ابھی حال ہی میں گورنر بمبئی نے اسکا دو ٹوک کو ترغیب دلائی تھی کہ دیہات سدھار کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ اسی قسم کی تحریک یو پی اور پنجاب میں بھی ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرکزی حکومت کی جانب سے اس کا اشارہ ہوا ہو۔ بہرحال کسانوں کی بہبودی کے لئے حکومت جو کوشش بھی کرے ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے واقعہ یہ ہے کہ بعض صوبوں میں تو صرف حکومت یا آئین ساز جماعتوں کے ذریعہ سے اصلاح ہو سکتی ہے لیکن بقول مصنف کے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ "قوم کو قعر مذلت سے نکالنے کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم خود اپنی قسمت کے بدلنے کا فیصلہ کرلے"۔

بہرحال جو کچھ بھی کیا جائے خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ لوگوں میں پیدا کرنا چاہئے۔ جہاں کہیں حکومت کی یا آئین ساز جماعتوں کی یا دونوں کی امداد کی ضرورت ہو انھیں بھی امداد سے گریز نہ کرنا چاہئے لیکن دوسری جانب کسانوں کو ہمت دلانا چاہئے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے اشتراک عمل سے خود اپنی نجات کے لئے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں انھیں اپنی کامیابی کے لئے زمینداروں اور سرکاری افسروں دونوں کی امداد اور ہمدردی کی ضرورت ہوگی۔ اپنی مدد آپ کرنے کے سلسلہ میں کسان کی کوششوں کو مشتبہ نظروں سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ اس کی اور مدد کرنا چاہئے۔ گویا اس تحریک کو خالص اقتصادی تحریک سمجھنا چاہئے۔

میں پرزور سفارش کرتا ہوں کہ ہر غور و فکر کرنے والے ہندوستانی کو اور ہر اس شخص کو جسے اس براعظم کے نظم و نسق سے دلچسپی ہے اس کتاب کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے اور اپنے بھائی یعنی اس کسان کی ترقی کے لئے جو جاڑا، گرمی، برسات غرض ہر موسم میں محنت مشقت کرتا ہے اور ملک کے ۳۵ کروڑ افراد کیلئے صحت اور دولت کا سامان مہیا کرتا ہے اپنے علم اور عمل کسی چیز سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے اور اس کی ہر طرح مدد کرنا چاہئے۔

مدن موہن مالویہ

دیباچہ

کسان کا افلاس

"اگر حکومت ان مجرموں کی پرورش کا انتظام کرتی ہے جو اپنے جرم کی پاداش میں قید خانوں میں سزا بھگتتے ہیں لیکن اگر وہ ان غربا کا خیال نہیں کرتی جو کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے تو گویا وہ جرائم کا انعام دیتی ہے"

جان اسٹورٹ مل

بڑے بڑے شہروں کی سر بفلک عمارتوں سے جو عیش و عشرت کے تمام ساز و سامان سے آراستہ ہوتی ہیں اور جن میں آرام و آسائش کے لئے سائنس کی جدید ترین برکات مہیا کیجاتی ہیں۔ اس وسیع براعظم کے باشندوں کی صحیح حالت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان شہروں میں لوگوں کی تجارتی تگ و دو اور بنکوں میں روپیہ کی جھنکار کو عوام کی خوشحالی کی علامت سمجھنا درست نہیں۔ ہندوستان میں ۷۹ر۳ فیصدی کسان بستے ہیں۔ ان کی اور ان کے خاندان کی مالی حالت سمجھنے کے لئے ہمیں دیہاتوں میں ان کے گھروں پر جانا چاہیئے۔ ہندوستانی قوم دراصل دیہاتوں میں آباد ہے اور ملک کی خوشحالی انہی کی خوشحالی پر منحصر ہے۔ اس کتاب میں ہم دیہاتوں کے زراعت پیشہ طبقہ کی دردناک حالت پیش کریں گے۔ اس کا علاج تجویز کریں گے اور ایسی صورتیں بتلائیں گے جن سے ان کی حالت سدھر سکے۔

آئیے ذرا گاؤں کی طرف چلیں۔ گاؤں والوں سے ملیں جلیں اور انہی میں رہیں سہیں۔ آئیے ذرا ہم اپنی آنکھوں سے ان کی وہ مشکلات دیکھیں جن میں وہ زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہوگا کہ گاؤں کی زندگی شہر کی زندگی سے بالکل مختلف ہے اور شہر والے اس کا قیاس بھی نہیں کر سکتے کہ دیہاتوں میں لوگ کس طرح زندگی گذارتے ہوں گے۔

دیہات کی سڑکیں اور کسان کے مکانات

اکثر دیہاتوں میں جانے کے لئے ذرائع آمدورفت بھی نہیں ہیں۔ بجز آہستہ چلنے والی بیل گاڑی کے جس میں ہر پانچ قدم پر ایک جھٹکا لگتا ہے اور ہڈیاں چٹخنے اور دکھنے لگتی ہیں وہاں نہ تو گھوڑا ہی میسر ہے نہ یکہ ملتا ہے اور نہ تانگے جو ریلوے اسٹیشنوں پر کثرت سے کھڑے ہوتے ہیں۔ یکہ تو ان اونچے نیچے راستوں کی تاب ہی نہیں لا سکتی پھر بھلا موٹر کار کا کیا ذکر۔ پختہ سڑکیں بھی وہاں نہیں ہوتیں اس لئے آپ کو ان راستوں پر سفر کرنا ہوگا جو گرمیوں میں دھول اور برسات میں کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو تپتی ہوئی دھوپ میں جانا ہوگا کیونکہ راستے میں گھنے سایہ دار درخت بھی نہیں ہیں جن کے سائے میں ذرا سکون مل جائے۔ بالآخر جب آپ پسینہ میں ڈوبے ہوئے پریشان حال اپنی منزل مقصود پر پہنچیں گے تو چھپر پڑے ہوئے مٹی کے گھر آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ بنگال میں تو مٹی کی بھی دیواریں نہیں ہوتیں۔ وہاں تو لکڑی کی ٹٹیاں بنا کر کھجور کی پتیوں سے ان کو ڈھانک دیا جاتا ہے۔ اگر ان مکانوں کی مسلسل مرمت نہ کیجاتی رہے تو برسات میں ان کا گر جانا یقینی ہے۔ ان مکانوں کی چھتیں برابر ٹپکتی رہتی ہیں اور یہ منظر ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد آپ کبھی نہیں بھول سکتے کہ جب چھت ٹپکنا شروع ہوتی ہے تو یہ بیچارے

اپنی چارپائیاں اور کپڑے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹاتے پھرتے ہیں۔ مکان کی دیواروں پر گوبری کی ہوتی ہے۔ چونے کی سفیدی وہاں نہیں ملتی اور اگر ملے بھی تو یہ ایسی عیاشی ہے جسے غریب کسان برداشت نہیں کر سکتا۔ گاؤں کے کھاتے پیتے لوگ بھی گوبر میں لال یا پیلی مٹی ملا کر اس سے دیواریں لیپ لیتے ہیں۔ گیس لیمپ یا بجلی کے لیمپ تو وہاں کے اکثر لوگوں نے کبھی دیکھے یا سنے بھی نہیں ہیں۔ مٹی کے تیل والے لیمپ اور لالٹین بھی بیکار تعیش کا سامان سمجھی جاتی ہیں۔ بس مٹی کے دیئے ٹمٹماتے ہیں جن میں تلی یا نیم کا تیل جلتا ہے۔ ان سے دھندلی سی جھلاتی ہوئی روشنی ہوتی ہے جس سے تاریکی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ بعض بعض جگہ نیچے نیچے چھپروں والے مکانوں میں روشنی کرنے کے لئے مٹی کے دیئے یا ٹین کی ڈبیوں میں مٹی کا تیل بھی جلتا ہے۔ اس کا دھواں اور بدبو ذرا سی دیر میں سارے گھر میں پھیل جاتی ہے اور پھر وہاں سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ بجلی کے پنکھوں کا وہاں کیا کام۔ جب کہ پرانے زمانے کا فرشی پنکھا بھی وہاں نظر نہیں آتا۔ حبس اور گرمی سے سکون حاصل کرنے کے لئے ہوا کے جھونکوں پر وہ لوگ آسرا لگائے رہتے ہیں۔ یہ وہ پنکھا ہے جو قدرت نے خود سب کے لئے یکساں مہیا کیا ہے۔ ان کے مکانوں میں فرنیچر کی قسم سے صرف ایک چارپائی ہوتی ہے جو بیک وقت میز۔ کرسی۔ پلنگ اور بہت سی دوسری چیزوں کا کام دیتی ہے۔

صحت اور صفائی کی حالت

ہر مکان کے سامنے ایک اونچا سا چبوترہ ضرور ہوتا ہے جس پر یہ لوگ بیٹھتے ہیں سوتے ہیں اور بہت سے کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ سردیوں میں مکانوں کو

گرم رکھنے کے لئے کوئی آتشدان نہیں ہوتا۔ نہ کھانا پکاتے وقت چولھے سے جو دھواں نکلتا ہے اسے باہر نکالنے کے لئے کوئی دودکش ہوتا ہے۔ ان تکالیف میں ذرا اس گندی اور مضر صحت عادت کا اضافہ کیجئے کہ وہ اپنے مویشی بھی اسی جگہ باندھتے ہیں جہاں وہ سوتے ہیں۔ اب ذرا خیال کیجئے کہ اس سے ان کی صحت پر کتنا خراب اثر پڑتا ہوگا خصوصاً جبکہ روشنی اور ہوا کے اندر آنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا ہے نہ گھروں میں کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ مکان کا فرش عموماً کچا ہوتا ہے اور اسی پر یہ لوگ بیٹھتے اٹھتے ہیں۔ غرضکہ وہ لوگ نہ تو اپنے آپ کو سخت گرمی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ شدید جاڑے سے۔

اگر آپ ان مکانوں کے چاروں طرف نظر ڈالیں تو آپ کو اور بھی حیرت ہوگی گلیوں میں کبھی جھاڑو نہیں دیجاتی اور کوڑا کرکٹ اور غلیظ وہیں جمع ہوتا رہتا ہے۔ برسات میں یہ سڑ جاتا ہے اور سخت بدبو اٹھنے لگتی ہے۔ نالیوں کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ گھروں کا تمام غلیظ پانی گلیوں میں آتا ہے اور زمین میں جذب ہوتا رہتا ہے۔ گھروں کے قریب ہی کھاد کے ذخیرے ہوتے ہیں۔ کبھی گھر کے صحن ہی میں کھاد جمع رہتا ہے۔ گاؤں کے قریب ہی گندے پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب ہوتا ہے۔ یہ گویا مچھروں کا گھر ہوتا ہے۔ اور بیماری اور موت یہیں سے چاروں طرف پھیلتی ہے۔ لوگ انہی کے کنارے رفع حاجت بھی کرتے ہیں تاکہ پانی قریب ہی ملجائے۔ اس وجہ سے یہ تالاب اور زیادہ خطرناک اور مہلک ہوجاتے ہیں۔ بارش سے تمام پاخانہ بہہ کر تالاب ہی میں چلا جاتا ہے۔ سور بھی اسی میں لوٹا کرتے ہیں۔ یہی پانی گاؤں کے مویشی عموماً پیتے ہیں۔ دھوبی اسی میں کپڑے بھی دھوتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ اس میں نہا

بھی لیتے ہیں۔ اب آپ ہی تصور کیجئے کہ ایسے مکانوں اور ایسی فضا میں رہنے کا کیا مطلب ہے۔ انگریز تو شاید یہاں اپنے سور باندھنا بھی گوارا نہ کریں۔

کسان کی دولت

ہندوستانی عورتوں کو زیور سے عشق ہوتا ہے۔ بعض زیورات کا پہننا تو ہر سہاگن کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ان غریبوں کو نہیں ملتے۔ کھاتے پیتے لوگوں کے پاس بھی ناک کی نتھ کے علاوہ سونے کا کوئی زیور نہیں ہوتا۔ البتہ بعض خوش نصیب عورتوں کے پاس چاندی کے زیور ضرور ہوتے ہیں غریب عورتیں کانسے ہی کا زیور پہن کر اپنا دل خوش کر لیتی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کو یہ بھی میسر نہیں۔

ان لوگوں کے پاس برتن بھی مٹی ہی کے ہوتے ہیں۔ جن کے پاس پیتل کے برتن ہوں وہ گویا بڑے خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی چکی ہر گھر میں ضرور ہوتی ہے۔ اس میں روز صبح عورتیں اپنے گھر کا آٹا پیستی ہیں۔ گویا کسان کی ساری دولت لے دے کے بس ایک یا دو بیلوں۔ چند سستے کاشتکاری کے اوزاروں اور چند استعمالی برتنوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

کسان کی غذا

بنگال کے علاوہ ہر جگہ کسان عموماً گوشت نہیں کھاتے وہاں بھی وہ گوشت نہیں بلکہ مچھلی کھاتے ہیں اور یہ اس لئے کہ وہ سب سے سستی ہوتی ہے۔ سستا ہونا ہی کسان کی خوراک کا ایک معیار ہے۔ عام طور پر یہ لوگ مٹر۔ چنا۔ جو۔ جوار۔ باجرہ

پر گذر کرتے ہیں۔ اکثر ستو کو پانی میں گھول کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ ذرا خوش ذائقہ کرنے کے لئے تھوڑا سا نمک مرچ ملا لیتے ہیں۔ شکر انھیں کہاں نصیب! بنگال اور جنوبی ہند میں سب سے خراب قسم کا چاول کسانوں کی خاص خوراک ہے۔ وہ کتنا ہی گیہوں بوئے اور کتنا ہی باہر بھیجے لیکن اس کا افلاس اجازت نہیں دیتا کہ وہ خود گیہوں کھا سکے۔ عموماً وہ ترکاریاں بھی نہیں کھاتا۔ ہاں کسی تقریب کے موقع پر یہ اسراف ضرور کر لیتا ہے۔ جو شخص گوشت نہ کھاتا ہو اس کی صحت کے لئے دودھ نہایت ضروری چیز ہے۔ لیکن ترقی کے موجودہ دور میں تو چپہ چپہ زمین پر کاشت ہوتی ہے۔ بیشتر لوگ دودھ دینے والے مویشی نہیں پال سکتے اور جو پالتے بھی ہیں وہ دودھ مکھن وغیرہ اپنے استعمال میں نہیں لا سکتے بلکہ مجبوراً انھیں بیچنا پڑتا ہے۔ ان کو جو کچھ بچتا ہے وہ صرف مکھن نکلا ہوا دودھ ہے۔

ان کا لباس دیکھ کر پہلے پہل تو آپ حیرت میں رہ جائیں گے۔ گرمیوں میں اکثر آدمی صرف دھوتی پہنے رہتے ہیں۔ ۸ برس سے بارہ برس تک کے لڑکے صرف ایک لنگوٹی باندھے رہتے ہیں جس سے بس ان کی ستر پوشی ہو سکتی ہے اور اس سے چھوٹے بچے قدرت کے لباس عریانی میں ملبوس رہتے ہیں۔ سردیوں میں کمل اور گدے تو بہت کم لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔ مرد تو دھوتی کے علاوہ ایک کرتہ اور کھادی کی ایک چادر اوڑھے رہتے ہیں اور عورتیں لہنگے کے علاوہ ایک کرتی اور ڈوپٹہ اوڑھتی ہیں۔ لیکن مہربان اور رحمدل قدرت ان لوگوں کی مدد کرتی ہے جو غریبوں کے غریب اور مفلسوں کے مفلس ہیں۔ شکر سازی کی بھٹی یا الاؤ انھیں گرمی بہم پہنچاتا ہے اور یہ رات کا بیشتر حصہ اسی کے سامنے تاپتے ہوئے گذارتے ہیں۔ اکثر ان کے

یہ ناکافی کپڑے بھی پھٹے ہوئے اور بوسیدہ ہوتے ہیں

صحت اور طبی امداد

جب کبھی وہ بیمار پڑتے ہیں تو علاج کے لئے انھیں حکیم ڈاکٹر وید بھی نہیں ملتے اگر وہ شہروں کے ان اسپتالوں میں آتے ہیں جو انھیں کے پیسے سے چلتے ہیں تو انھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں دیہاتوں میں ہیلتھ افیسر تو ہوتے نہیں جو انھیں صاف ستھرا رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی قوت حیات روز بروز کم ہو رہی ہے اور اموات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر آپ ان کے ننھے ننھے بچوں کو دیکھیں تو آپ کو ان کی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں اور تلی بڑھ جانے کی وجہ سے بڑے بڑے پیٹ دیکھ کر سخت قلق ہوگا۔ ان کا چہرہ زرد ہوتا ہے اور وہ بے انتہا کمزور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر صغر سنی میں مرجاتے ہیں۔ شاہی زراعتی کمیشن کے سامنے ایک بڑے ذمہ دار افسر نے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا اور جو کچھ اس نے کہا تھا بالکل صحیح ہے کہ اس ملک میں قحط یا وبا سے اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے خوراک کی قلت اور خرابی کی وجہ سے مرتے ہیں۔ اموات کی خاص وجہ یہی ہے کہ گوشت نہ کھانے کی صورت میں ان لوگوں کو معقول اور طاقتور غذا نہیں ملتی۔ یہ قانون قدرت ہے کہ غریبوں کے یہاں اولاد زیادہ ہوتی ہے۔ اسی تناسب سے شرح اموات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستانیوں کی اوسط عمر روز انہ گھٹ رہی ہے اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ ہندوستان میں مردوں کی متوقع عمر ۲۲ر۵۹ سال اور عورتوں کی ۲۳ر۳۱ سال ہے۔ اس کے مقابلے

میں انگلستان کے مردوں کی متوقع عمر ۴۶٫۰۴ سال اور عورتوں کی ۵۰٫۰۲ سال ہے۔

دیگر سماجی سہولتیں

ڈاکخانے بھی اکثر دیہاتوں سے دور پڑتے ہیں اور تقریباً تین موضعوں کے درمیان ایک مدرسہ ہوتا ہے۔ نہ وہاں لائبریریاں ہوتی ہیں۔ نہ کلب نہ کوئی معقول صحبت۔ تفریح کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ غرضکہ زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ صرف اس لئے زندہ ہیں کہ دم بڑی مشکل سے نکلتا ہے

کسان کی آمدنی اور محنت

کسان علی الصبح اٹھتا ہے اور صبح سے شام تک محنت میں لگا رہتا ہے۔ نہ گرمیوں میں اسے لُو کی پروا ہوتی ہے اور نہ جاڑوں میں سخت سردی کی۔ موسلادھار بارش میں بھی وہ کھیت میں کام کرتا رہتا ہے۔ جب فصل تیار ہوتی ہے تو لگان کے لئے زمیندار اس کی گردن پر سوار ہو جاتا ہے اور قرضخواہ اسکی کھڑی فصل قرق کرا لیتا ہے اس کی فصل شاذ ہی اس کے گھر تک پہنچتی ہو۔ افسوس۔ صد افسوس کتنی دردناک حالت ہے کہ وہ شخص جو فصل تیار کرنے کے لئے موسم بھر محنت کرتا ہے اور اپنے بچے کی طرح اس کی پرورش کرتا ہے۔ آخر میں ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے سب کچھ امیر زمیندار یا لالچی قرضخواہ کی نذر ہو جاتا ہے اور بے بسی کا یہ عالم کہ وہ کچھ نہیں

کرسکتا۔ اپنی فصل سے اس طرح محروم ہونے کے بعد وہ پھر از سر نو کام شروع کرتا ہے
دوسرے ہی روز وہ پھر بیج ادھار لیتا ہے اور غیر معمولی لگان پر زمین حاصل کرتا ہے۔
مانگے ہوئے بیلوں اور اوزاروں سے وہ دوسری فصل تیار کرتا ہے لیکن
جیسے ہی فصل تیار ہوتی ہے وہ پھر اس سے چھن جاتی ہے۔ کبھی شدید ضرورت
کے وقت زیادہ شرح پر اس نے جو قرض لیا تھا اس کا سود جمع ہوتے ہوتے
انبار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زبردست لگان کا مطالبہ بھی اس کے سر
پر ہوتا ہے۔ غرض کہ اس کی ساری کمائی انہی کے نذر ہو جاتی ہے۔ یہ اندھیر
چکر برابر سال بہ سال جاری رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسان جو سارا اناج
پیدا کرتا ہے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھی اسے کافی نہیں ملتا ہے اور مجبوراً اسے
بدترین قسم کی خوراک پر قناعت کرنا ہوتی ہے جس میں غذائیت سب سے
کم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسان نہ صرف اپنے ملک کے کارخانوں کے لئے
روئی پیدا کرتا ہے بلکہ کثیر مقدار میں جاپان اور انگلستان بھی بھیجتا ہے لیکن
اس غریب کے پہننے کو کافی کپڑا نہیں ملتا حتیٰ کہ سخت سے سخت سردیوں
میں اکثر بالکل برہنہ رہتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو دوسرے ملکوں کے کارخانوں
کو سال کے ۳۶۵ دن جاری رکھنے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ گویا ہندوستانی
کسان کی زندگی مصائب سے پر ہے اور انتہائی محنت کے باوجود اسے اس کا
بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ افسوس۔ صد ہزار افسوس۔

کسان کا قرض

شاہی زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بالکل صحیح[1] لکھا ہے کہ "ہمیں یقین ہے کوئی شخص بھی اس حالت کو جاری رکھنا گوارا نہ کرے گا کہ کسان مقروض پیدا ہوتا ہے۔ مقروض زندگی بسر کرتا ہے اور مقروض مرجاتا ہے اور اپنا بار اپنے وارثوں کو منتقل کر جاتا ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ دیہاتوں میں بے شمار ایسے قرضدار موجود ہیں جن کے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہوتی لیکن ان کو بے یار و مددگار بے کسی کے عالم میں چھوڑ دینا قومی تعمیر کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔

کسان جب یہ دیکھتا ہے کہ ہر بار جہاں اس کی فصل تیار ہوئی دوسرے اس پر قبضہ کر لیتے ہیں تو فطرتاً اس کی ساری امیدیں خاک میں ملجاتی ہیں اور زندگی کو وہ ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے پھر اسے کوئی تدبیر نہیں سوجھتی۔

لیکن خوش قسمتی سے ہندوستان ایک گرم ملک ہے، یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے لوگوں کی ضروریات بہت کم ہوتی ہیں۔ ان کی مذہب پرستی اور تقدیر پرستی نے اب تک انھیں اپنی حالت پر قانع رکھا ہے۔ لیکن اب حالات ناقابل برداشت ہو گئے ہیں اور وہ لوگ بھی اپنے حقوق سے واقف ہوتے جاتے

---

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ ۴۱۴

ہیں۔ اگر حالات بہتر نہ ہوئے تو وہ دن دور نہیں کہ کسان موجودہ صورت حالات کے خلاف بغاوت کرے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ نہایت خلوص سے جلد از جلد اس امر کی کوشش کیجائے گی کہ ہندوستانی کسان کی حالت سدھر جائے اور خدا نہ کرے کہ وہ روز بد ہمیں دیکھنا پڑے۔

کسانوں کی ناکافی خوراک

ایک مشہور ہندوستانی مصنف مسٹر ایس کیشو آئنگر نے اپنی کتاب موسومہ "ہندوستانی دیہی اقتصادیات کے مطالعہ" میں چند الفاظ میں کسان کی حالت کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے وہ لکھتے ہیں "ہندوستانی کسان شکم سیر ہو کر کھانے کے بجائے بھوک کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس چیز کا لحاظ نہیں کرتا کہ آیا اس کی غذا حیات آور اور صحت بخش بھی ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگ صبح کو صرف ستو ہی کھا لیتے ہیں۔ اس سے اناج کم خرچ ہوتا ہے۔

مقصد یہی ہوتا ہے کہ جتنے کم سے کم اناج پر گذر ہو سکے وہ اچھا ہے" ایک انگریز مصنف نے بھی بالکل صحیح لکھا ہے کہ "وہ زندہ کیا ہیں یوں کہئے کہ زندگی کے دن کاٹتے ہیں" ہندوستانی کسانوں کی مالی حالت کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر وہ سب سے غریب انسان ہے۔ حال ہی میں بمبئی کے ڈائرکٹر زراعت ڈاکٹر ہیرلڈ ایچ مین نے اپنی ملازمت کے اختتام پر کہا تھا کہ "اس وقت تک وسیع پیمانہ پر کوئی کارروائی نہیں کیجا سکتی جب تک حکومت اور مصلحین قوم یہ نہ سمجھ لیں کہ زراعت پیشہ آبادی کی خوشحالی کا راز ان کے پیٹ بھرنے

میں ہے۔ ہندوستان کی ترقی کی راہ میں خالی پیٹ سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس ملک سے رخصت ہونے سے پہلے میں اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ تمام کوششیں لوگوں کا پیٹ بھرنے پر مرکوز کر دی جائیں[1]۔" آگے وہ لکھتے ہیں کہ "میرا آخری پیام اس ملک کے باشندوں۔ قومی کام کرنے والوں اور ارباب حکومت کے لئے یہی ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے کسان کو کافی خوراک مل سکے۔"

ایک دوسرے انگریز مصنف آرنلڈ لپٹن نے اپنی کتاب موسومہ "خوش حال ہند" میں بڑے دردناک الفاظ میں کسان کی حالت یوں بیان کی ہے کہ "اس کا محل اس کی مٹی کی جھونپڑی ہے جس کی چھت لکڑیوں کی ہوتی ہے اور اس پر کھجور کے پتے چھائے ہوتے ہیں۔ اس کا پلنگ وہ پیال ہے جو اس کے بستر کو (بشرطیکہ اس کے پاس ہو بھی) زمین سے چھ انچ اونچا کر دیتا ہے۔ اس کی جھونپڑی میں دروازے اور کھڑکیاں بھی نہیں ہوتے۔ باہر ایک چھوٹا سا چوکا اور چولھا ہوتا ہے اس کا صوفہ جس پر وہ فرصت کے اوقات میں آرام کرتا ہے۔ اس کی خوابگاہ کے سامنے ایک مٹی کا چبوترہ ہوتا ہے۔ اس کی کمر پر صرف ایک پوشاک ہوتی ہے اور گھر میں بھی کوئی دوسری نہیں ہوتی جسے پہن کر وہ اسے دھو ڈالے نہ وہ سگریٹ پیتا ہے۔ نہ شراب پیتا ہے۔ نہ اخبار پڑھتا ہے۔ نہ کسی سیر تماشے کو جاتا ہے۔ اس کا مذہب اسے عجز اور قناعت سکھاتا ہے۔ چنانچہ وہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے حتی کہ فاقے اسے موت کی نیند سلا دیتے

---

(۱) اخبار پیپل اکتوبر ۱۹۴۸ء

ہیں۔"

یہی رائے مشہور و معروف کتاب موسومہ "ہندوستان اور اس کے مسائل" کے مصنف کی ہے[1]۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں لاکھوں کسان صرف آدھی آدھی ایکڑ زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی گویا فاقہ کشی کے ساتھ ایک مسلسل جنگ ہے جس میں انھیں اکثر شکست ہی ہوتی ہے۔ ان کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ کس طرح وہ انسانوں کی سی زندگی بسر کریں یعنی وہ زندگی جس میں اپنی معمولی حیثیت کے مطابق انھیں آرام و آسائش میسر ہو بلکہ سوال یہ ہے کہ کس طرح وہ موت کے پنجے سے بچے رہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں ان علاقوں کے علاوہ جہاں آبپاشی کا انتظام ہے قحط تو ایک مستقل وبا ہے۔"

کچھ عرصہ ہوا برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر لے۔ اے۔ یرسل نے اخبار ڈیلی ہیرلڈ میں لکھا تھا[2] "بہرحال بعض ایسی چیزیں بیان کیجا سکتی ہیں جن سے ہندوستان کے متعلق دوسروں کو کچھ اندازہ ہو سکے۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر ہندوستانی اپنے یوم پیدائش سے لے کر مرتے دم تک بھوکے ہی رہتے ہیں۔ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ ہندوستان میں ۲۵ کروڑ انسان ساری عمر بھوکے رہتے ہیں اور ان کی بھوک شدید جسمانی بھوک ہوتی ہے۔ انھیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کافی چاول بھی نہیں ملتے۔ ہزاروں آدمی محض فاقہ کشی سے مرتے ہیں۔ وہ فاقہ کشی جو

---

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۴

(۲) ملاحظہ ہو اخبار لیڈر مورخہ ۲۵ جون ۱۹۲۸ء

نہایت آہستہ آہستہ بڑے کرب و تکلیف کے ساتھ اپنا اثر کرتی ہے۔ ہندوستان کے دورے کے بعد میں یہ خیال لے کر واپس ہوا ہوں جو ہر وقت میرے دماغ پر طاری رہتا ہے اور تمام مسائل سے زیادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ بنیادی طور پر سب سے پہلے پیٹ کا مسئلہ ہے۔ تمام سیاسی۔ آئینی۔ مذہبی اور ذات پات کے مسئلے اس خوفناک اقتصادی سوال کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میں منہ مانگا انعام دینے کو تیار ہوں اگر کوئی یہ ثابت کرے کہ ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو روزانہ چاول کے چند دانے بھی ان کی ضرورت سے زیادہ مل جاتے ہیں اگر ہر خاندان کی روزانہ آمدنی میں ایک پینی (آٹھ پائی) کا بھی اضافہ ہو جائے تو ان کے معیار زندگی میں عظیم الشان ترقی ہو سکتی ہے۔"

فی کس خوراک کی مقدار اور قسم

مسٹر آرنلڈ لپٹن نے اپنی کتاب "خوشحال ہند" میں جس کا ایک اقتباس ہم اوپر بھی پیش کر چکے ہیں۔ تخمینہ لگا کر لکھا[1] ہے کہ ہندوستانیوں کی خوراک کی مقدار دوسرے ملک کے لوگوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اگر ہم ۱۹۱۹-۲۰ء کی اناج کی پیداوار کو کل آبادی پر تقسیم کریں تو معلوم ہوگا کہ لوگوں کو صرف اتنا ہی اناج پہنچتا ہے جس سے وہ زندہ رہ سکیں یعنی ہر مرد کو دو پونڈ روزانہ۔ ہر عورت کو ڈیڑھ پونڈ۔ ہر بچے اور بوڑھے کو سوا پونڈ۔ گویا ہر پانچ

---

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۲

آدمیوں کے خاندان کو فی کس پونے دو پونڈ ناج ملتا ہے۔"

مذکورہ بالا تخمینہ اس مفروضہ پر منحصر ہے کہ تمام پیداوار صرف انسانوں پر برابر برابر تقسیم کیجائے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ بہت کافی ناج جانوروں کے کام بھی آتا ہے اور بیج کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لوگوں کی خوراک کے لئے تو بہت تھوڑا بچتا ہے۔ پھر ناظرین کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تھی ہندوستان کی آبادی تقریباً ۲۰ فیصدی بڑھ گئی ہے لیکن نہ رقبہ زیر کاشت میں اضافہ ہوا ہے اور نہ اوسط پیداوار بڑھی ہے۔

پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب موسومہ "ہندوستان کی دولت اور محصولی حیثیت" میں ہندوستانیوں کی خوراک کا مکمل تخمینہ لگانے کے بعد لکھا ہے[1] کہ "ہندوستانیوں کو بہت کم خوراک ملتی ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے اور اس کا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ یا تو ہر تین آدمیوں میں ایک بالکل بھوکا رہتا ہے یا تینوں آدمی تین وقت کے بجائے دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ آخری صورت زیادہ آسان۔ گمراہ کن اور مضر ہے لیکن لازمی طور پر یہی رواج پڑ گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسمانی صحت اور قوت عمل میں مسلسل تنزل ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے کمی کی تلافی کرنے کی غرض سے پیداوار میں اضافہ کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ ہندوستانی نسبتاً زیادہ کمزور اور نااہل ہیں۔ کیونکہ انھیں پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا پیٹ بھر کھانے کو اس لئے نہیں ملتا کہ وہ اپنی ضرورت کے لائق پیدا نہیں کر سکتے۔ اور

---

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۲

ضرورت کے لائق پیدا اس لئے نہیں کر سکتے کہ ان میں طاقت اور قوت عمل کی کمی ہے۔ اس طرح یہ چکر پورا ہو جاتا ہے۔" ناظرین اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ آج اس بدقسمت ملک کے لوگ کن حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہی نہیں کہ وہ زندگی کے معمولی آرام و آسائش سے محروم ہیں بلکہ انھیں جسم و جان کو برقرار رکھنے کے لئے کافی خوراک بھی میسر نہیں ہے۔

مسٹر ڈبلو۔ ایس۔ بلنٹ نے اپنی کتاب موسومہ "لارڈ رپن کے دور میں ہندوستان کی حالت" میں بالکل صحیح لکھا[1] ہے کہ "ہم نے قتل و غارت کی موت سے تو لوگوں کو پناہ دی ہے لیکن غالباً فاقوں کی موت میں اضافہ کر دیا ہے" بنگال کی بنکنگ انکوائری کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا[2] ہے کہ "کسان کی غذا جیل کی غذا سے صرف ۱۰ فیصدی بہتر ہوتی ہے۔" ایک گواہ نے تو کمیٹی مذکور کے سامنے یہاں تک کہا کہ عوام کی غذا قیدیوں کی غذا سے بدتر ہوتی ہے۔

ہندوستانیوں کی آمدنی فی کس

یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہندوستانیوں کی آمدنی کا ابتک کوئی معتبر تخمینہ نہیں کیا گیا۔ یہاں ہم پرانے اختلافی تخمینوں کو پیش کرنا نہیں چاہتے بلکہ معتبر ترین سرکاری مطبوعات کے چند اقتباس پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴۵-۶

(۲) ملاحظہ ہو صفحہ ۸۰

سنہ ۱۹۳۲ء میں ایک شاہی کمیشن معروف بہ سائمن کمیشن مقرر ہوا تھا جو سراسر انگریزوں پر مشتمل تھا۔ غالباً ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ انھوں نے حکومت ہند کے خلاف تعصب برتا ہوگا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کی اقتصادی حالت کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے[1]:۔ "افلاس کی شدت کا آسانی سے احساس نہیں ہو سکتا حالانکہ وہ ہر جگہ نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱-۰۲ء کے بعد سے سرکاری طور پر آمدنی فی کس کا کوئی تخمینہ نہیں لگایا گیا ہے۔ ہاں سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے اپنی بجٹ کی تقریر میں یہ کہا تھا کہ برطانوی ہند کے باشندوں کی آمدنی فی کس اوسطاً تیس روپیہ سالانہ ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے اقتصادیات کے بہت سے یورپین پروفیسروں نے بھی اس کا تخمینہ کرنے کی کوشش کی، ان میں سے ایک صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ برطانوی ہند کے باشندوں کی آمدنی فی کس سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں ۷۰ روپیہ سالانہ اور سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ۱۱۶ روپیہ سالانہ تھی۔ ایک دوسرے صاحب کی رائے ہے کہ برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کو شامل کر کے سارے ہندوستان کی آمدنی فی کس ۴۷ روپیہ سالانہ ہوتی ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے صرف صوبہ مدراس کے متعلق تحقیقات کی۔ ان کا اندازہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں اس صوبہ کی آمدنی فی کس ۱۰۲ روپیہ سالانہ تھی۔ یہ سب تخمینے نامکمل اعداد و شمار پر منحصر ہیں کیونکہ پورا مواد دستیاب نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اگر ان میں سے زیادہ سے زیادہ کو بھی مان لیا جائے تو سنہ ۱۹۲۲ء میں ہندوستانیوں کی آمدنی

---

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ ۳۴۴

فی کس اس وقت کے شرح تبادلہ کے مطابق آٹھ پونڈ سالانہ تھی۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ کے باشندوں کی آمدنی ۹۵ پونڈ سالانہ تھی۔"

گویا ۱۹۳۱ء میں سائمن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ہندوستانیوں کی آمدنی انگریزوں کی آمدنی کا بارھواں حصہ تھی۔ اب پیداوار کی قیمتیں بہت زیادہ گر گئی ہیں اس لئے شاہی کمیشن کے تخمینہ سے اب اور بھی کم آمدنی ہونا چاہیئے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ مذکورہ بالا آمدنی میں امیروں کی آمدنی بھی شامل ہے اور جیسا کہ کمیشن مذکور نے خود تسلیم کیا ہے اس سے کسانوں کی صحیح آمدنی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

حکومت ہند نے حال ہی میں ایک بنکنگ انکوائری کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس کمیٹی نے بھی لوگوں کی اقتصادی حالت کی تحقیقات کی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی لکھا ہے کہ "زراعت پیشہ آبادی کی آمدنی اگر نکالی جائے تو بہت ہی کم ہوگی۔ صوبہ جاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں سے اور دیگر شائع شدہ اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۸ء کی قیمتوں کے معیار کے مطابق زرعی پیداوار کی سالانہ قیمت ۱۲ ارب روپیہ ہوتی ہے۔ اس میں ضمنی پیشوں کی آمدنی زرعی آمدنی کی ۲۰ فیصدی کے حساب سے اور شامل کر لیجئے اس طرح گذشتہ دس سال میں آبادی میں جو اضافہ ہوا اور ۱۹۲۸ء کے بعد سے قیمتوں میں جو کمی ہوئی اگر اس کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی اوسط بالیں روپئے یا تین پونڈ سالانہ سے زیادہ نہیں پڑتا ہے۔ گویا زرعی طبقہ کے عام افلاس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

اس تخمینہ کے مطابق آمدنی فی کس ساڑھے تین روپیہ ماہانہ یا دو آنے روزانہ پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ ایک انسان ساڑھے تین روپئے ماہوار میں کیسے گذر کر سکتا ہے۔ دوسری ضروریات زندگی کی خریداری تو درکنار فاقوں سے بچنے کے لئے ساڑھے تین روپیہ کا اناج بھی کافی نہ ہوگا۔ بہرحال کسان کی خوفناک مفلسی ایک امر واقعہ ہے۔ اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ملک کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ ایسی صورتیں پیدا کرے جس سے کسان کی حالت بہتر ہو سکے اور ملک سماجی انقلاب کی تباہیوں سے محفوظ رہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر مفلسی کا یہی عالم رہا تو ایک نہ ایک دن یہ انقلاب ہو کر رہے گا۔

حصہ اول

مغالطوں کا ازالہ

تمہید

افلاس کے فرضی سبب

پچھلے صفحوں میں ہم نے کسان کے افلاس پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ ان کی جانب فوراً توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پیشتر اس سے کہ ہم ان کے افلاس کا علاج تجویز کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کے اسباب کی پوری تحقیقات اور چھان بین کریں۔

بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اصحاب نے اس مسئلہ کی تحقیقات کی ہے اور اس کے بہت سے علاج بھی تجویز کئے ہیں۔ ان تجویزوں کے مطابق حکومت اور پبلک دونوں نے اصلاح کی کچھ نہ کچھ کوشش بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود حالت بدسے بدتر ہوتی گئی۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہوئی۔ جب ہی تو علاج موثر ثابت نہیں ہوا۔ گویا حکومت نے کسان کے افلاس کے جو سبب تجویز کئے ہیں وہ بنیادی طور پر غلط ہیں لیکن یہ فرضی سبب حکومت کی جانب سے پبلک کے کانوں میں اس طرح بار بار ڈالے گئے ہیں کہ وہ بھی انہی کو اصلی سبب سمجھنے لگی ہے۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت غور سے انکی جانچ پڑتال کیجائے اور دیکھا جائے کہ آیا ان کی کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم تصویر کا دوسرا رخ پیش کرینگے یعنی یہ ثابت کرینگے کہ یہ تشخیص غلط ہے۔ اس کے بعد اصلی اسباب کی تلاش کیجائے گی۔ ہم یہ بھی بتائیں گے کہ اسی قسم کے حالات میں دوسرے ملکوں میں کیا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد علاج تجویز کریں گے۔ اس طرح ہمارا

نقطۂ نظر واضح ہو جائے گا اور ہم اس مسئلہ پر پوری بحث کر سکیں گے۔

مشہور سرکاری اور غیر سرکاری حضرات نے ہندوستانی کسان کے افلاس کے حسب ذیل سبب بیان کئے ہیں :-

(۱) ہندوستان میں اوسط پیداوار بہت کم ہے کیونکہ ہندوستانی کسان ابھی تک کاشتکاری کے دقیانوسی طریقوں پر عامل اور جدید ترقی یافتہ سائنٹفک ذرائع سے قطعاً ناواقف ہے

(۲) جوت کے کھیتوں کا یکجا نہ ہونا اچھی پیداوار کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے

(۳) آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہندوستانی کسان نقل سکونت کے لئے تیار نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوراک کا اوسط فی کس کم ہو گیا ہے اور لوگ فاقوں مر رہے ہیں۔

(۴) بارش کی کمی مشکلات میں اضافہ کرتی ہے۔

(۵) کسان کی فضول خرچی اور کوتاہ اندیشی اس کو مفلس بنا دیتی ہے۔ وہ آمار روپیہ پس انداز نہیں کرتا کہ قحط پڑنے پر یا بُرے وقت میں اس کے کام آئے۔

(۶) اس کی آمدنی کا زیادہ حصہ مہاجن کے غیر معمولی سود کی نذر ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ قرض میں ڈوبا رہتا ہے۔

یہی چیزیں عموماً ہندوستانی کسان کے افلاس کا سبب سمجھی جاتی ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان کی بہبودی کے لئے بہت سی تجویزیں کی گئی ہیں۔

سرسری طور پر دیکھنے سے ممکن ہے یہ سبب صحیح معلوم ہوں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ یہ چیزیں تو افلاس کا نتیجہ ہیں۔ سبب نہیں۔ اس لئے صحیح سبب معلوم کرنے کے لئے ہمیں کچھ اور ہی جستجو کرنی ہو گی۔

باب اول

کیا ہندوستان میں زمین کی اوسط پیداوار کم ہے اور کیا یہ صورت کاشتکاری کے دقیانوسی طریقوں کی وجہ سے ہے ؟

افلاس کا پہلا فرضی سبب

قریب قریب تمام سرکاری کاغذات اور مختلف کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹوں میں ہندوستانی کاشتکاروں کی مفلسی کا خاص سبب یہی بتایا جاتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کی زمین کی اوسط پیداوار بہت ہی کم ہے کیونکہ یہاں اب تک کاشتکاری کے وہی پرانے اور دقیانوسی طریقے رائج ہیں جو آج سے کئی صدی پہلے رائج تھے۔ غیر سرکاری حضرات بھی اس کی تائید ہی نہیں کرتے بلکہ نئے نئے سائنٹفک طریقے اختیار کرانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر ملکوں نے پچھلی صدی میں نئی نئی مشینوں اور محنت بچانے والے اوزاروں کی ایجاد، مصنوعی کھاد اور بہتر قسم کا بیج استعمال کرنے اور کیڑوں کا علاج معلوم ہو جانے سے پیداوار فی ایکڑ بڑھ گئی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوستانی کسان پرانی لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے اور سائنس نے کاشتکاری میں جو ترقیاں کی ہیں ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ یہ دلیل عام طور پر پیش کی جاتی ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں زبردست مشینوں کے ذریعہ ایک کسان ۱۲ انچ گہرا ہل چلاتا ہے تو ہندوستانی کسان اپنے چھوٹے ہلکے اور بھدے ہل سے صرف ۳ انچ گہرا کھودتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پودا اس خوراک سے جو اس کو زمین کی تہ میں مل سکتی ہے محروم رہتا ہے۔ اس لئے نہ تو وہ پوری طرح بڑھ سکتا ہے اور نہ کافی پیداوار ہی ہوتی ہے۔ ہندوستانی

کسان مصنوعی کھاد کا استعمال بھی نہیں جانتا۔ وہ اس قیمتی کھاد کو بھی کام میں نہیں لاتا جو خود اس کے کھیت میں اسے میسر آتی ہے بلکہ اسے وہ جلا ڈالتا ہے جس سے زمین کی قوت ماری جاتی ہے اور پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ بہتر قسم کا بیج تیار کرنے کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگر کوئی اچھا بیج ان کو بتایا بھی جائے تو وہ اسے کام میں لانے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے اور اگر کیڑا یا ٹڈی فصل خراب کر دے تو وہ اسے خدا کا غضب کہتے ہیں اس لئے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فصل کی تباہی ظالم قسمت کا کھیل ہے اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

یہ ساری باتیں ان لوگوں کو جنھوں نے خود کاشتکاری نہیں کی ہے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی کو کاشتکاری کا کوئی تجربہ نہیں۔ وہ تو صرف اپنے کمرے میں بیٹھ کر بحث کرنا جانتا ہے۔ اگر منطق کی رو سے دلیلوں کے ذریعہ باقاعدہ نتیجہ نکل آئے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ وہ ان دلیلوں کو جن سے وہ نتیجہ نکالتا ہے پہلے ہی سے صحیح تسلیم کر لیتا ہے اور ان کی جانچ نہیں کرتا۔

پہلے فرضی سبب کی جانچ

اس لئے اوّلاً ہمیں ان بنیادی چیزوں کو جانچنا چاہیے جنھیں صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اسی کو لیجئے کہ آیا واقعی یہاں کی پیداوار اور ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور اگر ایسا ہے تو کیا یہی ہندوستانی کسانوں کی مفلسی کا خاص سبب ہے۔ جو لوگ اس اصول پر بحث کرتے ہیں وہ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ ایک ملک کی پیداوار کا دوسرے ملک کی پیداوار سے مقابلہ کرنے کے لئے تین باتوں کا لحاظ کرنے کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ (۱) زمین (۲) آب و ہوا (۳) کسان کی استعداد۔ اگر یہ تینوں باتیں دونوں ملکوں میں یکساں نہ ہوں تو ان میں مقابلہ کرنا بالکل غلط ہوگا۔

مثلاً آم کی پیداوار دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنٹفک معلومات، محنت بچانے والی مشینیں، مصنوعی کھاد اور طرح طرح کے ساز و سامان کے باوجود دوسرے ممالک یہ مزے دار پھل پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر پیداوار کی کثرت ہی معیار ہوتا تو ہم آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ ہندوستان کا باغبان دنیا میں سب سے زیادہ ہوشیار ہے۔ لیکن یہ صورت نہیں ہے بلکہ اس فرق کی خاص وجہ مختلف ملکوں کی زمین اور آب و ہوا کا فرق ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں گیہوں کی سال میں دو فصلیں کٹتی ہیں لیکن ہندوستان کی آب و ہوا ایسی ہے کہ ایک ہی فصل پیدا ہوتی ہے۔ اگر دنیا کے مختلف حصوں میں گنے کی فصل تیار ہوتے ہیں ۵ ماہ سے اٹھارہ ماہ تک لگتے ہیں تو ممالک متحدہ آگرہ و اودھ اور پنجاب میں یہ فصل صرف ۹ ماہ میں تیار ہو جاتی ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ان صوبہ جات کا کاشتکار دنیا کے کاشتکاروں سے زیادہ عقلمند اور سائنٹفک اصولوں کا جاننے والا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ یہ تبدیلی محض آب و ہوا کا نتیجہ ہے۔

دوسرے ملکوں کا تو ذکر ہی کیا خود ہندوستان کے دو صوبوں میں ایک سی حالت نہیں ہے۔ بمبئی میں ۳۔ انچ نیچے زمین پتھریلی اور کنکریلی نکلتی ہے لیکن صوبہ متحدہ اور پنجاب میں پانی کی سطح تک عموماً اچھی ہوتی ہے۔ پھر بھی بعض بڑے بڑے قطعوں میں شورہ ہے اور گھاس کی ایک پتی بھی نہیں اگتی۔ سرکاری ماہرین نے اپنی تمام معلومات، تمام ساز و سامان اور تمام ذرائع کی مدد سے اس زمین کو زرخیز بنانے کا پورا پورا زور لگا لیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور جہاں کہیں زمین سدھر بھی گئی وہاں خرچ کی نسبت سے آمدنی بہت ہی کم ہوتی ہے۔ گویا ایسی صورت میں پیداوار کی کمی کی وجہ زمین کی خرابی ہے۔ اسی طرح اونچی نیچی زمین، پہاڑی قطعے یا ریتیلے حصوں میں اچھی زمین کے برابر پیداوار نہیں ہوتی۔ زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم آسانی سے یہ نتیجہ

نکال سکتے ہیں کہ پیداوار کے سلسلہ میں زمین کی قسم خاص اہمیت رکھتی ہے۔
اگر ہم آب وہوا پر غور کریں تب بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ مثلاً محض آب وہوا کے فرق کی وجہ سے صوبہ متحدہ اور پنجاب میں بمبئی کے مقابلہ میں جوار کی پیداوار بہت کم ہے۔ بمبئی میں اس کی سالانہ دو فصلیں ہوتی ہیں لیکن ملک کے دوسرے حصوں میں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر بنگال کا سن، پنجاب کا گیہوں اور برار کی روئی مشہور ہے۔ محکمہ زراعت نے بہت کچھ کوشش کی لیکن ملک کے دوسرے حصوں میں یہ چیزیں نہ تو ایسی اچھی پیدا ہوسکیں اور نہ اس کثرت سے۔ اگر پھلوں پر غور کیجئے تو یہ چیز اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ اگرچہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی خوب دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے لیکن نہ تو ناگپور اور سلہٹ کی سی نارنگیاں کہیں پیدا ہوسکتی ہیں اور نہ بمبئی اور مدراس کے سے کیلے، نہ الہ آباد کے امرود، نہ کشمیر کی ناشپاتی وغیرہ۔

تیسری چیز کاشتکار کی استعداد ہے یعنی اس کا تجربہ، سامان اور واقفیت۔ صوبہ متوسط کے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے یہاں ناتجربہ کاری اور ذرائع کی کمی کی وجہ سے اتنی پیداوار نہیں ہوتی جتنی یورپین پلانٹرس (زمینداروں) کے یہاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ان کا کافی تجربہ اور وسیع ذرائع ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی کاشتکار کو وقت پر بیج نہ ملے یا موقع سے بیل تبدیل نہ کرسکے یا اسے مزدور نہ ملیں تو فصل کا خواہ مخواہ نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تجربہ کار کاشتکار ایک ناواقف شخص کے مقابلہ میں زیادہ پیداوار حاصل کرسکتا ہے۔

گویا یہ ثابت ہوا کہ ان تینوں چیزوں کی وجہ سے اوسط پیداوار غیر معمولی طور پر بڑھ یا گھٹ سکتی ہے۔ اس لئے مختلف ملکوں کی محض اوسط پیداوار کا مقابلہ کرنے سے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ پیداوار میں کس طرح اضافہ کا امکان ہے۔ اگر ہم دو ملکوں کی

پیداوار کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا چاہیں تو ان تینوں چیزوں سے جو فرق پڑتا ہے اسے سمجھنا چاہیئے۔

پرانے اور نئے ملکوں کا مقابلہ

ہندوستان اور چین دنیا کے سب سے پرانے ملک ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ سے کاشتکاری کرتے چلے آئے ہیں۔ صدیوں سے ان کی زمین فصلیں پیدا کر رہی ہے اس لئے زمین میں پودے کی غذا کا جو قدرتی خزانہ ہوتا ہے وہ اب ختم کے قریب ہونا چاہیئے۔ دوسرے ملک جو ابھی آباد ہوئے ہیں یا جہاں کاشتکاری ابھی شروع ہوئی ہے وہاں کی زمین میں زیادہ قوت موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسان کی معمولی محنت سے زبردست فصل پیدا ہو سکتی ہے۔ زراعتی ٹریبونل نے اپنی رپورٹ[1] میں اس چیز کو حسب ذیل الفاظ میں تسلیم کیا ہے:-

"نئے ملکوں کی نئی زمین میں جہاں زرخیزی کی قوت ابھی محفوظ ہے اور نسبتاً معمولی محنت سے کام میں لائی جا سکتی ہے، کم خرچ سے زیادہ پیداوار ہونا ہی چاہیئے۔"

یہی وجہ ہے کہ پنجاب اور برما کی پیداواری ایکڑ بہت زیادہ ہے کیونکہ یہاں آبپاشی کا انتظام کر کے بڑے بڑے رقبوں کو حال ہی میں قابل کاشت بنایا گیا ہے۔ پنجاب میں گیہوں کے پودے ایک مرتبہ تو چارے کے لئے کاٹ لئے جاتے ہیں تاکہ زیادہ بڑھ کر گر نہ پڑیں۔ صوبہ متحدہ کے کسان کے مقابلہ میں پنجابی کسان کے طریقے زیادہ بھدے اور اصول کے خلاف ہوتے ہیں۔ ان کا بل زمین میں مشکل سے دو انچ گہرا جاتا ہے۔ نہ تو وہ تری قائم رکھنے کی پروا کرتے ہیں اور نہ کھاد دینے کی۔ لیکن اس سب کے باوجود وہاں بڑی زبردست پیداوار ہوتی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی اوسط پیداوار کا آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ممالک متحدہ امریکہ کی پیداوار سے مقابلہ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۔

کرتے ہیں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ان ملکوں میں زمین زیادہ سے زیادہ ایک صدی سے زیر کاشت ہے اس لئے کوئی تعجب کی بات ہے اگر وہاں کی پیداوار زیادہ ہے۔

اوسط پیداوار کا مقابلہ

ہندوستان کی اوسط پیداوار کا دوسرے ملکوں کی اوسط پیداوار سے مقابلہ کرنے کے لئے نیچے ہم ایک گوشوارہ درج کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمیں مختلف ملکوں کی ان فصلوں کے اعداد نہیں مل سکے جو ہمارے ملک میں بھی پیدا ہوتی ہیں لیکن پھر بھی جو اعداد پیش کئے گئے ہیں وہ ہمارا نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

نام ملک	گیہوں (بشل)	دیگر اناج (بشل)	جو (بشل)	چاول (پونڈ)
ہندوستان	۱۱٫۴	۱۳٫۹	۱۹٫۲	۸۶۳
کناڈا	۱۶٫۶	۴۴٫۳	۲۵٫۴	-
ممالک متحدہ امریکہ	۱۱٫۹	۲۷٫۸	۲۴٫۸	۱۰۷۶
میکسیکو	۵٫۰	۱۱٫۸	-	۶۸۲
فرانس	۱۳٫۶	۱۷٫۸	۲۵٫۶	-
اسپین	۹٫۹	۲۲٫۴	۲۱٫۲	۳۲۷۰
پرتگال	۱۷٫۲	-	۱۱٫۳	۱۲۲۲
روس	۱۰٫۱	۱۷٫۴	۱۲٫۸	-
افریقہ	۱۰٫۹	-	۱۲٫۳	-
آسٹریلیا	۹٫۸	۱۹٫۵	۹٫۴	-

مذکورہ بالا اعداد پر رائے زنی کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں زراعتی اعداد جمع کرنے کے طریقوں کے متعلق بھی چند الفاظ کہہ دیے جائیں۔ سرکاری رپورٹ ترتیب دینے کا طریقہ سب صوبوں میں ایک سا نہیں ہے۔ عام طور پر قانون گو سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تمھارے پرگنے میں اس سال مختلف فصلوں کی پیداوار کا اوسط روپیہ میں کتنے آنے ہے؟ قانون گو یہ خدمت پٹواریوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور وہ اپنا ایک اندازہ پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے تخمینے سب قیاسی ہوتے ہیں اور ہر کھیت کی واقعی پیداوار کا اوسط نہیں نکالا جاتا ہے۔ ان تخمینوں کے گوشوارے تیار کر کے ضلع کا اوسط نکال لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے موسم اور فصل کی سرکاری رپورٹ میں پرگنہ وار اعداد نہیں ہوتے۔ گویا یہ رپورٹ صحیح اوسط پر تیار نہیں کی جاتی اس لئے صحیح حالات بھی اس سے ظاہر نہیں ہوتے۔

چند سال ہوئے کہ فی ایکڑ پیداوار معلوم کرنے کے لئے بعض مقامات میں فصلیں کاٹ کر تجربے کئے جاتے تھے اور ان کا اوسط نکال کر ضلع یا صوبہ کا اوسط معلوم کیا جاتا تھا۔ بعض مرتبہ یہ تجربے ہر تیسرے سال اور بعض مرتبہ ہر پانچویں سال ہوتے تھے۔ اس میں یہ نقص تھا کہ سب صوبوں میں یہ طریقے یکساں نہیں ہوتے تھے لیکن پھر بھی موجودہ رپورٹوں کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتبار تھے۔ اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے اور مجبوراً پٹواریوں اور قانون گویوں کی غیر معتبر رپورٹوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ مسٹر دت نے زراعتی پیداوار کے متعلق سرکاری طور پر ایک تحقیقات کی تھی۔ انھوں نے بھی اس کی شکایت کی ہے کہ تمام سرکاری اعداد چوکیداروں یا دیہی کارکنوں کی قیاس آرائی پر منحصر ہوتے ہیں۔

اتنا عرض کرنے کے بعد اگر ان رپورٹوں کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی اوپر کے اعداد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی پیداوار فی ایکڑ سب ممالک سے کم نہیں ہے۔ مثلاً میکسکو میں

گیہوں اور چاول کی پیداوار ہندوستان سے کہیں کم ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار پرتگال، یونان، روس، مراکش، الجیریا اور دوسرے ممالک سے کہیں زیادہ ہے اس لئے اکثر سرکاری اور غیر سرکاری حضرات کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان کی پیداوار سب ملکوں سے کم ہے۔

کمی پیداوار کی وجوہ

ہندوستان کی انتہائی پیداوار دوسرے ملکوں کی انتہائی پیداوار کے مقابلہ میں کم نہیں ہے لیکن اوسط پیداوار ضرور کم ہے۔ اگر ہم اس فرق کی اہمیت کو سمجھ لیں تو مسئلہ بہت صاف ہو جائے گا۔ کسی ملک میں اگر انتہائی پیداوار کافی ہو لیکن اوسط پیداوار کم ہو تو سمجھنا چاہئے کہ صحیح قسم کی زمین اور موزوں آب و ہوا میسر نہیں ہے کیونکہ اگر حالات یکساں ہوتے تو انتہائی پیداوار بھی یکساں ہوتی۔

شاہی زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ[1] میں ہندوستان کی کم پیداوار کا سبب یہ لکھا ہے کہ

"جو زمینیں پہلے پہل قابل کاشت بنائی جاتی ہیں ان میں نائٹروجن (قوت نمو) کا ذخیرہ ان زمینوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے جو محض سورج اور موسمی حالات سے نائٹروجن حاصل کرتی ہیں۔ اور اگر ان زمینوں میں بہت کافی کھاد نہ ڈالی جائے تو لازمی طور پر سال بہ سال ان کی زرخیزی میں کمی ہوتی جائے گی۔"

اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ جب آبادی بڑھتی ہے تو ادنیٰ قسم کی زمین بھی کاشت کر لی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوسط پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی آبادی کے اضافہ کی وجہ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۷۵۔

سے آئے دن ہر قسم کی اچھی بری زمین توڑی جاتی ہے۔ صوبہ بمبئی میں تین انچ گہرائی تک تو زمین اچھی ہے اس کے بعد پتھریلی اور کنکریلی ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی بنجر، اوسر، کنکریلی اور ریتیلی زمینیں کاشت کی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی پیداوار کا اوسط دوسری زمینوں کے اوسط کے ساتھ جوڑنے سے عام اوسط بہت گر جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی زمینوں کا اوسط دوسرے ملکوں کے اوسط کے برابر ہے۔ زمین قدرت کا ایک عطیہ ہے اور اس میں اضافہ کرنا انسانی طاقت کے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آبادی بڑھے گی تو خراب زمین بھی کاشت کر لی جائے گی اور پھر لازمی طور پر سارے ملک کا اوسط کم ہو جائے گا۔ ہمارے ملک کی اوسط پیداوار کی کمی کا یہ ایک خاص سبب ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم چیز بھی ہے جس سے اوسط کم ہو جاتا ہے۔ یہاں رقبہ کا اوسط فی کاشتکار دو ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اس لئے وہ اسی چھوٹے سے رقبہ میں زیادہ سے زیادہ فصلیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر پانی نہ برسے یا زمین میں تری کم ہو تو فصل بونا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں خشک کھیت میں یا تو کسان فصل نہ بونا ہی طے کرے گا یا پھر بارش کی امید پر بو دے گا۔ چونکہ ہندوستانی کسان کے پاس اور کوئی کام نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی یا اپنے بیلوں کی محنت کا حساب نہیں لگاتا اور عموماً فصل بونا ہی طے کرتا ہے۔ اس طرح بہت سا رقبہ زیر کاشت ہو جاتا ہے جو زمین زیادہ ہونے کی حالت میں ہرگز کاشت نہ کیا جاتا۔ اس کے علاوہ بہت کافی رقبہ دوفصلی بھی ہوتا ہے اس لئے اوسط اور بھی گھٹ جاتا ہے۔

ایک تیسری وجہ یہ ہے کہ کنوے اور تالابوں کو شامل کر کے صرف ۱۶ فی صدی زیر کاشت رقبہ میں آبپاشی ہوتی ہے باقی ۸۴ فی صدی کے لئے آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں ہے خشک زمین کے مقابلہ میں سیراب زمین کی پیداوار کا اوسط ۵۰ فی صدی زیادہ ہوتا ہے۔ صوبہ متحدہ کی سرکاری رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ۱۹۲۶-۲۷ء میں خشک زمین کی گیہوں کی پیداوار

۵۰ پونڈ فی ایکڑ تھی لیکن سیراب زمین کی ۱۲۵۰ پونڈ یعنی تقریباً ڈیڑھ گنی تھی۔ اسی طرح پنجاب میں ۲۷-۱۹۲۶ء میں خشک زمین کی گیہوں کی پیداوار ۵۷۶ پونڈ اور سیراب زمین کی ۹۹۷ پونڈ فی ایکڑ تھی۔ خشک زمین کی جو کی پیداوار صوبہ متحدہ میں ۹۰۰ پونڈ، پنجاب میں ۶۲۶ پونڈ فی ایکڑ تھی لیکن سیراب زمین کی صوبہ متحدہ میں ۱۳۵۰ پونڈ اور پنجاب میں ۱۰۰۴ پونڈ فی ایکڑ تھی۔ اس لئے ہم آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تمام رقبہ کو آبپاشی کی نعمت حاصل ہو تو پیداوار کا اوسط ۵۰ فی صدی بڑھ جائے گا۔ اتنے بڑے رقبہ کو سیراب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نہ تو غریب کسان ہی یہ بار برداشت کرسکتا ہے اور نہ گورنمنٹ جو خود پہلے ہی سے زیر بار ہے اس کا آسانی سے انتظام کرسکتی ہے۔ نہر سے آبپاشی کرنے میں گورنمنٹ کو ۴۶ روپیہ فی ایکڑ صرف کرنا پڑتا ہے۔ اسی شرح سے اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیر کاشت رقبہ کو نہر سے سیراب کرنے کا خرچ بے اندازہ ہوگا اس لئے موجودہ حالات میں تمام زرعی رقبہ میں آبپاشی کا انتظام کرنا ناممکن اور محال ہے۔ موجودہ نہریں بھی اپنے حلقہ کو پوری طرح سیراب نہیں کرسکتی ہیں۔ یہ عام شکایت ہے کہ نہروں میں پانی کی اتنی قلت ہوتی ہے کہ کافی پانی کبھی میسر نہیں آتا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس کھیت کو کافی پانی نہ ملے وہ زوردار فصل کیسے پیدا کرسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوسط لازمی طور پر گر جاتا ہے۔

جو سبب ہم نے بیان کئے ان کے علاوہ کچھ اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہیں جن سے پیداوار کا اوسط کم ہو جاتا ہے لیکن ان جزویات میں پڑنا غیر ضروری ہے۔ کم از کم اتنا تو ثابت ہوگیا کہ اگر موجودہ اوسط کم ہے تو اس کا علاج کسان کے اختیار سے باہر ہے اور وہ اس معاملہ میں بالکل بے بس اور الزام سے بری ہے۔

زیادہ پیداوار کے لئے زیادہ منافع کی ضرورت

یہ دلیل کہ پیداوار کا اوسط زیادہ ہوتے ہی کسان کا افلاس دور ہو جائے گا بالکل غلط ہے پیداوار کی زیادتی کا افلاس سے کوئی تعلق ہی نہیں کیونکہ پیداوار کی زیادتی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کسان کا منافع بھی زیادہ ہو جائے گا۔ بہت ممکن ہے کہ خرچ اتنا بڑھ جائے کہ کسان کو اس زیادتی کے علاوہ اپنے پاس سے بھی کچھ دینا پڑے اور نتیجہ یہ ہو کہ منافع اور کم ہو جائے۔ دراصل منافع کی زیادتی خوشحالی کا باعث ہو سکتی ہے۔ زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل نے صحیح کہا ہے[1] کہ "زیادتی پیداوار فی ایکڑ کسان کی خوشحالی کا سبب نہیں ہو سکتی بلکہ زیادتی منافع فی ایکڑ کسان کی خوشحالی کا باعث ہو سکتا ہے"۔

ایک دوسرے مصنف کا بھی یہی قول ہے کہ محض زمین کی پیداوار زیادہ ہونے سے کسان خوشحال نہیں ہو جاتا۔ سچ پوچھئے تو اس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔ جو کسان زیادہ سرمایہ لگا کر بہت زبردست فصل پیدا کرے بہت ممکن ہے کہ وہ اس چھوٹے کسان کے مقابلہ میں بالآخر نقصان میں رہے جو تھوڑے خرچ سے تھوڑا پیدا کرتا ہے۔

مثلاً فرض کیجئے کوئی کسان ایک ایکڑ میں ۳۵ روپیہ صرف کر کے ۵۰ من گیہوں پیدا کرتا ہے اور اسے ۴۵ روپیہ میں بیچتا ہے۔ گویا اسے دس روپیہ نفع ہوتا ہے۔ اب اگر وہ ۵۰ روپیہ اور خرچ کر کے ۳۰ من پیدا کر لے اور صرف ۹۰ روپیہ میں فروخت کرے تو اسے پانچ روپیہ بچیں گے یعنی نفع میں پانچ روپیہ اور کم ہو جائیں گے حالانکہ اوسط پیداوار بجائے ۵۰ من فی ایکڑ کے ۸۰ من فی ایکڑ ہو گئی ہے۔ زیادہ خرچ اور کم نفع کا اصول کاشتکاری سے بہتر اور کہیں ثابت نہیں

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۹۔

ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ جب زیادہ پیداوار ہوگی تو بھاؤ بھی گر جائے گا۔ لیکن مذکورہ بالا مثال میں ہم نے اس چیز کا لحاظ نہیں کیا ہے بلکہ ہر دو حالات میں نرخ ایک ہی رکھا ہے۔ کسان کو یہ نصیحت کرنے کے بجائے کہ وہ زیادہ پیدا کرے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرے تاکہ نفع زیادہ ہو۔ کچھ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ہر ملک میں یہ بات صحیح ثابت ہوئی ہے۔ انگلستان کو بھی جسے اپنی ترقی یافتہ اور سائنٹفک زراعت پر ناز ہے گیہوں ترک کرکے گھاس کی کاشت اختیار کرنا پڑی کیونکہ گیہوں میں بالکل نفع نہ تھا۔ انگلستان میں ۱۸۷۳ء میں ۱۸،۱۶۰،۰۷۱ ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ رقبہ گھٹ کر ۱۴،۴۷۸،۰۱۳ ایکڑ رہ گیا۔ گویا پچاس سال میں ۳،۹۷۹،۱۷۰ ایکڑ کی کمی ہوگئی چنانچہ اس معاملہ کی تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ اصل کمی گیہوں کی کاشت میں ہوئی ۱۸۷۳ء میں ۳۰،۹،۳۸۰ ایکڑ رقبہ میں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں یہ رقبہ صرف ۱۷۹،۰۷۳ رہ گیا۔ باوجودیکہ انگلستان کی اوسط پیداوار ہندوستان کی اوسط پیداوار سے بہت زیادہ ہے لیکن پھر بھی جب وہاں کے کاشتکار کو گیہوں بونے میں نفع نظر نہ آیا تو مجبوراً اس نے گھاس کاشت کرنا شروع کردی۔ جو چیز انگلستان ہی میں کامیاب نہ ہوئی وہ ہندوستان میں کیسے کامیاب ہوسکتی۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جس چیز کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے (خصوصاً اجناس کی) تو اس کی قیمت گر جاتی ہے اور پھر کسان کو اس میں نفع نہیں ہوتا۔ اس بات کو محکمۂ زراعت (امریکہ) کے سالنامے[1] ۱۹۳۰ء میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے:-

"امریکہ میں گذشتہ ۵ سال میں آلو کی قیمتوں میں اتنا ہی اتار چڑھاؤ ہوا جتنی

---

[1] ملاحظہ ہو صفحات ۵۸۹، ۵۹۵ اور ۵۹۷۔

پیداوار میں کمی بیشی ہوئی۔ مثلاً جب صرف ۳۲ کروڑ بشل پیدا ہوئے تو قیمت ۱۸ ڈالر فی بشل تھی یعنی کل ۵۷ کروڑ ڈالر وصول ہوئے۔ لیکن جب پیداوار بڑھ کر ۴۵ کروڑ بشل تک پہنچی تو قیمت گھٹ کر ۸۰ سینٹ رہ گئی اور کل ۳۵ کروڑ ڈالر ملے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیداوار کے اضافہ سے قیمت خود بخود گر جاتی ہے۔ چاہے زیر کاشت رقبوں کے اضافے سے پیداوار میں اضافہ ہو یا فصل اچھی ہونے سے پیداوار بڑھ جائے لیکن اس سے کسان کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ حکومت ہند نے بھی اب اس چیز کو محسوس کیا ہے اور یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ بنگال میں سن تھوڑے سے تھوڑے رقبہ میں کاشت کیا جائے تاکہ قیمتیں اقتصادی معیار سے زیادہ نہ گرنے پائیں۔ اس خیال سے بہت سے ملک قیمتوں کو برقرار رکھنے کے لیے مصنوعی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ یہ کوئی خیالی خطرہ نہیں ہے بلکہ حقیقی اور مستقل خطرہ ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں تحقیقات کی گئی نتیجہ یہی نکلا کہ پیداوار کی زیادتی قیمت کو کم کر دیتی ہے اور منافع زیادہ ہونے کے بجائے اور کم ہو جاتا ہے۔ سب سے قریب کی اور سب سے تازہ مثال کیوں نہ لیجئے۔ ۱۹۳۰ء میں یوپی میں گنا بڑی کثرت سے پیدا ہوا لیکن گڑ کی قیمت گھٹ کر ایک روپیہ دس آنے من ہو گئی۔ اتنی کم قیمت پہلے کبھی سننے میں بھی نہ آئی تھی۔ حالت یقیناً اور زیادہ خراب ہو جاتی لیکن گورنمنٹ نے زیادہ سے زیادہ محصول لگا کر ولایتی شکر کی درآمد روکنا شروع کر دی۔ انگلستان کے محکمۂ زراعت نے قیمتوں کے استحکام (stabilisation) کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ[1] میں لکھا ہے کہ "غیر معمولی کثیر پیداوار سے نہ صرف قیمتوں

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱۔

میں زبردست کمی ہو جاتی ہے بلکہ اس حد تک اثر پڑتا ہے کہ اس کثیر پیداوار کی مجموعی قیمت قلیل پیداوار کی مجموعی قیمت سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ کے روئی کے کاشتکاروں کو ۱۳۰ لاکھ گانٹھوں کی فصل کے مقابلہ میں ۹۰ لاکھ گانٹھوں کی فصل پر زیادہ منافع ہوتا ہے۔ اسی طرح وہاں کے گیہوں کے کاشتکاروں کو ایک ارب بشل کی فصل کے مقابلہ میں ۷۰ کروڑ بشل کی فصل پر زیادہ منافع ہوتا ہے۔" ہمارے اس بیان کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ دنیا میں زراعتی اشیاء کی ضرورت سے زیادہ پیداوار ہونے سے ان کی قیمتوں میں روز بروز کمی ہو رہی ہے۔ زیادہ پیداوار کوئی اچھا تجارتی اصول نہیں ہے۔ اخباروں میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے ملکوں میں زائد گیہوں اور روئی اس لئے جلا دی جاتی ہے کہ کسانوں کو کثرت پیداوار سے نقصان نہ ہو۔ ایک ملک میں قہوہ سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ قیمت گرنے نہ پائے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ کسانوں کے خیر خواہوں کو یہ کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پیداوار زیادہ ہو بلکہ یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ وہ ایسی چیزیں پیدا کریں جن سے منافع زیادہ ہو۔ تاجروں کے زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ[1] میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اضافہ اپنی جگہ پر بظاہر اچھی چیز ہے لیکن جب تک بازار میں وسعت پیدا نہ ہو یا کسانوں کی تعداد میں کمی نہ ہو مانگ اور پیداوار کا توازن قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر فی ایکڑ اور فی کسان پیداوار میں اضافہ ہو جائے تو قیمتوں میں نسبتاً زیادہ کمی ہو جائے گی کیونکہ مانگ اور پیداوار قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ اگر فی کس اور فی ایکڑ پیداوار برابر بڑھتی رہے تو کسان مستقل طور پر خسارہ میں رہے گا۔"

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۶۔

دقیانوسی طریقوں کی مذمت

جہاں تک ہندوستانی کسان کے کاشتکاری کے دقیانوسی طریقوں کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔ پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی کسان نہ تو اتنا بے وقوف ہے اور نہ اتنا جاہل جتنا عام طور پر اسے سمجھا جاتا ہے۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے کام کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے کاشتکاری کو ایک علم کی حیثیت سے نہیں سیکھا ہے۔ نہ وہ کسی زراعتی اسکول یا کالج میں داخل ہوا اور نہ غیر ممالک میں جا کر اس نے جدید طریقوں کی تربیت حاصل کی لیکن یہ ضرور ہے کہ پشتہا پشت کے تجربے عملی طور پر اسے اپنے فن سے پوری طرح واقف کر دیا ہے اور اس کے طریقوں کی بنیاد صحیح اصولوں پر قائم ہے۔

مسٹر جے۔ مالیسن نے ہندوستانی زراعت پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے جن الفاظ میں کسان کا تذکرہ کیا ہے وہ آج بھی اسی طرح صادق آتا ہے جیسے تحریر کے وقت صحیح تھا۔ وہ لکھتے ہیں "جن لوگوں کو اعتبار نہ ہو ان کے اطمینان کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کا کسان دنیا کے بہترین باغبانوں اور کاشتکاروں کے برابر ہی تکمیل، صفائی اور نفع بخش طریقوں سے کاشت کرتا ہے۔ میں سمجھ بوجھ کر یہ دعویٰ کر رہا ہوں اور اسے ثابت کرنے کو بھی تیار ہوں۔"

شاہی زراعتی کمیشن کی بھی اس معاملہ میں یہی رائے ہے۔ انھوں نے بھی اپنی رپورٹ اور ضمیمہ میں بہت جگہ ہندوستانی کسانوں کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1] "ہر شخص جانتا ہے کہ اکثر جگہ زراعت کا معیار بہت بلند ہے مثلاً دوآبے میں چاول کی کاشت نہایت مکمل طریقہ سے ہوتی ہے اور ان کے زراعتی اصولوں کی تردید جدید ترین تحقیقات کے بعد بھی نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۔

پہاڑی علاقوں کو نہایت خوبی سے ہموار کرنا، کنوؤں اور تالابوں کے ذریعہ سے مختلف طریقوں پر آبپاشی کرنا، ندیوں سے کھیتوں تک نہایت صحیح اصولوں پر نہریں بنانا اور زمین کی اصلاح کے لئے اسی طرح کی اور بہت سی صورتیں پیدا کرنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ان کی ہنرمندی، ذہانت اور استقلال کے ساتھ محنت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ مانا کہ ان سیدھی سادی کوششوں کا اثر بہت تھوڑے رقبہ پر پڑتا ہے اور ان کا نفع پاس پڑوس تک محدود رہتا ہے لیکن پھر بھی انھیں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بڑے بڑے سرکاری کاموں کے سامنے انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ماہرین زراعت کے لئے بھی یہ آسان نہیں ہے کہ ایک معمولی کسان کے کام میں کوئی ترمیم کردے۔" کمیشن مذکور نے ہندوستانی طریقۂ زراعت کی خوبیوں کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت زیادہ حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن چند اقتباس جن کا اس مسئلہ سے براہ راست تعلق ہے پیش کرنا ضرور مفید ہوگا۔ ضمیمہ[1] میں انھوں نے لکھا ہے "اوڑیسہ کے بہت سے حصوں میں چاول کی بہترین فصلیں پیدا ہوتی ہیں اور اعلیٰ کاشتکاری کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ بہت بڑی آبادی کی اسی سے پرورش ہوتی ہے ضلع کٹک میں تو آبادی کا اوسط فی مربع میل ۵۶۵ ہے۔" "پھر[2] گجرات کا کسان ہے (جو اتنا ہی ہوشیار ہے جتنا دنیا کے کسی حصہ کا کسان) اور دکن کا محنتی اور صابر کسان ہے۔" "جیسا[3] کہ ہم نے خیال ظاہر کیا ہے وہ بہترین کاشتکار ہے۔" "دکن[4] کے اضلاع میں بلا آبپاشی کاشت کرنے کا رواج پایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بارش بہت ہی کم اور غیر یقینی

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۹۰۔
[2] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۰۔
[3] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۵۔
[4] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۷۔

ہوتی ہے اور کنوؤں کا پانی اتنا نیچا ہوتا ہے کہ اس سے آبپاشی ناممکن ہوتی ہے تو فصلیں زیادہ گہری بوئی جاتی ہیں اور تری کے تحفظ کے لئے نرائی کرنے کی اہمیت کو کسان اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہر پانچویں چھٹے سال چھ سات بیلوں سے ایک ساتھ ہل چلایا جاتا ہے تاکہ غیر ضروری گھاس دھوپ میں سوکھ کر ضائع ہو جائے۔"

کمیشن نے ہندوستانی ہل پر رائے زنی کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے "دوسرے ہلوں کے مقابلہ میں ہندوستانی کسان جس قسم کا ہل استعمال کرتا ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ تری قائم رکھنے کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور چونکہ وہ اپنے افلاس کی وجہ سے طرح طرح کے اوزار استعمال نہیں کر سکتا اس لئے ہندوستانی ہل اس کام کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یہ ہل گہری کھدائی نہیں کرتا بلکہ اسے زرخیز بناتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کبھی کبھی گہری کھدائی کرنے والا ہل استعمال کیا جائے تو ضرور مفید ہوگا لیکن زیادہ ضرورت تو تری محفوظ رکھنے کی ہے۔ اس لئے اگر افلاس کی وجہ سے دو قسم کے ہل نہیں خریدے جا سکتے تو پھر یہی ہل بہترین ہے جو گہری کھدائی تو نہیں کرتا لیکن جتائی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بار بار ہل چلانے سے ہندوستانی ہل سے بھی وہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو مٹی پلٹنے والے ہل سے ایک دفعہ میں نکلتا ہے۔ اس خیال کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ مصر کے فلاحین جو بڑے کامیاب کسان ہیں ہندوستانی قسم کا ہل استعمال کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف رائے ہے وہ غالباً مقامی حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اس بارہ میں کوئی صحیح رائے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس طرف خاص توجہ کی جائے اور تجربات کی بنیاد پر کوئی نتیجہ نکالا جائے۔"

ناظرین پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا کہ ہندوستانی کسان میں تجربہ یا حوصلہ کی کمی نہیں ہے

اور وہ پرانے طریقوں کا پیرو سہی لیکن یہ طریقے اصول فن کے خلاف نہیں ہیں۔ باوجودیکہ گورنمنٹ نے بڑی بڑی تنخواہوں پر ماہرین زراعت کو ملازم رکھ چھوڑا ہے لیکن وہ کسانوں کو کچھ زیادہ نہیں سکھا سکتے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کے زراعتی کالجوں کے گریجویٹ کاشتکاری کا پیشہ اختیار نہیں کرتے اور جنھوں نے اختیار بھی کیا وہ بری طرح ناکام رہے۔ اسی بات سے اس دلیل کی کافی تردید ہوتی ہے کہ سائنٹفک طریقے اختیار کرنے سے کسان کو نفع ہوسکتا ہے۔ مثل مشہور ہے "نصیحت سے عمل بہتر ہے"۔ اگر سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کسانوں کو نئے طریقے اختیار کرنے سے زیادہ نفع ہوسکتا ہے تو نصیحت کرنے کے بجائے کیوں نہ وہ خود کاشتکاری کرکے اس کا عملی ثبوت پیش کریں۔

اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کاشتکاری میں اصلاح یا ترقی کے مخالف ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اصلاح کی گنجائش ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے کسان کے منافع میں کچھ زیادہ اضافہ نہ ہوگا اس لئے یہ دلیل پیش نہیں کی جاسکتی کہ کسان کی مصیبت کا سبب جدید طریقوں کا استعمال نہ کرنا یا ان سے لاعلمی ہے۔ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ پیداوار میں اضافہ کرکے اسی نسبت سے آمدنی میں بھی اضافہ ہونے کے لئے جس قدر کثیر رقم کی ضرورت ہوگی وہ نہ غریب کسان ہی خرچ کرسکتا ہے اور نہ حکومت سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کی امداد کے لئے اتنا روپیہ خرچ کرے گی۔ اگر اصلاح اور ترقی کے لئے کسان کے پاس روپیہ نہ ہو تو یہ افلاس کا نتیجہ ہوا سبب کیسے ہوسکتا ہے؟ جب کثیر رقم لگانے کا خیال کرنا ہی بیکار ہے تو کیا امید ہوسکتی ہے کہ کسان جدید اور سائنٹفک طریقے اختیار کرکے زیادہ منافع حاصل کرسکے گا۔ بہرحال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہندوستان میں اوسط پیداوار کم ہے تو یہ چیز کسانوں کے افلاس کا سبب نہیں ہوسکتی اور نہ زیادہ پیداوار ہونے سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

باب دوم

افلاس کا دوسرا غرضی سبب

کیا جوت کے کھیتوں کا جگہ جگہ واقع ہونا افلاس کا سبب ہے؟

گذشتہ چند سال سے یہ دلیل بڑے زور شور سے پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستانی کسانوں کے افلاس کا خاص سبب اکثر کھیتوں کا منتشر ہونا ہے۔ ان کے کھیت دور دور واقع ہوتے ہیں اسلئے وہ ان پر پوری پوری توجہ نہیں کر سکتے۔ منتشر رقبہ کے مقابلہ میں یکجا رقبہ کو کاشت کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے ساتھ ہی خرچ بھی کم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حد بندیوں میں جو زمین بے کار جاتی ہے اس میں بھی اگر کاشت کی جائے تو پیداوار میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

کھیتوں کو یکجا کرنے کی مشکلات

اس سے انکار نہیں ہے کہ یکجا رقبہ میں زیادہ پیداوار ہوتی ہے اور کسان کو کچھ سہولت بھی ہو جاتی ہے لیکن ہمیں اس سے قطعی اتفاق نہیں کہ یہ کسانوں کے افلاس کا خاص سبب ہے۔ اس قسم کے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں کہ حد بندی نہ ہونے کی صورت میں کتنا رقبہ کار آمد بن سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں سے کاشتکاری کے تمام کاموں میں حرج ہوتا ہے لیکن پھر بھی آبپاشی کے لئے، زمین کی سطح اور قسم میں فرق کرنے کے لئے اور بہت سی دوسری ضرورتوں کے لئے کسی نہ کسی طرح کی تقسیم بہر حال کرنا ہی ہوگی۔ زمینوں کے یکجا کرنے سے رقبہ زیر کاشت میں کچھ زیادہ اضافہ نہ ہوگا یعنی ایک فی صدی سے زیادہ کا کوئی امکان نہیں ہے اور کھیتوں کے منتشر ہونے کی وجہ سے جو مشکلات بتائی جاتی ہیں وہ بھی زیادہ تر خیالی

ہیں حقیقی نہیں۔ پھر جبکہ کسان بہت کافی وقت بے کار رہتا ہے۔ اگر اس کا تھوڑا سا وقت بچ بھی رہے تو اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن کے اندازے کے مطابق یہاں کا کسان اوسطاً سال میں چار مہینے بے کار رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کھیتوں کے یکجا ہونے سے تھوڑا سا وقت بچ جائے تو اس سے کسان کو کیا فائدہ؟ کیونکہ جب تک خالی وقت کے لئے کوئی کام تجویز نہ کیا جائے یہ وقت روپیہ میں تو تبدیل ہو نہیں سکتا۔ ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ظاہر ہے کہ کسان کی آمدنی میں دو فی صدی سے زیادہ اضافہ نہ ہوگا۔ ممکن ہے اس سے تھوڑی بہت مدد مل جائے لیکن مصیبت تو نہیں ٹل سکتی۔ اگر ہم کھیتوں کے روز بروز مختصر ہوتے جانے کی وجوہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کھیتوں کا منتشر ہونا خود کسی دوسری چیز کا نتیجہ ہے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے جملہ کاروبار بند ہوتے جا رہے ہیں اور ہندوستانیوں کے لیے کھیتی سے پیٹ پالنے کے سوائے اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ زراعت سے گذارہ کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب ایک شخص مرتا ہے تو اس کی جائداد اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس طرح یہ تقسیم پشتہا پشت سے جاری ہے اور جب تک قانون وراثت موجود ہے برابر جاری رہے گی اور جائداد کے یوں ہی ٹکڑے ہوتے رہیں گے۔ اگر ایک دفعہ جائداد یکجا بھی کر دی جائے تو کیا اطمینان ہے کہ آئندہ کوئی تقسیم نہ ہوگی اور ان میں پھر کوئی انتشار پیدا نہ ہوگا۔ اگر وراثت کے قانون موجود ہیں تو ایک دن پھر وہی صورت ہو جائے گی۔ کسی شخص کے انتقال کے بعد لازمی طور پر اس کی جائداد اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگی۔ جو لوگ کاشتکاری ترک کریں گے یا بے دخل کئے جائیں گے ان کی زمینیں دوسروں کے پاس جائیں گی اور اس سے مزید تقسیم ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر کار ان کی اجتماعی حیثیت پھر برباد ہو جائے گی۔ اگر قانون وراثت بدل دیا جائے اور یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ بڑا بیٹا جائداد کا مالک ہو تو ظاہر ہے کہ اسے نقدی کی صورت میں دوسرے

وارثوں کو معاوضہ دینا پڑے گا۔ برما میں یہ قانون رائج ہے۔ بڑا بیٹا جائداد کا مالک ہوتا ہے اور چھوٹے بھائیوں کو نقدی کی صورت میں معاوضہ ادا کرتا ہے۔ برما کی تحقیقاتی کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بریموں کے افلاس کا یہی خاص سبب ہے۔ اگر یہی قانون ہندوستان میں نافذ کر دیا جائے تو یہاں بھی یہی نتیجہ نکلے گا۔ اس تبدیلی سے جو مالی بار پڑے گا زمین اسے مشکل سے برداشت کر سکے گی۔ لہٰذا بڑا بھائی ہمیشہ مقروض اور مفلس رہے گا اور چھوٹے بھائی بے روزگار رہیں گے۔ برما میں اتنی بے روزگاری نہیں جتنی یہاں ہو جائے گی کیونکہ وہاں تو بڑے بڑے جنگل موجود ہیں، جنھیں صاف کر کے کاشت کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں تو ایک ایک انچ قابل کاشت زمین کاشت کی جا چکی ہے۔ جب تک جائدادوں کی مزید تقسیم کے روکنے کی کوئی صورت تجویز نہ کی جائے اگر ایک دفعہ زمینیں یکجا کر بھی دی جائیں گی تو عرصہ تک یہ صورت قایم نہ رہ سکے گی۔ جب تک زمینداری کا موجودہ طریقہ رائج ہے زمینوں کا یکجا کرنا مشکل ہوگا اور آیندہ یکجا رکھنا اور زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ زمینداروں کو اپنی جائداد کی اصلاح یا ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جتنا روپیہ بھی حاصل کر سکتے ہوں اسے نہ چھوڑیں۔ اس غرض سے زمیندار اچھی اور معمولی قسم کی زمینیں ملا کر اپنے آسامیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں کیونکہ علیحدہ علیحدہ اٹھانے میں ان کو نفع نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ زمینداری کے ہوتے ہوئے ایک اور دقت بھی ہے۔ کسی زمیندار کے پاس تاوقتیکہ وہ پورے موضع کا مالک نہ ہو یکجا زمینیں نہیں ہوتیں۔ اب تک عدالتوں کے ذریعہ سے بھی جو بٹوارے ہوئے ہیں وہ بھی زمینوں کو یکجا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس وجہ سے کسانوں کو کسی زمیندار سے ایک مسلسل رقبہ کاشت کے لئے نہیں مل سکتا اور اگر وہ مسلسل رقبہ لینا چاہے تو بہت سے زمینداروں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔

اکثر دیہاتوں میں ساری زمین ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی نہ سب زمینوں کو آبپاشی کی

یکساں سہولتیں حاصل ہیں۔ آبادی کے قرب وجوار کی زمین زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔ اسی طرح چاہی زمین خاکی زمین کے مقابلہ میں بہتر ہوتی ہے اور ریتلی زمین مٹیار زمین کے مقابلہ میں خراب ہوتی ہے۔ اگر زمین مسلسل رقبوں میں تقسیم کردی جائے تو ادنیٰ قسم کی یا بے موقع زمین لینا کون پسند کرے گا؟ اگر قانون کی رو سے یا کسی دوسرے طریقہ سے زمینوں کو مسلسل رقبوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ موقع اور سہولتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف قسم کی زمینوں کی مناسب قیمت لگادی جائے تو کاشتکار اس سے مطمئن نہ ہوگا۔ یہاں زراعت کی کامیابی زیادہ تر قدرتی وسائل پر منحصر ہے۔ اگر موسلا دھار بارش ہوگئی تو ممکن ہے بعض زمینیں بالکل کٹ جائیں اور ان کا مالک تباہ ہوجائے یا اگر خشک سالی پڑگئی تو ایسی زمینوں میں جنھیں آبپاشی کی سہولتیں میسر نہیں ہیں گھاس کی ایک پتی بھی نہ اگے اور کسان بھوکا مرنے لگے۔

یہ سب حقیقی مشکلیں ہیں اور ذاتی تجربہ پر منحصر ہیں۔ اکثر صوبوں کے محکمۂ مال کی سالانہ رپورٹوں سے یہ معلوم ہوگا کہ یکجائی رقبوں کے معاملہ میں صرف پنجاب میں کچھ کامیابی ہوئی ہے لیکن دوسرے صوبوں میں سرکاری کوشش کے باوجود کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ پنجاب میں اس کی کامیابی کے تین سبب ہیں اولاً وہاں سارا رقبہ قریب قریب ایک قسم کا ہے اور ایک سی سہولتیں حاصل ہیں۔ دوسرے وہاں اوسط اراضی فی کس دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے کیونکہ نہروں کے جاری ہونے کے بعد بہت سی زمین قابل کاشت بنائی گئی ہے۔ تیسرے وہاں زیادہ تر کسان ہی خود زمینوں کے مالک ہیں۔ زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ[1] میں اس چیز کو تسلیم کیا ہے کہ پنجاب میں زمین کی یکسانیت اور حق ملکیت کی سادگی کی وجہ سے جائداد کے یکجا کرنے میں سہولت ہوئی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۹۔

کھیتوں کے یکجا کرنے کا خرچ

زراعتی کمیشن کی رپورٹ میں درج ہے کہ پنجاب میں جائداد کو یکجا کرنے پر فی ایکڑ پہ سے لے کر ۱۶ تک خرچ آیا ہے۔ گویا اس حساب سے سارے ہندوستان پر ۳۳ کروڑ روپیہ صرف کرنا ہوگا۔ اس تخمینہ میں ان پیچیدگیوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے جو دوسرے صوبوں میں زمین کی قسم کے اختلاف یا آبپاشی کے فرق سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ اول تو اتنا روپیہ خرچ کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر پبلک کا روپیہ خرچ کیا بھی جائے تو یہ امید نہیں ہے کہ اس سے اتنا ہی فائدہ بھی ہوگا۔

اس لئے یہ ثابت ہوا کہ موجودہ حالات میں زمینوں کا یکجا کرنا ناقابل عمل ہے اور صرف کثیر کا باعث ہوگا۔ پھر اگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کی کوشش کی بھی جائے تو اتنا نفع نہیں ہوگا کہ کسانوں کے افلاس میں کمی ہو سکے۔ ہمارے نزدیک تو اجتماعی کاشت اس کا تنہا علاج ہے۔ اس کے تمام نشیب و فراز پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ فی الحال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جائداد کا منتشر ہونا افلاس کا خاص سبب نہیں ہے اور نہ اس کے انسداد سے کسان کی مالی حالت میں کوئی خاص فرق پڑ سکتا ہے۔

باب سوم

افلاس کا تیسرا فرضی سبب

کیا اضافہ آبادی افلاس کا سبب ہے؟

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ہمارے ملک کی آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ کونسی عجیب بات ہے جبکہ ساری دنیا میں یہی صورت ہے پھر بھی ہندوستان کے معاملہ میں یہ دلیل نہایت زور شور سے پیش کی جاتی ہے کہ آبادی میں اضافہ ہی ہندوستان کی مفلسی کا خاص سبب ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جو قوم اپنے بچوں کے گذارے کا سامان نہیں کر سکتی ہے اسے بچے پیدا کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے اور چونکہ ہندوستانیوں کی صحت خراب اور مالی حالت بہت کمزور ہے اس لئے انھیں تو آبادی میں اضافہ کرنا فوراً روک دینا چاہیئے۔ یہ دلیل تو بہت کمزور ہے اگر اضافہ کا اوسط دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہمارے یہاں زیادہ ہوتا تب تو یہ دلیل پیش کرنا جائز بھی تھا کہ اضافۂ آبادی ہندوستان کے افلاس کا باعث ہے۔

افلاس سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے

معاشیات کا یہ مشہور نظریہ ہے کہ شرح پیدائش غریبوں میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان میں بچوں کے زندہ رہنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو اضافۂ آبادی افلاس کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب۔ اس لئے اگر ہمیں آبادی میں کمی کرنا ہے تو پھر دوسری طرف سے شروع کرنا چاہیئے یعنی افلاس کو گھٹانے کی تدبیریں کرنی چاہئیں۔ اگر پہلے افلاس دور ہو جائے تو یہ اضافہ خود بخود رک جائے گا۔ فرض کیجئے اگر ہم اس عقیدے کی تبلیغ بھی کرتے پھریں کہ آبادی

کے اضافہ کو روکنا چاہیئے تو بالکل بے اثر ہوگی اور کوئی توقع نہیں کی جاسکتی کہ جلد کامیابی ہوسکے گی۔ ہم موجودہ حالات کو نظر انداز نہیں کرسکتے اور نہ اس طویل عرصہ تک انتظار کرسکتے ہیں جب اس وسیع براعظم میں ہماری کوششیں بار آور ہوں۔ جاپان نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ پروپیگنڈا کیا کہ اس ملک کی آبادی میں اضافہ نہ ہو اور وہاں کے باشندے کم بچے پیدا کریں مگر ہر مردم شماری ظاہر کرتی ہے کہ اس پروپیگنڈے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اور مردم شماری میں ہر بار برابر اضافہ ہورہا ہے۔ پھر ہندوستان جیسے ملک سے جس میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد صرف ۸ فی صدی ہو یہ امید کرنا کہ وہ اس نصیحت پر عمل کریں گے عبث ہے تاہم اگر ہندوستان میں غیر معمولی طور پر زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں تو یقیناً ہمارا فرض ہے کہ ہم ملک کو ضبط تولید کی نصیحت کریں لیکن واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔

ہندوستان اور انگلستان کی اضافۂ آبادی کا مقابلہ

اس سلسلہ میں سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ ہم برطانیہ کا اپنے ملک کی اضافۂ آبادی سے مقابلہ کریں۔ اگر ہندوستان میں آبادی کا اضافہ برطانیہ کے مقابلہ میں زیادہ تشویش ناک نہیں ہے تو ہمیں افلاس کا کوئی دوسرا سبب تلاش کرنا پڑے گا۔ ۱۸۷۱ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی ۲۲,۶۶,۲۷,۱۲,۲ تھی۔ ۱۹۲۱ء میں ۳۷,۸۶,۶۹۹ ہوگئی گویا ۵۰ سال کے عرصہ میں ۶۶ فی صدی اضافہ ہوا۔ اب ذرا ہندوستان کے اعداد پر نظر ڈالیے۔ ۱۸۷۲ء میں ہندوستان کی آبادی ۲۰,۶۱,۶۲,۳۶۰ تھی جو ۱۹۲۱ء میں ۳۱,۸۹,۴۲,۴۸۰ ہوگئی یعنی ۵۴ فی صدی کا اضافہ ہوا جو پھر بھی برطانیہ سے ۱۲ فی صدی کم ہے۔ ۱۸۷۲ء کے اعداد ہندوستان کے صرف ان حصوں تک محدود ہیں جو اس وقت برطانوی حکومت میں تھے گویا ملک کی پوری آبادی ان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے ۱۹۲۱ء کے اعداد میں ان مقبوضات کی آبادی بھی شامل ہے جو ۱۸۷۲ء

کے بعد برطانیہ کے قبضہ میں آئے۔ اگر ان تمام مقبوضات کی آبادی کو خارج کر دیا جائے تو اضافہ مشکل سے ۳۳ فی صدی رہ جاتا ہے یعنی انگلستان کے اسی مدت کے اضافہ کا ٹھیک ٹھیک آدھا[۱]۔

رپورٹ مردم شماری ۱۹۳۱ء میں پچاس سال کی مردم شماری کے اضافہ کا حساب لگایا گیا ہے۔ اس کے مطابق ۱۸۸۱ء سے ۱۹۳۱ء تک یعنی گذشتہ پچاس سال میں ہندوستان میں صرف ۳۹ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے[۲]۔

مسٹر بی۔ این۔ بنرجی معاشیات کے ایک ماہر ہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب موسومہ "ہندوستانی معاشیات کا مطالعہ"[۳] میں ہندوستان اور انگلستان کے اضافۂ آبادی کا مقابلہ کیا ہے اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے ہیں وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

زمانہ	اضافہ ہندوستان	اضافہ انگلستان
۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۱ء	۲٫۴ فی صدی	۱۲٫۱۷ فی صدی
۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۱ء	۷ "	۱۰٫۹۱ "
۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۱ء		۴٫۰۱ "

ان اعداد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے مقابلہ میں ہندوستان میں اضافۂ آبادی بہت کم ہوا ہے لیکن اگر اس امر کا بھی لحاظ کیا جائے کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر کتنے انگریز ترک وطن کر کے نوآبادیات میں سکونت اختیار کرنے کے لئے چلے گئے ہوں گے تو یہ اضافہ نسبتاً اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے ہم ہندوستان کو اس سلسلہ میں کچھ زیادہ مجرم

---

[۱] ملاحظہ ہو ماڈرن ریویو ۱۹۲۹ء صفحہ ۳۵۱۔

[۲] ملاحظہ ہو رپورٹ مردم شماری جلد ۱ صفحہ ۴۔ [۳] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۷

نہیں ٹھہرا سکتے۔

اگر انگلستان اپنی آبادی کے اضافہ کی وجہ سے زیادہ مفلس نہیں ہوا تو پھر آبادی کے اضافہ کو ہندوستان کی اس بڑھتی ہوئی مفلسی کا سبب قرار دینا کہاں تک معقول ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں کھانے پینے کی چیزیں اس کثرت سے پیدا ہوتی ہیں کہ نہ صرف ہماری ضروریات کے لئے کافی ہیں بلکہ ہم دوسرے ملکوں میں بھی بھیجتے ہیں لیکن انگلستان کو تو کھانے پینے کی چیزیں باہر سے منگانا پڑتی ہیں اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ "بھوکے پیٹ" کا سوال ہندوستان ہی کے لئے کیوں مخصوص ہے اور انگلستان کے لوگ اس سے کیوں بری ہیں۔ اگر آبادی کا اضافہ ہی فاقہ کشی کا سبب ہوتا تو آج انگلستان کی حالت ہندوستان سے زیادہ ردی ہوتی۔

افراد خاندان کا اضافہ افلاس کا باعث نہیں ہے

کسی خاندان کی مالی حالت اس کے افراد کی تعداد پر منحصر نہیں ہے۔ ایک گھر میں اگر تین شخص ہیں اور تینوں بے روزگار ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ فاقے مریں گے لیکن اگر کسی گھر میں کمانے والے کافی تعداد میں ہیں تو وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور روپیہ پس انداز بھی کرتے ہیں مزدوروں کے خاندان میں بھی اگر سب لوگ برسر روزگار ہیں اور انھیں معقول اجرت ملتی ہے تو ایک نئے مہمان کا اضافہ انھیں ہرگز ناگوار نہ ہوگا بلکہ وہ اور خوش ہوں گے۔ تو موں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہندوستانیوں کو بھی روزگار کے ایسے ہی مواقع حاصل ہوں جیسے انگریزوں یا دوسری تو موں کو حاصل ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان بھی موجودہ آبادی سے کہیں زیادہ کی پرورش نہ کر سکے۔ بے روزگاروں کی مجموعی تعداد کے متعلق کوئی صحیح اعداد موجود نہیں ہیں حالانکہ تعلیم یافتہ طبقہ عرصہ سے چلا رہا ہے کہ اس ملک کے بے روزگاروں کی ردی حالت کی تحقیقات کی جائے۔ لوگ گورنمنٹ سے برابر اصرار کر رہے ہیں کہ بے روزگاروں کے لئے مفید پیشے تجویز

کئے جائیں اور صنعت وحرفت کی نئی راہیں پیدا کی جائیں لیکن اب تک گورنمنٹ نے اس اہم مطالبہ کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے لاتعداد بے روزگاروں کی امداد کرنا گورنمنٹ اپنا فرض ہی خیال نہیں کرتی ہے۔ جب کبھی تخفیف کا سوال درپیش ہوتا ہے تو غریب اور بے پڑھے شاگرد پیشہ اور کم تنخواہ پانے والے عملہ کو ذبح کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں ہوتا اور نہ کارخانوں میں مزدوروں کے لئے محنت کے دن اور گھنٹے کم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان آدھے پیٹ کھانے والوں پر اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں لیکن انگلستان جیسے آزاد ملک میں یہ ہرگز روا نہیں رکھا جاسکتا۔ وہاں کوئی وزارت اگر اس قسم کی جرأت بھی کرے تو دوسرے ہی دن نکال دی جائے۔

دوسرے ملکوں سے مقابلہ

ڈاکٹر (سر) پی۔ سی۔ رائے نے اپنی کتاب موسومہ "ہندوستان کا مسئلہ افلاس" میں ذیل کا نقشہ دیا ہے جس میں مختلف ملکوں کی اوسط آبادی فی مربع میل کا آپس میں مقابلہ کیا گیا ہے:۔

نام ملک	اوسط آبادی فی مربع میل
بلجیم	۵۴۰
انگلستان	۴۹۸
ہالینڈ	۳۶۰/۹
چین	۲۸۹
اٹلی	۲۶۳/۶
جرمنی	۲۳۶/۷

نام ملک	اوسط آبادی فی مربع میل
ہندوستان	۲۲۹
فرانس	۱۸۷٫۸
آئرلینڈ	۱۴۴٫۴
اسکاٹ لینڈ	۱۳۲
اسپین	۸۰
ناروے سویڈن	۲۷
ترکی	۲۴
امریکہ	۱۷٫۹
روس	۱۳

مذکورہ بالا نقشہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں آبادی گنجان ضرور ہے لیکن اتنی نہیں جتنی یورپ کے اکثر ممالک میں ہے بلکہ یہاں ابھی اضافہ کی اور گنجائش ہے۔

رپورٹ مردم شماری ۱۹۳۱ء کے صفحہ ۴ پر بھی اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کریں۔ مصنف رپورٹ فرماتے ہیں:۔

"کل ہندوستان کا رقبہ جس کی مردم شماری کی رپورٹ پیش کی گئی ہے ۱۸ لاکھ مربع میل ہے جس میں کل آبادی ۳۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے یعنی ایک مربع میل میں ۱۹۵ اشخاص آباد ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ملک کے ہر حصہ میں آبادی ایک سی ہے بلکہ اس میں بلوچستان جیسا صوبہ بھی شامل ہے جہاں ایک میل میں ۶٫۵ متنفس آباد ہیں اور چھتگانی ضلع بھی ہے جہاں ایک میل میں صرف ایک آدمی

رہتا ہے۔ اسی اوسط میں وہ مقامات بھی شامل ہیں جہاں ایک مربع میل کے اندر دو ہزار آدمی آباد ہیں مثلاً جنوب و مغربی ساحل پر ریاست کوچین میں وہ مقامات بھی شامل ہیں جہاں ایک گانوں کے اندر ۴۰۰۰ اشخاص فی مربع میل رہتے ہیں۔

. . . . . .

اگر موجودہ آبادی کا انگلستان اور ویلس کی آبادی سے مقابلہ کریں تو واضح ہوگا کہ وہاں پر ۵۸۰۰۰ مربع میل کا رقبہ ہے اور آبادی ۴ کروڑ ہے یعنی اوسط آبادی ۶۸۵ اشخاص فی مربع میل ہے۔ کل یورپ کی آبادی ۳۷۵۰۰۰۰ مربع میل میں ۴۷۵۰۰۰۰ ہے اور اوسط ۱۲۷ اشخاص فی مربع میل ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی ۳۰۲۷۰۰ مربع میل میں ۱۲۳۰۰۰۰۰ ہے اور اوسط ۴۱ اشخاص فی مربع میل ہے۔ چین کی آبادی جس میں تبت، منگولیا، ترکستان اور منچوریا بھی شامل ہیں ۳۴۲۰۰۰۰۰ ہے اور اس کا اوسط ۸۰٫۵ اشخاص فی مربع میل ہوتا ہے۔ اگرچہ زرخیز حصوں میں آبادی کا اوسط اس سے کہیں زیادہ ہے۔ صرف چین خاص کی اوسط آبادی ۲۰۰ سے ۲۲۰ اشخاص فی مربع میل ہوتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس پر کسی حاشیہ افزائی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کم از کم وہ ڈراؤنی تصویر جو ہمارے سامنے اکثر کھینچی جاتی ہے ڈراؤنی نہیں رہتی۔

جاپان ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں آئے دن زلزلے آتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی اسکا اوسط آبادی فی مربع میل ہندوستان سے ۶۰ فی صدی زیادہ ہے۔ وہ تو اپنے افراد قوم کی معقول تعداد سے پرورش کر سکتا ہے لیکن ہندوستان اپنی آبادی کے گذارے کی بھی سبیل نہیں کر سکتا۔ ذرا

جاپان کا پنجاب سے مقابلہ کیجئے۔ جاپان کا رقبہ ایک لاکھ ۴۲ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ۵۹,۶۱,۱۴۰ ہے اور پنجاب کا رقبہ ایک لاکھ ۳۶ ہزار ۹۲۵ مربع میل ہے لیکن اس کی آبادی صرف ۲۵۸۵۰۲۴ ہے۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ جاپان کا رقبہ اگرچہ پنجاب کے تقریباً برابر ہی ہے لیکن وہ پنجاب سے ڈھائی گنے افراد کی پرورش کر سکتا ہے۔ اور اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ ایک معمولی جاپانی کی مالی حالت ایک پنجابی سے بہتر ہے اور اس کا معیار زندگی بھی بہت بلند ہے۔

ترک وطن نہ تو ممکن ہے اور نہ صحیح علاج

وہ لوگ جو اضافۂ آبادی کو ہندوستان کے افلاس کی وجہ بتاتے ہیں یہ رائے رکھتے ہیں کہ زائد آبادی کو دیگر ممالک میں ترک سکونت کر جانا چاہیے۔ وہاں وہ اچھے رہیں گے اور بقیہ آبادی یہاں خوشحال رہ سکے گی۔

رپورٹ مردم شماری ۱۹۳۱ء کے مطابق ہندوستانیوں کی مندرجہ ذیل تعداد دیگر ممالک میں پائی جاتی ہے:۔

نام ملک	ہندوستانیوں کی تعداد
لنکا	۷۷۸۱۷۰
ملایا	۶۲۴۰۰۹
ماریشس	۲۷۸۸۷۰۰
جنوبی افریقہ	۱۶۵۵۰۰
ٹرینی ڈیڈ	۱۳۸۶۶۷
برٹش گائنا	۱۳۰۵۴۰
فی جی	۷۵۱۱۷

نام ملک	ہندوستانیوں کی تعداد
کینیا	۲۶۷۵۹
ٹنگنیکا	۲۳۴۲۲
جمیکا	۱۷۵۹۹
زنزیبار	۱۵۲۴۶
یوگنڈا	۱۱۶۱۳
انگلینڈ اور ویلز	۷۱۲۸
برٹش آئلز	۲۱۱۵
ہانگ کانگ	۴۷۴۵
دیگر ممالک	۱۰۵۰۰
جملہ برٹش ایمپائر	۲۳۰۰۰۰۰
دیگر ممالک	۱۰۴۰۰۰

یہ دلیل ایک فریب سے کم نہیں اور تجزیہ کے بعد بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ افریقہ، ماریشس، کناڈا اور دوسری نو آبادیوں میں ترک سکونت کر کے گئے۔ جن لوگوں نے ان ہندوستانی تارکین وطن کی پردیس کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے مصائب سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس لئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ سلسلہ قطعی روک دینا چاہیئے۔ جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کی ستیاگرہ کی تحریک مثال کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ اُس وقت ایک باہمی سمجھوتہ ہو گیا لیکن واقعہ یہی ہے کہ آج بھی ہندوستانی کسی نہ کسی ناانصافی اور حق تلفی کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ان نو آبادیوں میں بھی جو سلطنت برطانیہ کا ایک جزو ہیں ہندوستانیوں

کے ساتھ سلطنت کے دوسرے افراد کی طرح برابری کا سلوک نہیں ہوتا۔ غیر ممالک میں آپ کے ساتھ شریفانہ برتاؤ ممکن نہیں ہے جبتک آپ کی گورنمنٹ اور آپ کی قوم آپ کی پشت پناہی نہ کرے۔ یہی نہیں کہ ان بے پڑھے مزدوروں کے ساتھ جنھیں دوسرے ملکوں میں اقرار نامے لکھوا لکھوا کر لے جاتے ہیں برا برتاؤ کیا جاتا ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو بھی طرح طرح کی مشکلوں اور ذلتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ روزانہ ہم یورپ اور امریکہ کے مختلف ملکوں اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی طلبا کی مشکلات سنتے ہیں لیکن ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ دوسرے ملکوں میں نسل اور رنگ کا امتیاز آسانی سے دست ہے کہ ہمارے قوم کے افراد ایک ایک قدم پر ذلت محسوس کرتے ہیں خواہ وہ تھوڑے ہی عرصہ کے لئے وہاں گئے ہوں۔ ہندوستان کے دروازے تمام قوموں کے لئے کھلے ہوئے ہیں لیکن ہندوستانیوں کی کہیں پوچھ نہیں ہے۔ ہندوستانی تو خود اپنے ملک میں ذلیل ہے۔ پھر کیا تعجب اگر دوسرے ملکوں میں بھی اس کی ناقدری ہو۔

باب چہارم

افلاس کا چوتھا فرضی سبب

کیا غیر یقینی بارش افلاس کا سبب ہے؟

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کسان کی خوش حالی باقاعدہ بارش پر منحصر ہے۔ اگر صحیح وقت پر بارش ہو جائے تو خوب زوردار فصل پیدا ہوتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو اسے مصنوعی وسائل اختیار کرنا پڑتے ہیں اور جو کچھ وہ پس انداز کرتا ہے اس مصیبت کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ عام طور پر پانچ برس میں صرف ایک مرتبہ باقاعدہ بارش ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایک سال کی اچھی پیداوار چار سال کی خراب فصل کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستانی کسان کی خوش حالی ورن دیوتا کی نظر کرم پر منحصر ہے۔ اگر دیوتا خوش ہے تو کسان خوش حال ہیں اور اگر دیوتا ناراض ہوا تو بس کسان کے لئے مصیبت ہی مصیبت ہے۔ ابھی تک سائنس داں ایسی کوئی ترکیب معلوم نہیں کر سکے ہیں کہ بارش میں باقاعدگی پیدا کی جا سکے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسان کی آسودگی انسانی طاقت سے باہر ہے۔

صوبوں کی کونسلوں اور اسمبلی میں ممبر مال اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان کا بجٹ گویا بارش کا بجٹ ہے۔ اگر بارش ہو گئی تو سمجھنا چاہیئے کہ متوقع وصولیابی ہو جائے گی اور اگر بارش نہ ہوئی تو بجٹ میں خسارہ رہے گا۔ ریلوے، ڈاکخانہ، ٹکسال، تجارت، درآمد، برآمد غرضکہ تمام محکموں کی آمدنی کسان کی آمدنی پر منحصر ہے اور کسان کی آمدنی بارش پر منحصر ہے۔ نمک وغیرہ پر محصول لگا کر اکثر گورنمنٹ جو اپنے بجٹ کا خسارہ پورا کرتی ہے اس سے غریب کسان کی مصیبتوں میں اور

اضافہ ہو جاتا ہے۔

مصنوعی آبپاشی

بظاہر تو یہ بات بالکل سچ معلوم ہوتی ہے کہ کسان کی خوش حالی بارش سے وابستہ ہے لیکن اگر ذرا غور کیجئے تو اس دلیل کا سارا فریب کھل جاتا ہے۔ زراعت تو صرف ایک فن ہے یعنی ضروری معلومات اور سامان کی مدد سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے۔ گیہوں کا بیج اگر زمین میں پڑ جائے تو وہاں اتنی کائی نمی ہوتی ہے کہ وہ عموماً جم آتا ہے۔ جمنے کے بعد اگر حالات موافق ہوں تو بعض پودوں میں بالیاں آجاتی ہیں ورنہ سوکھ جاتے ہیں۔ کسان اس فطری نشوونما پر بس نہیں کرتا بلکہ ہل چلا کر اپنی فصل کے لئے زمین تیار کرتا ہے۔ کھاد سے زمین کو زرخیز بناتا ہے۔ فصل کی نگہداشت کرتا ہے اور ٹھیک وقت پر پانی دیتا ہے۔ اس طرح گویا وہ علم اور سامان کی مدد سے اس سے زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جتنا جنگل میں یوں ہی بیج پھینک دینے سے قدرتاً پیدا ہو سکتا۔ فن زراعت اسی کا نام ہے کہ ایسے مفید فطرتی اصول معلوم کئے جائیں جن سے زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو سکے اور پھر ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ہر موقع پر کسان قدرتی انتظام میں مناسب تبدیلیاں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے فصل اچھی پیدا ہو مثلاً اگر گھاس اگ آتی ہے تو اسے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اگر ان پودوں پر جنھیں دھوپ لگنا ضروری ہے کسی درخت کا سایہ پڑتا ہو تو اسے کاٹ ڈالتا ہے۔ اگر زمین میں پودوں کے لئے خوراک اور نمی نہیں ہوتی تو مصنوعی طریقوں سے بہم پہنچاتا ہے۔ جو زمین سخت ہوتی ہے اس میں ہل چلاتا ہے اور اسے تیار کرتا ہے تاکہ پودے کی جڑیں آزادی سے پھیل سکیں۔ گویا کسان کو ہر ہر قدم پر قدرتی حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر صرف بیج بکھیر دینے سے فصلیں پیدا ہو جایا کرتیں تو ہر شخص کسان بن جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ایک شخص کو

کامیاب کسان بننے کے لئے پودے کی پرورش کے متعلق کافی علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں کہ یہ علم کارآمد ہو سکے۔ انسان نے پودے کے بڑھنے کے قدرتی اصول معلوم کئے ہیں اور سائنس نے وہ ذرائع مہیا کر دئے ہیں کہ محنت کا زیادہ سے زیادہ پھل ملے۔ سائنس داں کسان تو موسمی حالات اور زمین کی فطرتی خرابیوں پر بھی حاوی ہو گیا ہے مثلاً سرد ملکوں میں وہ پودوں کو مصنوعی گرمی پہنچاتا ہے اور گرم ملکوں میں مصنوعی سردی پہنچاتا ہے۔ بہرحال پودوں کی پرورش کے لئے جس قسم کے فطری اثرات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا انتظام کر لیتا ہے لیکن قدرت پر کہیں اس کا قابو نہیں چلتا۔ ہندوستان کا کسان بھی قدرت کے سامنے ایسا ہی مجبور ہے جیسے دوسرے ملکوں کا کسان۔ یہ آسمانی مصیبتیں غریب کسان کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں ضرور آتی ہیں۔ بعض ملکوں میں مہینوں تک مسلسل برف پڑتا ہے اور پودے کا بڑھنا ناممکن ہوتا ہے۔ بعض جگہ آندھیاں فصلوں کو تباہ کر دیتی ہیں کہیں سورج کی تپش انھیں جھلسا دیتی ہے۔ ہمارے خیال میں بارش کا وقت پر نہ ہونا ان معمولی مشکلات میں سے ہے جن کی آسانی سے تلافی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں ہر شخص آبپاشی کے فن سے واقف ہے اور یہ فن صدیوں سے یہاں رائج ہے۔ اسی طرح دوسرے ملکوں کے کسان بھی مقامی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیر یقینی بارش کسان کے افلاس کا سبب ہے درحقیقت وہ زراعت کے فن سے بالکل ناواقف ہیں۔ بارش کے دیوتاؤں کو خوش کرنے سے باقاعدہ بارش نہیں ہو سکتی بلکہ یہ تو کسان کی اپنی محنت پر منحصر ہے کہ وہ کھیتی کو کافی تری دے۔ افریقہ تو ہندوستان سے کہیں زیادہ گرم ملک ہے۔ جنوبی افریقہ کے ریتیلے میدانوں میں سائنس دانوں نے ایسے کنوئیں کھودے ہیں کہ پانی خود بخود سطح زمین تک آجاتا ہے اور مشین کی مدد کے بغیر کھیت مصنوعی طور پر سیراب ہو جاتے ہیں۔ یہی ترکیب

ہندوستان میں بھی کی جاسکتی ہے۔ حال ہی میں مدراس میں ایسے کنوئیں بنائے گئے ہیں جن سے دو ہزار گیلن فی منٹ کے حساب سے سطح زمین سے ۲½ فٹ اونچا پانی برابر نکلتا رہتا ہے۔ مزید تحقیقات کرنے پر ممکن ہے کہ سارے ہندوستان میں ایسے کنوئیں بنائے جاسکیں اور اس طرح آبپاشی کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے۔

دوسری مثال لیجئے۔ ابھی کوئی ایک صدی گذری کہ پنجاب کا بہت بڑا حصہ بالکل ریگستان تھا۔ لیکن گورنمنٹ نے نہروں کا ایک جال وہاں بچھا دیا جس سے اب بڑا وسیع رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ اس نئی مزروعہ زمین کی پیداوار آج ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بارش کا وقت پر نہ ہونا فصلوں کی خرابی کا باعث ہے۔ دراصل اس افسوسناک حالت کی ذمہ داری زیادہ تر حکومت پر ہے کہ وہ مصنوعی آبپاشی کے کافی ذرائع مہیا نہیں کرتی۔ ہندوستان میں تو سینکڑوں ندیاں ہیں جن سے نہایت آسانی سے نہریں نکالی جاسکتی ہیں اور وہ وسیع رقبہ جو آج خشک پڑا ہے اچھی طرح سیراب ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ صرف ان ندیوں سے پانی مل سکتا ہے بلکہ زمین کی تہ میں بھی پانی کا ایک ذخیرہ موجود ہے جسے ٹیوب ویل (نل کے کنوؤں) کے ذریعہ سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں بارش کا اوسط ۴۰ انچ ہے جو فصلوں کی تیاری کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ قدرت ہر سال پودوں کی یہ غذا افراط سے مہیا کرتی ہے لیکن ہم اپنی ناواقفیت اور وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ پھر شکایت کرتے ہیں کہ بارش کا نہ ہونا افلاس کا سبب ہے۔

کمیشن آبپاشی کی رپورٹ میں یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں بارش کا ۵۰ فی صدی پانی پھر سمندر میں واپس چلا جاتا ہے۔ اگر یہ پانی کسی طرح آبپاشی کے کام میں آسکے تو زمین ٹیوب ویل

کے مقابلہ میں اس سے کہیں زیادہ سیراب ہو سکے گی۔ اس لئے ہم بارش کی قلت کی شکایت نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مزروعہ زمین کے صرف ۱۷ فی صدی رقبہ کو آبپاشی میسر ہے۔ باقی ۸۳ فی صدی یوں ہی خشک پڑا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض صوبوں میں تو وہ تالاب جن سے آبپاشی ہوتی تھی بے پروائی سے چھوڑ دیئے گئے ہیں اور لاکھوں کنوئیں بیکار ہو گئے ہیں کیونکہ کسان اپنے افلاس کی وجہ سے ان کی مرمت نہیں کرا سکتا

آج سائنس کے دور میں لاکھوں یونٹ بجلی اسی لئے استعمال کی جاتی ہے کہ کسانوں کو پانی سستا پڑے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں غریب کسان کی مدد کے لئے بجلی استعمال نہیں کی جاتی۔ جہاں کہیں بجلی کا انتظام کیا جاتا ہے وہاں شہر والوں کے آرام پر کسان کا مفاد قربان کر دیا جاتا ہے۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بارش کی قلت اس وجہ سے ہے کہ بہت سے جنگل کاٹ ڈالے گئے جس سے رطوبت کم ہو گئی ہے اور پہلے کی سی بارش نہیں ہوتی۔ ہم اس دلیل کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے تو اس چیز کی ذمہ داری کیا ان لوگوں پر ہے جنھوں نے بے روزگاری کی وجہ سے جنگل کاٹ کر کھیت بنا لئے یا حکومت پر ہے جس نے آمدنی کی خاطر قیمتی لکڑی بیچ ڈالی۔

یہ چیز ہماری بحث سے باہر ہے کہ ہندوستان میں بارش کی قلت کا کیا سبب ہے لیکن ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بارش کا وقت پر نہ ہونا افلاس کا اتنا سبب نہیں ہے جتنا یہ کہ یہاں مصنوعی آبپاشی کے ذرائع میسر نہیں ہیں۔

باب پنجم

افلاس کا پانچواں فرضی سبب

کسان کی فضول خرچی

دیہی اقتصادیات کے اکثر مصنفین کا یہ خیال ہے کہ کسان خود اپنی فضول خرچیوں کی وجہ سے مفلس رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ شادی اور دوسری تقریبوں کے موقع پر بہت زیادہ خرچ کر دیتا ہے۔ اس خرچ کے لئے قرض لیتا ہے اور یہ قرض کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ قرض بڑھتا جاتا ہے یہانتک کہ وہ دیوالیہ اور مفلس ہو جاتا ہے۔

فضول خرچی کے علاوہ کوتاہ اندیشی بھی مقروض ہونے کا ایک اور سبب بتلائی جاتی ہے۔ ہندوستانی کسان کو مختلف مصنف مختلف طرح سے عادتاً کوتاہ اندیش بتاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہندوستانی اقتصادیات کے بہت کم مصنف ایسے ہیں جو کسانوں کی ذہنیت اور ان کے جذبات معلوم کرنے کے لئے ان سے ملتے جلتے ہوں اور اس کے بغیر ان کی کوتاہ اندیشی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر حضرات کسانوں کے متعلق غلط فیصلہ کرتے ہیں مثلاً بڑی بڑی قیمتوں پر زمین خریدنا اس کی کوتاہ اندیشی سمجھی جاتی ہے لیکن حقیقتاً اکثر موقعوں پر ان کا یہ فعل بالکل جائز ہوتا ہے۔ کہتے افسوس کی بات ہے کہ ان حالات کا مطالعہ کئے بغیر جن سے وہ مجبور ہیں لوگ کسانوں پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ انسان بہرصورت ایک انسان ہے مشین تو ہے نہیں۔ سماجی حالت، ذہنی کیفیت، مذہبی رسم و رواج اور سینکڑوں چیزیں اس کے طرز عمل کی ذمہ دار ہیں۔ یہ اثرات انسان پر اتنے

حاوی ہوتے ہیں کہ بعض مرتبہ وہ بالکل غیر ارادی طور پر بڑی بڑی حرکتیں کرتا ہے۔ ہندوستانی کسان بھی اپنے پس و پیش کے حالات کا ایسا ہی پابند ہے جیسے اور دوسرے انسان۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی اپنے ماحول کا شکار ہو جاتے ہیں۔ معمولی خطابات یا اعزازی عہدوں کے لئے وہ روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ بعض لوگ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلی کے انتخابات پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ فضول خرچیوں کی مثالوں پر مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن پھر بھی ان پر کوئی اس طرح اعتراض نہیں کرتا جس طرح ایک کسان ہی مورد الزام ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اسے غریب اور بے پڑھے کسان اور اس کے رویہ پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے۔

کسان کی زندگی کفایت اور خدمت کا مجسمہ ہے۔ صبح سے شام تک وہ اپنی ساری عمر ایک ہی قسم کے کام میں گذارتا ہے۔ اکثر اس کی راتیں بھی کھیت ہی پر بسر ہوتی ہیں اور کاشتکاری کی ایک ہی نوعیت پر غور کرتا ہوا وہ سو جاتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی چہل پہل سے اسے کوئی تعلق نہیں اور دنیا کی خبریں بھی اسے جب ہی معلوم ہوتی ہیں کہ کوئی شخص کسی کام سے گاؤں میں آئے اور کوئی پرانا اخبار اٹھا لائے۔ سینما، تھیٹر اور دوسری تفریحات کے متعلق اسے کوئی علم نہیں۔ شاذ و نادر اسے بڑے بڑے عالموں اور پنڈتوں کا وعظ سننے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی یک رنگی اور سراسر یک رنگی ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسے تو صرف محنت اور مشقت سے کام ہے۔ پھر اگر خوش قسمتی سے کبھی شادی یا کسی اور تقریب کا اتفاق ہو تو یہ عین فطری ہے کہ وہ خوشی اور مسرت کے جوش میں ذرا سی فضول خرچی اور کوتاہ اندیشی سے کام لے۔ ایسے مواقع جو ساری عمر میں دو ایک مرتبہ پیش آتے ہیں قدرتاً خاندان بھر کے لئے زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ ان موقعوں پر دعوتیں کی جاتی ہیں اور

دور نزدیک کے عزیز اقارب، دوست احباب سب جمع ہوتے ہیں ایسے وقت میں اگر کسان کچھ زیادہ خرچ کر دیتے ہیں تو کونسا گناہ ہے ہم مانتے ہیں کہ خرچ کے معاملہ میں کسی شخص کو چادر سے زیادہ پاؤں نہ پھیلانا چاہئے۔ تاہم اگر ایسے غیر معمولی موقعوں پر کوئی شخص تھوڑا سا حد سے بڑھ جائے تو زیادہ الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ کسانوں کے معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے وہ اگر اس سختی سے ان کے رویہ پر نکتہ چینی کریں تو ایک حد تک ظلم ہے۔ کیا تعلیم یافتہ حضرات ایسے موقعوں پر خود کچھ بہتر مثال پیش کرتے ہیں۔ کیا کبھی ان کی بہبودی کے لئے یا ان کی جہالت دور کرنے کے لئے انھوں نے کوئی کوشش کی کیا کبھی انھوں نے یہ زحمت گوارا کی کہ ان کے پاس جا کر ان کے معاملات میں دلچسپی لیں۔ اگر ایسا نہیں کیا تو پھر ان پر الزام لگانا بھی غلط ہے۔

فضول خرچی کی رسمیں دراصل اس خوش حالی کے زمانہ کی یادگار ہیں جب کسان کے پاس خرچ کرنے کو افراط سے تھا۔ اس کے کھلیان اناج سے بھرے رہتے تھے۔ دودھ، دہی اور گھی کی کمی نہ تھی۔ خوش حالی کے زمانے میں شادی وغیرہ کے موقع پر دعوتیں دینا آسان تھا کیونکہ ان پر کچھ زیادہ خرچ نہ ہوتا تھا۔ جس طرح شہر والے اپنے دوستوں اور افسروں کو پارٹیاں دیتے ہیں اسی طرح گاؤں والے بھی کبھی کبھی پر مشقت زندگی کی اکتا دینے والی یکرنگی دور کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہو کر کھاتے پیتے تھے۔ اس وقت کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ وہ ملک جو قدرتی نعمتوں سے مالا مال ہے، جہاں کے زرخیز کھیتوں میں بہترین پیداوار ہوتی ہے، جہاں کے بیل تندرست اور طاقتور ہیں اور جہاں گھی اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں ایک دن ایسی افسوسناک حالت کو پہنچ جائے گا کہ اس کے بچے نیم برہنہ پھریں گے اور انھیں مشکل سے آدھے پیٹ کھانے کو ملے گا۔

پرانی عادتیں آسانی سے نہیں چھوٹتیں اس لئے اگر انسان ان کا شکار ہو جائے تو ہمیں

زیادہ سختی سے کام نہ لینا چاہیئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسے جلد از جلد پرانی عادتوں کو ترک کرنا چاہیئے اور خود کو نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرنا چاہیئے خواہ ایسا کرنے سے اس کی صحت اور درازی عمر کے اوسط پر (جو اس وقت بھی دوسرے ملکوں کے اوسط سے تقریباً نصف ہے) کتنا ہی بُرا اثر کیوں نہ پڑے۔

زندگی کے لئے سیر و تفریح بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کام۔ اگر آپ کسان کو اس تفریح سے محروم کریں تو کسی دوسری قسم کی تفریح کا سامان بہرحال مہیا کرنا ہوگا۔ اور کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ اس میں اور زیادہ خرچ ہو جس کی وجہ سے وہ بے چارہ ان سے بھی لطف نہ اٹھا سکے اور ہر قسم کی تفریح سے قطعی محروم ہو جائے۔

کسان کی کوتاہ اندیشی کے ثبوت میں اکثر یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ وہ زمین بہت مہنگی خریدتا ہے جس کی وجہ سے مقروض ہو جاتا ہے اور یہ قرض پھر آسانی سے ادا نہیں ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض صورتوں میں یہ بات صحیح ہو لیکن یہ اس کے افلاس یا قرضدار ہونے کا سبب نہیں ہے۔ جو لوگ اس پر ناعاقبت اندیشی کا الزام لگاتے ہیں وہ ان حالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی وجہ سے مجبور ہو کر اسے یہ صورت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے ملک کا قانون اس معاملہ میں نہایت ناقص اور جابرانہ ہے۔ ممالک متحدہ میں قانون شفع کی وجہ سے ایک کسان خود اپنی مزروعہ زمین بھی نہیں خرید سکتا۔ جبتک گانوں میں وہ کسی زمین کا مالک نہ ہو۔ گانوں کے شریک دار اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ ایک معمولی کسان گانوں میں زمین خرید کر ان کا ہمسر بن جائے، اس لئے بعض وقت صرف یہ عزت حاصل کرنے اور قانون شفع سے بچنے کی خاطر کسان کو غیر معمولی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہاں یہی چیز پیش نظر رہتی ہے کہ زمین کسان کی ملکیت ہو جائے۔ اس معاملہ میں قانون اور سماج سب کسان کی مدد کرتے

ہیں۔ زمینداروں سے زمین خریدنے کے لئے حکومت بڑی بڑی رقمیں کسانوں کو دیتی ہے اور پھر یہ رقم بہت معمولی سود (عموماً ۳ فی صدی) پر ساٹھ سال میں بڑی سہولت سے ان سے وصول کی جاتی ہے۔ وہاں اس قسم کے قانون موجود ہیں کہ اگر کوئی کسان زمین خریدنا چاہے تو درخواست دے کر عدالت کے ذریعہ سے خرید سکتا ہے، وہاں کی حکومت انھیں ہر طرح امداد دیتی ہے۔ خریدنے کے لئے قرض دیتی ہے، معاملہ کے متعلق مفت مشورہ دیتی ہے، زمین کی قسم وغیرہ بتلاتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اگر کسان کسی نہ کسی طرح زمین خریدنے کا انتظام بھی کرے تو اس کے راستے میں سینکڑوں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ زمین ہی اس کی معاش کا ذریعہ ہے اس لئے فطرتاً وہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر جب کبھی ایسا اتفاق پیش آتا ہے تو وہ نہیں چاہتا کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات اسے قرض لینا پڑتا ہے۔ اس لئے ہم اسے الزام نہیں دے سکتے بلکہ دراصل سماج اور قانون یہی دونوں اس کے ذمہ دار ہیں۔

زمین گراں خریدنے کی یہی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ ایک دوسری وجہ بھی ہے اور نہایت اہم ہے۔ کسان برسوں کے بعد کبھی خوشحال ہوتا ہے۔ اس وقت وہ کچھ رقم پس انداز کر لیتا ہے۔ اس کے سامنے زمین خریدنے کے علاوہ کسی دوسرے کام میں رقم لگا کر نفع حاصل کرنے کا اور کوئی مصرف ہی نہیں ہے اس لئے ہمیں کسان پر آنکھیں نہ نکالنا چاہئے اگر وہ اپنی پس انداز رقم زمین خریدنے میں لگا دے اور ایسی قیمت ادا کرنے کو تیار ہو جائے جو دوسروں کی نظروں میں صرف اس لئے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ حالات سے ناآشنا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ کساد بازاری کے زمانہ میں زمین کی قیمت بہت زیادہ گر گئی ہے لیکن غیر معمولی حالات سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک روپیہ لگانے کا محفوظ ترین

ذریعہ زمین رہی ہے اور اس کی قیمت برابر بڑھتی رہی ہے۔ چنانچہ جو کوئی زمین خریدنا چاہے اسے بڑھتی ہوئی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے لیکن جو لوگ حالات سے واقف نہیں ہیں ان کی نظر میں یہ چیز کوتاہ اندیشی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کسان ایک امید موہوم پر اس قدر فضول خرچی کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ کسان محض رقم لگانے کے لئے زمین نہیں خریدتا ہے بلکہ ضرورتاً ایسا کرتا ہے کیونکہ وہ کسی دوسرے کام میں رقم نہیں لگا سکتا اور لازمی طور پر اُسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ روپیہ خرچ ہو جائے گا اس لئے اگر مجبوراً وہ ذرا کوتاہ اندیشی سے کام لے تو قابل معافی ہے۔ اچھی فصل اور اچھے بھاؤ کے لالچ میں وہ زیادہ قیمت دے گذرتا ہے۔ چاہے ہم اسے کوتاہ اندیشی کہہ لیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم بھی ایسی صورت میں یہی کرتے۔ ہر جماعت میں فضول خرچ اور کوتاہ اندیش ہوتے ہیں تعلیم یافتہ حضرات بھی جن سے عاقبت اندیشی اور دور بینی کی توقع کی جاتی ہے اس بری عادت سے پاک نہیں ہیں اس لئے کوئی تعجب کی بات ہے اگر بعض کسانوں میں بھی فضول خرچی کی عادت موجود ہو۔ ہندوستانی کسان کو جن مخالف حالات میں زندگی بسر کرنا ہوتی ہے وہ اتنے سخت ہیں کہ اگر کسان ان کا عادی نہ ہو گیا ہوتا تو کب کا تباہ ہو جاتا۔ کوئی دوسرا شخص بہترین تعلیم و تربیت کے باوجود ان مشکلات میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یقین ہے کہ دوسرا شخص اپنی وسیع معلومات، تجربہ، تعلیم اور اقتصادیات کے مطالعہ کے باوجود ان حالات کا جن میں کسان اپنی ساری عمر گذارتا ہے تین برس بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے لیکن واقعات کی بنا پر ہم اس کی صحت کے قائل ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے لوگ جنھوں نے باقاعدہ زراعتی تعلیم پائی تھی اور جن کے پاس کافی سرمایہ اور بہت بڑا رقبہ موجود تھا چند سال بھی کامیابی سے زراعت

نہ کر سکے اور اسے چھوڑ چھاڑ کر کہیں ملازمت کر لی یا کوئی اور پیشہ اختیار کر لیا۔ ایسے افسروں کو بھی ہم نے دیکھا ہے جنھوں نے اپنی ساری عمر محکمہ زراعت میں صرف کی لیکن ریٹائر ہونے کے بعد انتہائی خواہش کے باوجود مشکلات کی وجہ سے کاشتکاری کی ہمت نہ پڑی اور کسی ریاست میں ملازمت کر لی یا کوئی اور کام کرنے لگے۔ البتہ بعض یورپین افسروں نے معمولی قیمت پر بڑے بڑے رقبے حاصل کرنے کے بعد چائے، قہوہ، ربڑ یا گنے کی کاشت شروع کی لیکن انھیں حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ بیچارے ہندوستانی کی داستان تو بالکل مختلف اور بڑی دردناک ہے۔

بہرحال یہ موقع اس بحث کا نہیں ہے۔ ہمارا یہ سوال بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں تعلیم یافتہ لوگ زراعت کیوں نہیں کرتے۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی گریجویٹ وکالت اور دوسرے پیشوں کو کاشتکاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ جواب بالکل صاف ہے یعنی اس سے نفع نہیں ہوتا بلکہ محنت اور رقم بھی ضائع جاتی ہے۔

ہمیں کامل یقین ہے کہ ہندوستانی کسان نہ صرف صبر و استقلال کا دھنی ہے بلکہ انتہائی کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا ہے۔ ان میں ایسے لوگ جو فضول خرچ اور کوتاہ اندیش کہے جا سکتے ہیں اتنے کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر۔ عموماً ہندوستانی کسان کفایت شعار ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی بدنصیب ہستی اب تک قائم ہے۔

۱۸۷۵ء میں دکن رعیت کمیشن نے کاشتکاروں کے قرضہ کے اسباب کی تحقیقات کی تھی۔ یہ کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ "شادی اور دوسری تقریبوں کے موقع پر کسانوں کی فضول خرچی کو ان کے قرضہ کے سلسلہ میں غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے"۔ ابھی ۱۹۳۷ء میں مختلف صوبہ جاتی حکومتوں نے ایک پراونشل بنکنگ انکوائری کمیٹی بنائی تھی جس نے کاشتکاروں کے قرضہ کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ اس کمیٹی کی اکثریت بھی اسی نتیجہ پر پہنچی کہ کسان کی فضول خرچی

اور کوتاہ اندیشی کے معاملہ میں بہت مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض ممبروں نے تو صاف صاف اس کی تردید کی۔ بنگال کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ[1] میں لکھا ہے کہ "مذہبی اور سماجی خرچوں کا ان کے قرضدار ہونے میں بہت کم ہاتھ ہے"۔ اسی طرح سنٹرل بنکنگ کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ[2] میں اس عام نظریہ کی تائید نہیں کی ہے کہ تقریبوں کے موقع کی فضول خرچی ان کے قرضدار ہونے کا خاص سبب ہے۔ مختلف صوبہ جاتی کمیٹیوں نے مقامی طور پر جو تحقیقات کی اس سے معلوم ہوگا کہ یہ محض خیالی تصویر ہے اور یہ الزام کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

کاش وہ تعلیم یافتہ حضرات جو عموماً اس قسم کے الزام لگایا کرتے ہیں ذرا سنجیدگی سے غور کریں اور خود بھی کفایت شعاری سے زندگی بسر کرنے کا کوئی نمونہ پیش کریں۔

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۹۷۔

[2] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۱۔

باب ششم

افلاس کا چھٹا فرضی سبب

کیا مہاجن کسانوں کے افلاس کا سبب ہے؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں شرح سود بہت زیادہ ہے اور کسان جو کچھ کماتا ہے وہ سود کی شکل میں مہاجن کی نذر ہو جاتا ہے اس لیے کسان کے افلاس کا یہی سبب بتایا جاتا ہے کہ وہ بہت زیادہ قرضدار رہتا ہے۔ قرضہ کے سرمایہ سے جس پر بے انتہا سود دینا پڑتا ہو کوئی تجارت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کسانوں کی جائداد برابر مہاجنوں کے ہاتھ میں پہنچ رہی ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ کسان بہت زیادہ مقروض ہیں اور شرح سود بھی بہت زیادہ ہے لیکن صرف اس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان کے افلاس کا یہی سبب ہے۔

اگر ہم اپنے یہاں کی بنک کی شرح کا دوسرے ملکوں کی بنک کی شرح سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور حکومت میں ہمیشہ ان میں آسمان زمین کا فرق رہا ہے۔ یہاں عموماً شرح بنک ۶ فی صدی رہی ہے حالانکہ دوسرے ملکوں میں ۳ فی صدی ہے۔ جنگ عظیم کی خوش حالی کے زمانے میں بھی شرح بنک ۵ فی صدی تھی۔ جرمنی میں جنگ کے بعد ہی یہ شرح ۳۰ فی صدی ہو گئی تھی لیکن چند ہی سال میں پھر ۲½ فی صدی ہو گئی۔ برطانیہ میں جس وقت طلائی معیار ترک کیا گیا اس وقت شرح بنک ۶ فی صدی تھی لیکن ۹ مہینے کے اندر اندر گورنمنٹ نے ایسا انتظام کیا کہ یہ شرح صرف ۲ فی صدی رہ گئی۔ گذشتہ ۳۵ سال میں اتنی کم شرح کبھی نہ ہوئی تھی۔ ۹ مہینے کے اس قلیل عرصہ میں برطانیہ کچھ زیادہ مالدار نہیں ہو گیا لیکن حکومت یہ محسوس کرتی تھی کہ جبتک

روپیہ آسانی سے نہ مل سکتا ہو اور شرح بنک کم نہ ہو صنعت و حرفت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اس چیز کا احساس نہیں ہے اور شرح بنک ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ یہاں سکہ اور شرح تبادلہ میں ہمیشہ ایسی ترکیبیں چلی جاتی ہیں جو سراسر ملک کے مفاد کے خلاف ہیں۔ اس طرح شرح بنک کو کبھی گرنے ہی نہیں دیا جاتا۔ جب ہندوستان میں شرح بنک کبھی ۶ فی صدی سے کم ہی نہیں ہوتی تو غریب آدمی کو کم شرح سود پر کیسے روپیہ مل سکتا ہے۔ غریب آدمی کوئی کفالت یا ضمانت تو دے نہیں سکتا اس لئے اسے مجبوراً زیادہ شرح سود پر روپیہ لینا پڑتا ہے۔ شرح سود کی زیادتی تو افلاس کا نتیجہ ہے۔ اس کا سبب نہیں ہے۔

مہاجنی میں شرح سود فقط لین دین کے عام اصول پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہاں تو روپیہ کے مارے جانے کا خیال ہوتا ہے۔ آج بھی اس کاشتکار کو جس کے پاس کافی وسائل ہوں ۶ فیصدی پر روپیہ مل سکتا ہے لیکن ممالک متحدہ میں کوآپریٹو سوسائٹیاں اپنے ممبروں سے ۵ فی صدی سود لیتی ہیں۔ ان سوسائٹیوں کو گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور ان کو ایسی خاص سہولتیں میسر ہیں جو کسی مہاجن کو نہیں ہو سکتیں لیکن اس تمام سرکاری حمایت کے باوجود وہ شرح سود کم نہیں کر سکی ہیں۔ روپیہ قرض دیتے وقت مہاجن کو سب سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا روپیہ مارا تو نہیں جائے گا۔ کیا کسی مہاجن سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے کاشتکار کو قرض دیدیگا جس نے بیل اُدھار خریدے ہیں، جس نے غیر معمولی لگان پر زمین لی ہے اور فصل پر لگان ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے، جس کے پاس مکان بھی رہن رکھنے کو نہیں اور صرف اس کی زبان اس کی تنہا ضمانت ہے۔ ایک انگریز مصنف نے ہندوستانی کسان کی ساری پونجی اس طرح بیان کی ہے:

"دو ایک ایکڑ بنجر زمین، دو لاغر بیل، آٹھ آنے والا ہل، ایک دودھ سے بھاگی ہوئی گائے اور دو روپیہ والی بکری، لے دے کے یہی اس کی پونجی ہے۔"

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں شرح سود زیادہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ افغانی پٹھان ان سے دو آنے روپیہ ماہوار تک لیتے ہیں۔ فصل تیار ہونے پر سب سے پہلے کسان کو لگان اور آبپاشی ادا کرنا ہوتی ہے۔ اگر فصل صرف اتنی ہی پیدا ہو کہ ان دونوں کی ادائگی میں ختم ہو جائے تو پھر مہاجن اپنا روپیہ وصول نہیں کر سکتا۔ موجودہ قانون کی رو سے تو مکان بھی کسان کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ زمیندار اس کا مالک ہوتا ہے۔ کسان نہ تو اسے رہن رکھ سکتا ہے نہ بیچ سکتا ہے اور نہ کرایہ یا پٹہ پر دے سکتا ہے۔ اس لئے قرضہ کی کفالت اس سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ اکثر صوبوں میں کسان کو اپنی زمین پر بھی کوئی حق نہیں ہوتا۔ نہ وہ اسے رہن رکھ سکتا ہے نہ بیچ سکتا ہے گویا فصل ہی ایک وہ ضمانت ہے جس پر مہاجن کو اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ پھر ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ضمانت کتنی کمزور اور غیر یقینی ہے۔ یہ قدرت کے کرشموں کے تابع ہے خشک سالی سے یہ برباد ہو سکتی ہے، کثرت بارش سے یہ تباہ ہو سکتی ہے ٹڈی یا کیڑے اسے خراب کر سکتے ہیں یا اور کوئی ناگہانی مصیبت اسے غارت کر سکتی ہے۔ محتاط سے محتاط اور ہوشیار سے ہوشیار کسان بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس کی آئندہ فصل کیسی ہوگی۔ ایسی حالت میں ہوشیار مہاجن کیسے اپنا روپیہ محفوظ سمجھ سکتا ہے۔ آجکل کی مادی دنیا میں مالی نفع و نقصان کے مقابلہ میں روحانی یا اخلاقی باتوں کا کون خیال کرتا ہے اس لئے یہ یقینی ہے کہ شرح سود کی زیادتی کسان کے افلاس کی وجہ سے ہے نہ کہ افلاس شرح سود کی زیادتی کی وجہ سے اور قرضہ کسان کے افلاس کا نتیجہ ہے سبب نہیں۔

اس کے علاوہ اور سبب بھی ہیں جن سے شرح سود بڑھ جاتی ہے۔ سب سے پہلی چیز روپیہ کی فوری ضرورت ہے۔ فرض کیجئے ایک بیل کی اُس وقت ضرورت پڑ گئی جبکہ ہل چل رہا ہے۔ اگر چند دن کی بھی دیر ہو جائے تو ساری فصل ضائع ہو جائے گی۔ جب بارش شروع ہوتی ہے

تو ہر کسان چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اپنے کھیت میں ہل چلا لے۔ اس وقت نہ تو اسے بیل کرایہ پر مل سکتے ہیں اور نہ وہ اپنے ساتھیوں سے امداد طلب کر سکتا ہے۔ اب اگر وہ مہاجن کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کی فوری ضرورت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ شرح سود طلب کرتا ہے۔ ایسے نازک موقع پر کسان مناسب شرائط طے کرنے کے لئے بحث نہیں کر سکتا۔ اسے اتنا موقع ہی نہیں ہوتا کہ وہ شرح سود کا حساب لگائے۔ اُسے تو اپنی فوری ضرورت پوری کرنے کی لو لگی ہوتی ہے۔ اگر ذرا سی دیر بھی ہو گئی تو گویا سال بھر کی فصل ضائع ہو گئی۔ یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب اسے بوائی کے لئے بیج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے افلاس کی وجہ سے وہ اپنی ضروریات کے لائق کافی مقدار میں بیج جمع نہیں کر سکتا اس لئے اکثر زیادہ شرح سود پر اسے اودھار ہی لینا پڑتا ہے۔ ایک اور ضرورت لگان کی ادائگی ہے۔ اگر لگان ٹھیک وقت پر ادا نہ ہو تو وہ اس زمین سے بیدخل کر دیا جائے گا جسے اس نے یا اس کے باپ دادا نے برسوں کی مسلسل کوشش کے بعد حاصل کیا تھا۔ زیادہ شرح سود کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پیداوار کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی محتاط ہو یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے اس فصل سے کتنا روپیہ ملے گا۔ کھڑی فصل کی پیداوار یا اس کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر جو فصل ابھی تیار بھی نہیں ہے اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گویا کاشتکاری کی ساری بنیاد امید موہوم پر قائم ہے۔ کسان کو سال میں دو مرتبہ آمدنی ہوتی ہے اور یہ زمانہ بھی بہت مختصر ہوتا ہے۔ سال کے باقی زمانہ میں وہ یا تو اسی آمدنی میں سے خرچ کرتا ہے یا پھر مہاجن سے لئے ہوئے قرض میں سے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زیادہ تر سرکاری ملازموں کی تنخواہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تعلیم یافتہ شخص جو ہر مہینہ مستقل تنخواہ پاتے ہیں اپنے اخراجات کا ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ دوسری تنخواہ ملنے تک سب خرچ پورے ہو جائیں تو پھر ایک کسان

ہے جس کی اوسط آمدنی فی کس سب سے کم ہے اور جسے سال میں ایک یا دو مرتبہ یک مشت روپیہ ملتا ہے کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس ترکیب سے خرچ کرے گا کہ اس کی تمام ضروریات وقت پر پوری ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ وہ پڑھا لکھا بھی نہیں ہوتا اور آمد و خرچ کا بجٹ نہیں بنا سکتا۔ جب کسی کے ہاتھ میں روپیہ ہوتا ہے تو خرچ کرنے کو جی چاہتا ہی ہے۔ کسان کی یہ کفایت شعاری کی عادت ہی تھی کہ اب تک اس نے پانی سر سے اونچا نہیں ہونے دیا۔ یہ تمام چیزیں اس کے اختیار سے باہر ہیں اور وہ قرضہ لینے پر مجبور رہے۔ یہ ایک ایسی نحوست ہے جس کا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اگرچہ اس سے اس کے افلاس میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے لیکن کسی طرح یہ اس کا سبب نہیں قرار دی جاسکتی۔

کچھ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ہر ملک میں اگر کسی شخص کے پاس کوئی ضمانت نہ ہو تو اس سے زیادہ سود لیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں کہ امریکہ جیسے امیر ملک میں ۵۰ فی صدی تک سود لیا جاتا ہے۔ چند سال ہوئے انگلستان میں بھی ۴۰ فی صدی قانونی شرح تھی۔ جہاں شرح بنک ۳ فی صدی سے کبھی نہیں بڑھتی وہاں عدالتیں ۴۰ فی صدی تک کی ڈگری دیتی ہیں۔ ایک غریب آدمی کو تو ہر جگہ اپنے غریب ہونے کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ وہ کسی ملک میں ہو اس کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور مادیت کے موجودہ دور میں ہر شخص اسے اپنے نفع کی خاطر نشانہ بناتا ہے۔

جو لوگ مہاجن کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے وہ اس چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ انگلستان وغیرہ میں حکومت بڑی بڑی رقمیں بلا سود یا معمولی سود پر تقسیم کرتی ہے۔ حال ہی میں انگلستان میں ایک کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کسانوں کو بلا سود قرض دیا گیا ہے جو ان سے ۶۰ سال میں وصول کیا جائے گا۔ اس کے

برعکس ہندوستان میں جب لوگ قحط کی وجہ سے فاقوں مرتے ہیں تو حکومت ۱۲ فی صدی پر روپیہ دیتی ہے اور کل زر اصل مع سود دو تین سال کے عرصہ میں وصول کر لیتی ہے۔ ناظرین اچھی طرح جانتے ہیں کہ تقاوی کسان کے لئے کیا بلا ہے؟ اسے کم ملتا ہے اور فوراً ادا کرنا پڑتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مہاجن کے سود سے زیادہ سود ہو جاتا ہے۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں شرح سود زیادہ ہونا ہی چاہئے کیونکہ یہاں تو حکومت خود ۶ فی صدی پر قرض لیتی ہے۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم مہاجن کے عیبوں کی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ زیادہ بہتر اور انسانیت کا برتاؤ کرے اور اتنا جابر اور لالچی نہ ہو۔ نہ ہمارا یہ خیال ہے کہ کسان کو کم شرح سود پر روپیہ بہم پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ تجارت جس میں کم نفع ہو کم ہی شرح سود کی رقم پر چل سکتی ہے۔ مہاجن صدیوں سے چلا آتا ہے اور آئندہ بھی فنا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ چاہیں تو اسے وہ قابل نفرت ہستی کہہ سکتے ہیں جس کے بغیر چارہ نہیں۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں کے جاری ہونے کے باوجود ممبران اس کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مہاجن اور اس کی زیادہ شرح سود کسانوں کے افلاس کا سبب نہیں ہیں بلکہ ان کے افلاس ہی کی وجہ سے مہاجن کو ایسے مذموم طریقوں پر اپنا کاروبار چلانے کی ہمت ہوتی ہے۔ غرضکہ کسانوں کا مقروض ہونا افلاس کا باعث نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہے۔

حصّہ دوم

تفتیش

تمہید

پُرانا اصول

ہندی کی ایک پرانی کہاوت ہے :-

اُتم کھیتی ، مدھیم بان + نکھد چاکری ، بھیک ندان

یعنی تمام پیشوں میں کاشتکاری سب سے اعلیٰ ہے ، اس کے بعد تجارت کا درجہ ہے ، نوکری سب سے خراب ہے البتہ بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اچھے زمانہ میں جب یہ کہاوت بنی ہوگی ہندوستانی سماج میں کاشتکاری کی بڑی عزت ہوگی لیکن آج بدقسمتی سے یہ پیشہ بہت ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے تاجر کا درجہ اب کسان سے بہت بلند ہے اور گاؤں کے ایک معمولی بنئے کو کسان کے مقابلہ میں زیادہ عزت حاصل ہے حالانکہ کسان ہی پر اس کی روزی کا انحصار ہے۔ اگر ہم کسی بڑے سے بڑے کاشتکار کا مقابلہ شہر کے کسی معمولی سے معمولی تاجر سے کریں تو اور زیادہ فرق معلوم ہوگا حالانکہ ہندوستانی تجارت کا تین چوتھائی حصہ ان چیزوں پر مشتمل ہے جو کسان پیدا کرتا ہے یا استعمال کرتا ہے لیکن اس غریب کو اس تجارت سے کوئی نفع نہیں پہنچتا اور شہر والوں کے مقابلہ میں اس کا معیار زندگی اتنا گرا ہوا ہے کہ آسمان زمین کا فرق نظر آتا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں ملازمت کا جنون انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص ملازمت کے فراق میں رہتا ہے اور وہ شخص تو خوش قسمت سمجھا جاتا ہے جسے سرکاری ملازمت مل جائے۔ سماج کا پرانا نظام درہم برہم ہوگیا ہے اور اس کی جگہ نئے نظام نے لے لی ہے۔ پندرہ روپیہ مہینہ کا ایک کلرک روپیہ روز یا اس سے بھی زیادہ کمانے والے مزدور سے

کیں بزنس سمجھا جاتا ہے۔ سرکاری آمدنی کا بیشتر حصہ ٹیکس یا محصول کی صورت میں کسان ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ لگان، کورٹ فیس، اسٹامپ، ریلوے، تار، ڈاک وغیرہ کے سلسلہ میں وہ سب سے زیادہ رقم ہندوستانی خزانہ میں داخل کرتا ہے لیکن جس سے حکومت کا سارا کاروبار چلتا ہے وہی افلاس کی زندگی بسر کرتا ہے اور فاقوں مرتا ہے۔ ان اعلیٰ افسروں کا کہنا ہی کیا جو اس کے پسینہ سے بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں لیکن دس روپیہ ماہوار پانے والے کانسٹبل یا عدالتوں کے چپراسی بھی کسان کے مقابلہ میں زیادہ آرام کی زندگی گذارتے ہیں اور زیادہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

ہندوستان خیر خیرات کے لئے بہت مشہور ہے۔ یہاں ایک بھیک مانگنے والے فقیر کو بھی کسان سے زیادہ آمدنی ہو جاتی ہے۔ فقیر کو نہ تو قدرتی حوادث کا ڈر ہوتا ہے اور نہ اپنی برادری یا حکومت کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔

یہ دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ ایک صدی کے اندر اندر کسان کے درجہ اور اس کی حالت میں اتنا انقلاب کیسے ہو گیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کاشتکاری سب سے بہتر اور معزز پیشہ ہے۔ سارے سماج میں کاشتکار ہی پر سب سے زیادہ محنت پڑتی ہے اور دراصل وہی صحیح معنوں میں دولت پیدا کرتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس شخص کے مقابلہ میں جو خوراک اور دوسری ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے وہ لوگ زیادہ آرام سے زندگی بسر کریں جو تجارت پیشہ ہیں یا کوئی دوسرا کام کرتے ہیں اور کسان کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرنے والے اور ان سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ وہ سماج خود مجرم اور قابل نفرت ہے جس میں ایماندار اور محنتی کسان کو کھانے اور پہننے تک کو نہ ملتا ہو اور وہ حکومت بھی اس الزام سے نہیں بچ سکتی جس کے ماتحت سماجی حالت اتنی خراب ہو گئی ہو۔

"برطانوی ہند میں دیہی حکومت" کے مصنف جان ٹھمپی کے الفاظ ملاحظہ ہوں "ہر حکومت کا سب سے اہم اور اولین فرض یہی ہے کہ وہ اس امر کی کوشش کرے کہ لوگ مریں نہیں زندہ رہ سکیں۔ بالآخر اسی معیار پر تاریخ تمام حکومتوں کو جانچے گی۔ اس لئے ذرا دیکھئے کہ ہندوستانی حکومت اس معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہے۔ پچھلی پون صدی میں یورپ کے تمام مہذب ملکوں نے لوکل گورنمنٹ کو بہتر بنا کر سائنٹفک معلومات کے ذریعہ سے اپنی تمام آبادی کی متوقع عمر کا اوسط دوگنا کر لیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ اوسط انگلستان کا قریب قریب نصف ہے[1]۔" "لوکل گورنمنٹ کی اصلاح اور ترقی سب سے بہتر کام ہے اور ہر قوم کو اپنی توجہ، کوشش اور پوری قوت اس پر صرف کرنا چاہیئے۔" اس کے بعد مصنف مذکور حیرت اور تعجب سے فرماتے ہیں کہ "یہ کتنا دردناک اور کیسا ناقابل تلافی نقصان ہے کہ ہندوستان میں بہت سی قیمتی جانیں ۵۰ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جاتی ہیں۔"

اس اہم تبدیلی کے اصلی و حقیقی اسباب معلوم کرنے کے لئے ہمیں پرانے زمانے کی دیہاتی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے ہم ان حالات کا صحیح نقشہ کھینچنا چاہتے ہیں تاکہ کسان کی پرانے زمانہ کی زندگی اور آجکل کی زندگی کا فرق نمایاں ہو جائے۔ ان دونوں کا مقابلہ کرنے ہی سے ہم تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور صحیح اسباب معلوم کر سکیں گے۔ اس تحقیقات کے بعد پھر ہم کسانوں کی بہتری اور بہبودی کے لئے مناسب علاج تجویز کرینگے۔

اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ قدیم زمانہ کی دیہاتی زندگی پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ آئندہ صفحات میں ہم نے قدیم دیہاتی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مشہور انگریز مصنفین کی

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۔

تحریروں کی بنیاد پر لکھا ہے۔ ان انگریزوں نے اس سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر سے تحقیقات کی ہے اسلئے ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ انھوں نے قدیم ہندوستانی دیہات کی حمایت میں جانبداری سے کام لیا ہوگا۔ ان کتابوں کو سرسری نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ کتابیں عرصہ ہوا جب لکھی گئی تھیں۔ اختصار کے خیال سے ہم نے طویل اقتباسات نہیں دئے ہیں اور مشرقی مصنفین کو محض اس لئے نظر انداز کر دیا ہے کہ ہمیں موجودہ حالات کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ اگر ہم نے سنسکرت اور فارسی کے مصنفین کے اقوال نقل نہیں کئے ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم انھیں جدید یورپین مصنفین کے مقابلہ میں غیر معتبر سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے ناظرین کو یہ بحث زیادہ دلچسپ نہ معلوم ہو لیکن درحقیقت یہ نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم نے بڑے بڑے ماہرین اقتصادیات کو یہ چیلنج دینے کی جرأت کی ہے کہ ہندوستانی کسانوں کے افلاس کے جو اسباب وہ سمجھتے ہیں وہ زیادہ تر غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ کسی پرانے نظریہ کی تردید کرنا اور نیا نظریہ قائم کرنا ہمیشہ سخت مشکل ہوتا ہے اس لئے ناظرین کو نہایت غور و احتیاط سے ان دلائل کو سمجھنا چاہئے۔

ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنا تھوڑا سا قیمتی وقت قدیم دیہات کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے میں ہمارے ساتھ ضرور صرف کریں۔ پھر اس کے بعد فیصلہ کریں کہ آیا ہماری تشخیص صحیح اور قابل قبول ہے یا نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آجکل کسان ہماری قوم کا وہ فرد ہے جس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اس لئے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کے معاملات سے دلچسپی لیتے ہوں۔ غیر دلچسپ باتوں سے عموماً ہم سطحی طور پر گذر جاتے ہیں اس لئے ہم ناظرین سے درخواست کریں گے کہ وہ اس معاملہ میں ذرا زیادہ غور و خوض سے کام لیں۔

باب اول

قدیم گاؤں

ہندوستان کے پرانے زمانہ کے اور آجکل کے دیہاتوں میں خاص فرق یہ ہے کہ پرانا گاؤں اپنے طور پر ایک مکمل حیثیت رکھتا تھا لیکن آج ایک گاؤں کسی دوسرے نظام کا جزو ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ پرانے زمانہ کے گاؤں کا دوسرے دیہاتوں قصبوں اور شہروں سے کوئی تعلق ہی نہ ہوتا تھا بلکہ یہ مطلب ہے کہ پرانے زمانہ میں ہندوستان میں جمہوریت کا زیادہ رواج تھا۔ ہر گاؤں اپنے طور پر ایک مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتا تھا اور اپنی ضروریات زندگی کے لئے بیرونی دنیا کا محتاج نہ تھا۔ وہ اپنی خوراک خود پیدا کرتا تھا اور جو اناج گاؤں کی ضرورت سے بچتا تھا وہ احتیاطاً قحط وغیرہ کے لئے کھلیانوں میں جمع کر دیا جاتا تھا۔ صرف اتنا ہی اناج باہر جاتا تھا جو سرکاری مطالبہ کی صورت میں دینا ضروری ہوتا تھا۔ پھر اس میں سے بھی زیادہ تر گاؤں ہی میں جمع رہتا تھا تاکہ حکومت کی ہدایت کے مطابق سرکاری ملازمین میں تقسیم کر دیا جائے۔ خوراک کے علاوہ روئی بھی ہر گاؤں میں پیدا ہوتی تھی۔ گھر کی عورتیں ہی اسے اوٹتی تھیں۔ اس کے بعد چرخہ پر سوت کاتتی تھیں۔ وہ چرخہ جو آج مشینوں اور فیکٹریوں کے دور میں بھی باقی ہے۔ پھر گاؤں کا جولاہا اس ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کا کپڑا بنتا تھا۔ گاؤں کا درزی یا پھر عورتیں ہی اس کے سیدھے سادے کپڑے سیتی تھیں۔ اگر رنگنے کی ضرورت ہوتی تو گاؤں کا رنگریز سوت یا کپڑا رنگ دیتا تھا۔ مانا کہ وہ کپڑا عام طور پر نہ اتنا اچھا ہوتا تھا نہ رنگ اور وضع کے لحاظ سے اتنا خوشنما جیسا آجکل بازار میں ملتا ہے لیکن لوگوں کی ضرورت

کے لئے نہایت کافی ہوتا تھا۔ بعض دیہاتوں میں اچھے اچھے کاتنے اور بننے والے ہوتے تھے۔ یہ لوگ امیروں کے لئے اچھے قسم کا کپڑا تیار کرتے تھے۔ یہ انسانی تاریخ کا وہ ابتدائی دور تھا جب یورپ میں لوگ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور کپڑے کی بجائے پتوں سے ستر پوشی کرتے تھے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں لوگ روئی کے پودے اور اس کی کاشت کے طریقہ سے بالکل ناواقف تھے بلکہ اس کا نام بھی نہ جانتے تھے۔ کاتنا اور بننا تو اس کے ایک عرصہ بعد انھوں نے سیکھا۔ آج دوسرے ملکوں کے کپڑے سے ہندوستانی بازار بھرا پڑا ہے۔ اس زمانہ میں یہی ملک ہندوستان سے طرح طرح کا کپڑا بڑی بڑی قیمتوں پر خریدتے تھے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ وقت بچانے والے اوزار اور بھاپ سے چلنے والی مشینیں ایجاد ہو چکی تھیں۔ ان کا تیار کیا ہوا کپڑا نہ تو ہندوستانی کپڑے سے بہتر ہوتا تھا اور نہ سستا پڑتا تھا۔ اس لئے ہندوستانی کپڑا اسی کثرت سے باہر جاتا رہا جیسا ان ایجادات سے پہلے جاتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کی حکومت نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کے ساتھ کپڑے کی اس آزادانہ تجارت سے ملک کی ساری دولت کھنچی چلی جا رہی ہے۔ اس لئے جب وہ اس تجارت کو جائز طریقوں سے نہ روک سکے تو درآمد پر زبردست محصول لگا دیا۔ آج جو لوگ سودیشی کے پرچار اور بدیشی کے بائیکاٹ کی تحریکوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں لیکن شاید ایک جگہ جو چیز مناسب ہے دوسری جگہ وہی چیز نامناسب سمجھی جاتی ہے۔

پرانے زمانہ میں ہر گاؤں کے مقررہ حدود ہوتے تھے اور تمام زمین گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔ ذاتی جائداد کا طریقہ نہ تھا۔ بزرگ ہر خاندان کی ضروریات کے مطابق ان میں زمین تقسیم کر دیتے تھے۔ زمینداری کا طریقہ کوئی جانتا بھی نہ تھا اور حق کاشت تسلیم نہ کیا

جاتا تھا۔ زمین سب گاؤں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی اور وقتاً فوقتاً یا فوری ضرورت پڑنے پر گاؤں والوں میں از سر نو تقسیم کی جاتی تھی۔ چراگاہ کے لئے بڑے بڑے رقبے چھوڑ دئے جاتے تھے اور اعلیٰ نسل کے دودھ دینے والے مویشی موجود تھے۔ دودھ اور دودھ سے بنی ہوئی چیزیں بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور بیماروں کے لئے افراط سے ملتی تھیں۔ بناسپتی گھی، ڈبے کا دودھ یا اسی قسم کی دوسری چیزیں باہر سے نہیں آتی تھیں نہ دودھ دینے والے مویشی شہروں میں فروخت کئے جاتے تھے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی کی جائے یا دودھ دینے کے ایک دور کے بعد ان کو ذبح کر ڈالا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں مویشیوں کی تجارت میں اتنی سہولتیں نہ تھیں لیکن ساتھ ہی لوگ اس کے سخت خلاف بھی تھے اور برائے عامہ کو ٹھکرانے کی کوئی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ سارا گاؤں اس شخص سے سخت نفرت کرتا تھا جو اچھی نسل کو تباہ کرنے کا باعث سمجھا جاتا۔ کھلیان ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔ قدرت کی عنایتوں کی اتنی فراوانی تھی کہ شاید ہی کوئی زمین تین سال میں ایک دفعہ سے زیادہ بوئی جاتی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت قحط کے موقع پر اناج اس آسانی سے دور دور سے نہیں آسکتا تھا لیکن آجکل کے سے قحط بھی اس زمانہ میں نہ پڑتے تھے اور ہر گاؤں میں اناج کا اتنا کافی ذخیرہ موجود رہتا تھا کہ ضرورت کے وقت کئی سال مصیبت کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ پیداوار کا ایک مقررہ حصہ حاکم کو دیا جاتا تھا۔ ان زمینوں پر جو مندروں، تعلیمی اداروں یا گاؤں کے کارکنوں کے لئے وقف کر دی جاتی تھیں ٹیکس معاف تھا۔ اسی طرح چراگاہوں اور چوپالوں پر ٹیکس نہ لیا جاتا تھا کیونکہ ان میں کوئی باقاعدہ فصل پیدا نہ ہوتی تھی۔

گاؤں کی ضروریات

گاؤں کی دوسری ضرورتیں بھی بڑی سادہ ہوتی تھیں اور وہ مقامی طور پر پوری ہو جاتی

تھیں۔ کمہار گاؤں کے کھیت سے مٹی لیتا تھا اور اپنے چاک پر برتن بناتا تھا۔ پھر اس ایندھن سے جو بکثرت موجود تھا انھیں پکاتا تھا اور گاؤں والوں کو مفت دیتا تھا کیونکہ وہ بھی گاؤں کا ایک فرد تھا۔ اس کی اور اس کے خاندان کی پرورش کے لائق فصل کے موقع پر جنس کی صورت میں اسے مزدوری مل جاتی تھی۔ چمار مردہ جانوروں کی کھال سے چمڑا تیار کرتا تھا اور لوگوں کے لئے جوتے وغیرہ بناتا تھا۔ دھوبی اپنے طور پر گاؤں والوں کی خدمت انجام دیتا تھا۔ تیلی کولھو میں تیل نکالتا تھا اور جلانے اور کھانے کے لئے لوگوں کو دیتا تھا۔ کھلی مویشیوں کے کام آتی تھی۔ بڑھئی اور لوہار زراعت کے اوزار تیار کرتے تھے اور ان کی مرمت کرتے تھے۔ اس طرح گویا ہر گاؤں بیرونی دنیا سے بے نیاز تھا۔ گاؤں کے ان مختلف پیشہ وروں کو کوئی مقررہ مزدوری نہ ملتی تھی بلکہ کسان اپنی ضروریات اور ان کی محنت کا لحاظ کر کے فصل کے موقع پر ان کو جنس دیا کرتے تھے۔ بعض دیہاتوں میں یہ لوگ مشترکہ ملکیت سمجھے جاتے تھے اس لئے مشترکہ ذخیرہ سے ان کو جنس دی جاتی تھی۔

یہ درست ہے کہ اس زمانہ میں نفیس اور خوشنما چیزیں رائج نہ تھیں نہ عام طور پر تیار ہوتی تھیں تاہم مقامی ضرورتیں آسانی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ صرف امیر لوگ ریشمی اور اونی کپڑے استعمال کرتے تھے اور یہ سامان خاص خاص مقامات پر ہوشیار کاریگر تیار کیا کرتے تھے۔

لوہے یا اور دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی چیزیں اور نمک مسالے وغیرہ جو ہر گاؤں میں پیدا نہیں ہوتے تھے ہاٹ بازار کے موقع پر مختلف مقامات سے آجاتے تھے اور تبادلہ کا طریقہ اس زمانہ میں رائج تھا اس لئے جنس کے عوض میں ہر چیز مل جاتی تھی۔ گویا گاؤں والوں کی ضرورت کی ہر چیز یا تو خود اپنے گاؤں میں یا قرب وجوار کے کسی گاؤں کی ہاٹ بازار میں آسانی سے مہیا ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں میں رواداری کا جذبہ موجود تھا اور جب کبھی کوئی

اتفاقی ضرورت پڑتی تو سارا گاؤں ہم آواز ہو کر مشترکہ مصیبت یا بیرونی مداخلت کے مقابلہ میں کھڑا ہو جاتا۔ غرضکہ سارا گاؤں خوش تھا اور اپنی غربت گزینی پر مطمئن۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ فاقہ کشی کیا بلا ہے۔

باب دوم

دیہی نظام

قدیم زمانہ کے دیہی نظام کے سلسلہ میں باہر والوں کو اس چیز پر سب سے زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب انسانی دماغ اتنا ترقی یافتہ نہ تھا ہندوستان کے سیدھے سادے گاؤں والے اپنے گاؤں کی اس طرح تنظیم کرتے تھے کہ دیوانی، فوجداری، مالی، سماجی اور مذہبی ہر قسم کے جھگڑے آپس میں طے ہو جاتے تھے۔ انھیں نہ تو وکیلوں کی امداد کی ضرورت تھی اور نہ آجکل کی سی بالاخرچ عدالتوں کی۔ اس نظام کی سادگی اور تکمیل یقیناً حیرت انگیز ہے جس میں نہ تو کورٹ فیس اور اسٹامپ وصول کیا جاتا تھا اور نہ کوئی خاص قواعد وضوابط تھے لیکن پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل نہایت آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔ دیہاتی نظام کا بنیادی اصول اور اس کی کامیابی کا خاص سبب یہ خوشگوار طریقہ تھا کہ لوگ حقوق کے مقابلہ میں فرائض کا زیادہ خیال کرتے تھے۔

کتاب موسومہ "برطانوی ہند میں دیہی حکومت" میں بالکل صحیح لکھا ہے[1] کہ "انگلستان کی پرانی جاگیروں کی طرح ہندوستانی گاؤں میں بھی حقوق کے مقابلہ میں فرائض پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ تمام سرگرمیوں کو محض حقوق تک محدود نہیں رکھا جاتا کہ لوگ اس کی آڑ میں ذاتی نفع حاصل کریں بلکہ زیادہ تر فرائض کے پورا کرانے پر توجہ کی جاتی ہے۔" اگر یہ اعلیٰ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲

مقصد ہندوستانی اپنے سامنے رکھتے تو ہماری موجودہ مشکلات کم از کم آدھی رہ جاتیں اور ذاتی وانفرادی نفع کی خاطر قومی مفاد کو قربان کرنے کا جو افسوس ناک منظر آئے دن ہمارے سامنے آتا رہتا ہے وہ ہماری خوشگوار سماجی زندگی کو اس طرح برباد نہ کرتا۔

گاؤں کے اہلکار

اسی کتاب میں[1] قدیم گاؤں کے اہلکاروں، پیشہ وروں اور تاجروں کا اس طرح تذکرہ کیا گیا ہے "گاؤں کے اہلکار، پیشہ ور اور تاجر جن پر اندرونی نظام کی بنیاد قائم ہے ہر جگہ اب بھی نمایاں طور پر موجود ہیں"۔ دارالعوام کی منتخب کمیٹی نے ۱۸۱۲ء میں ایک رپورٹ شائع کی تھی جو پانچویں رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں مدراسی گاؤں میں جو اہلکار ہوتے تھے ان کی حسب ذیل فہرست اس رپورٹ میں درج ہے:-

۱۔ مکھیا: یہ گاؤں کے تمام معاملات کی عام نگرانی کرتا ہے۔ جھگڑے طے کرتا ہے۔ پولیس کی امداد کرتا ہے اور اپنے گاؤں کی مالگذاری جمع کرتا ہے۔

۲۔ پٹواری: یہ کاشت کے حسابات کرتا ہے اور تمام اندراجات مکمل رکھتا ہے۔

۳۔ چوکیدار: ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو جرائم کی نگرانی رکھتا ہے اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے والے مسافروں کی حفاظت کرتا ہے اور دوسرے کا کام گاؤں کے اندر ہی محدود رہتا ہے مثلاً فصلوں کی نگرانی یا پیمائش وغیرہ میں امداد دینا۔

۴۔ نگران حدود: یہ گاؤں کے حدود صحیح رکھتا ہے اور تنازعہ کے وقت اسی سلسلہ میں

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۔

شہادت دیتا ہے۔

۵۔ نگران آبپاشی: یہ تالابوں یا ندیوں سے آبپاشی کے لئے پانی تقسیم کرتا ہے۔

۶۔ پروہت: یہ مذہبی رسوم ادا کرتا ہے اور پوجا پاٹ کرتا ہے۔

۷۔ مدرس: یہ کھلے میدان میں زمین کے فرش پر بیٹھ کر بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔

۸۔ جوتشی: یہ بونے اور کاٹنے کی شبھ گھڑی بتاتا ہے۔

۹۔ لوہار اور بڑھئی: یہ زراعت کے اوزار اور لوگوں کے مکان بناتا ہے۔

۱۰۔ کمہار

۱۱۔ دھوبی

۱۲۔ نائی

۱۳۔ گڈریا

۱۴۔ وید

۱۵۔ گویا اور کبت

۱۶۔ رقاصہ

ان میں سے چوکیدار، مکھیا اور پٹواری خاص اہلکار ہوتے تھے۔ مکھیا گویا دیہی حکومت کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ چوکیدار اس کا خاص ملازم ہوتا تھا اور پٹواری گاؤں کے کاغذات مرتب کرنے اور دوسرے حسابی کاموں میں اس کی مدد کرتا تھا۔ ہر گاؤں میں ایک پنچایت ہوتی تھی جس میں ملک کے خادم کی حیثیت سے یہ تینوں اہلکار بھی شریک ہوتے تھے۔

مکھیا اور اس کا تقرر

مکھیا کا عہدہ ایک عزت کی جگہ سمجھی جاتی تھی اور گاؤں والے اسی کو مکھیا بناتے تھے

جس کی سب لوگ عزت کرتے تھے۔ یہ کوئی تنخواہ دار آسامی نہ تھی۔ سارے گاؤں والے مل کر کسی کو مکھیا بناتے تھے اور جب اس پر اعتماد نہ رہتا تھا تو دوسرا شخص منتخب کر لیتے تھے۔ یہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی کہ جائز اور ناجائز طریقوں سے اس کے لئے ووٹ حاصل کئے جاتے۔ گویا یہ سب سے بڑا عہدہ دار کثرت رائے سے نہیں بلکہ اتفاق رائے سے منتخب ہوتا تھا۔ نہ تو کسی بیرونی افسر کی ضرورت پڑتی تھی کہ انتخاب کی کارروائی کی نگرانی کرے اور نہ دو مخالف گروہ روپیہ یا آدمیوں کی تعداد کی بنا پر زور آزمائی کرتے تھے۔ گاؤں والے اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس اعلیٰ عہدے کے لئے کس کو منتخب کرنا ہے۔ اس عہدے کے حاصل کرنے کے لئے نہ تو سب انسپکٹر پولیس کی سفارش یا مجسٹریٹ کے حکم کی ضرورت تھی اور نہ یہی ضروری تھا کہ اعلیٰ افسروں کی خوشامد کی جائے۔ مکھیا کی غیر جانبداری شک و شبہ سے بالاتر تھی اور صرف اس کے چال چلن کی خوبی اس کے انتخاب کا معیار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر موقع پر اور ہر حالت میں راست باز رہتا تھا۔ اس کے فرائض بھی بہت وسیع تھے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کا تو وہ خود فیصلہ کر دیتا تھا لیکن اہم معاملات میں وہ گاؤں کے بزرگوں کی پنچایت کرتا تھا اور یہ لوگ فریقین کے بیان سننے کے بعد فیصلہ کرتے تھے۔ مکھیا کو کہیں مخبری کرنا نہ ہوتی تھی اور اس کا دائرۂ عمل صرف اندرونی معاملات تک محدود ہوتا تھا۔

چوکیدار

چوکیدار گاؤں کا تنخواہ دار ملازم ہوتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ اگر کوئی جرائم پیشہ اتفاق سے گاؤں میں آ جائے تو برابر اس کی نگرانی رکھے۔ اگر گاؤں میں کوئی چوری ہو جاتی تو وہی اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا اور اسی کو نقصان پورا کرنا پڑتا تھا۔ وہ مکھیا کے احکام کی تعمیل کرتا تھا اور جب کبھی مکھیا حکم دیتا تو وہ پنچایت جمع کرتا۔ ان خدمات کے عوض میں اسے کاشت کے لئے

بغیر لگان کی کچھ زمین دی جاتی تھی۔ مشترکہ فنڈ سے کچھ نقد دیا جاتا تھا اور فصل کے موقع پر جنس بھی دی جاتی تھی

پٹواری

پٹواری گاؤں کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ وہ زیر کاشت زمینوں اور کاشتکاروں کے ناموں وغیرہ کے اندراجات کرتا تھا۔ مشترکہ فنڈ کا بھی حساب رکھتا تھا اور حاکم کو جو محصول اور لگان ادا کرنے ہوتے تھے ان کا حساب بھی رکھتا تھا۔ اس کو بھی کاشت کے لئے کچھ زمین اور فصل پر کچھ جنس دی جاتی تھی۔

یہ اہلکار صحیح معنوں میں گاؤں کے خادم ہوتے تھے۔ گاؤں والے خود ان کا تقرر کرتے تھے اس لئے لازمی طور پر وہ نہایت وفاداری سے ان لوگوں کی خدمت کرتے تھے جو انھیں تنخواہ دیتے تھے۔ وہ پبلک کے خادم تھے۔ پبلک ان کا تقرر کرتی تھی۔ پبلک ہی انھیں تنخواہ دیتی تھی اس لئے وہ بھی پبلک کی نہایت وفاداری سے خدمت کرتے تھے۔

پنچایت

گاؤں کی پنچایت مختلف کمیٹیوں کے ذریعہ سے اپنے فرائض انجام دیتی تھی لیکن آج اس کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ البتہ ضلع چنگلپور کے ایک گاؤں میں ایک مندر سے دو کتبے برآمد ہوئے ہیں جن میں چھ کمیٹیوں کا تذکرہ ہے یعنی (۱) سالانہ کمیٹی (۲) باغات کمیٹی (۳) تالاب کمیٹی (۴) سونا کمیٹی (۵) انصاف کمیٹی اور (۶) پنجواڑہ۔ آخری کمیٹی کے دو

لہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰ Archaeological Survey of India Calcutta 1904-05.

مفہوم سمجھے جاتے ہیں یعنی یا تو یہ عام نگرانی کی سب کمیٹی تھی اور یا خاص محاصل جمع کرنا اس کے سپرد تھا۔ ایک دوسرے ضلع میں ایک اور کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا کمیٹیوں سے مختلف پانچ کمیٹیاں ہوتی تھیں۔ ممکن ہے اس کے لئے کوئی خاص قواعد وضوابط نہ ہوں اور مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے کمیٹیوں کی تعداد اور ان کا ضابطہ ترتیب دیا جاتا ہو۔ ان کمیٹیوں کے ممبروں کا انتخاب عموماً گاؤں کے عام جلسہ میں ہوتا تھا جس میں بوڑھے اور جوان سب شریک ہوتے تھے۔ گویا ہر بالغ شخص کو رائے دینے کا حق تھا۔ یہ سارا نظام خالص جمہوری اصولوں پر مبنی تھا اور حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب تھا۔ ممکن ہے اس کام کے لئے جو طریقے اور جو صورتیں وہ لوگ اختیار کرتے تھے وہ اتنی صاف اور صریح نہ ہوں جیسی آجکل ہیں لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ان کے دستور عمل میں انتخاب اور جمہوریت کا اصول پوری طرح کارفرما تھا۔ انتخاب کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ تھا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حکومت اور جمہوریت کے موجودہ اصولوں سے قدیم ہندوستان کے گاؤں والے ناواقف نہ تھے اس کی تھوڑی سی تشریح بے موقع نہ ہوگی۔

"برطانوی ہند میں دیہی حکومت"[1] میں انتخاب کا طریقہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

"ہر گاؤں میں بارہ محلے اور تیس حلقے ہوتے تھے۔ ان حلقوں کا ہر باشندہ ایک پرچہ پر ایک نام لکھتا تھا۔ ہر حلقہ کے پرچے علیحدہ علیحدہ باندھ دیے جاتے تھے اور ہر بنڈل پر حلقہ کا نام لکھ دیا جاتا تھا۔ پھر ان بنڈلوں کو جمع کرکے ایک برتن میں رکھ کر گاؤں کے عام جلسے کے سامنے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷۔

رکھا جاتا تھا جس میں بوڑھے اور جوان سب شریک ہوتے تھے۔ اس کے بعد سب سے بزرگ پنڈت اٹھتا تھا اور اس برتن کو سب کے سامنے ہاتھ میں لے کر کسی بچہ کو بلاتا تھا۔ بچہ اس برتن میں سے ایک بنڈل اٹھا لیتا تھا۔ پھر اس بنڈل کے پرچے کھول کر خوب اچھی طرح ملا کر ایک دوسرے برتن میں رکھے جاتے تھے۔ بچہ پھر اس میں سے ایک پرچہ اٹھا لیتا تھا اور اس شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیتا تھا جسے ثالث کہتے تھے۔ یہ ثالث پرچہ کا نام پڑھتا تھا اور سب پنڈت بآواز بلند اس نام کا اعلان کرتے تھے۔ اسی طرح تیسوں حلقوں سے ۳۰ شخص چنے جاتے تھے۔ ان ۳۰ میں سے ۱۲ کی سالانہ کمیٹی بنتی تھی۔ ۱۲ کی باغات کمیٹی اور ۶ کی تالاب کمیٹی۔ انصاف کمیٹی غالباً کوئی جداگانہ کمیٹی نہ تھی۔ سونا کمیٹی اور پنچواڑہ کے لئے پھر اسی طرح انتخاب ہوتا تھا یعنی ۳۰ نام منتخب کر کے ان میں سے ۸ نکال دئے جاتے تھے۔ باقی بارہ کو برابر برابر دو کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ تیس ناموں میں سے اخراج یا کمیٹیوں کے انتخاب کے طریقہ کے لئے کتبہ میں نامل زبان کا جملہ "کراکنی" استعمال کیا گیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کتبہ جات اس کے معنی "زبانی اظہار رائے" بیان کرتے ہیں۔

پنچوں کی اہلیت

ہر شخص ان کمیٹیوں کا ممبر منتخب نہیں ہو سکتا تھا بلکہ صرف وہی لوگ منتخب کئے جاتے تھے جو حسب قاعدہ اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ مرد، عورت سب اس کمیٹی کے ممبر ہو سکتے تھے۔[1] ممبری کے لئے جو شرائط مقرر تھیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بہترین شخص منتخب کرنے کی امکانی کوشش کی جاتی تھی۔ ذیل میں ہم ان کمیٹیوں کی ممبری کے شرائط درج کرتے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۔ Madras Epigraphy Counsil Report 1909-10

تاکہ ناظرین پر یہ واضح ہو جائے کہ انتخاب کا نظام کتنا مکمل تھا:۔

(۱) وہ چوتھائی گاؤں کے برابر لگانی زمین کا مالک ہو۔

(۲) اپنی ہی زمین میں بنے ہوئے اپنے مکان میں رہتا ہو۔

(۳) عمر ۳۵ سے کم اور ۷۰ سے زیادہ نہ ہو۔

(۴) منتروں اور برہمنوں[1] کا عالم ہو (خاص خاص متبرک کتابوں کا علم پہلی دو شرطوں کی کمی کو پورا کر سکتا تھا)

(۵) تجارت سے بھی واقفیت ہو۔

(۶) نیک اور پرہیزگار ہو اور اس کی کمائی دیانتداری پر مبنی ہو۔

(۷) پچھلے تین سال میں وہ کسی کمیٹی کا ممبر نہ رہا ہو۔

(۸) اگر کوئی شخص پہلے کبھی ممبر ہوا لیکن اس نے اپنے حسابات ٹھیک اور صاف نہ رکھے تو وہ اور اس کے تمام رشتہ دار ممبر نہیں ہو سکتے تھے۔

(۹) وہ لوگ بھی جنھوں نے کوئی اہم قصور کیا ہو ممبر نہیں ہو سکتے تھے۔

پنچایت کا فیصلہ

فی الحال ان کمیٹیوں کے طریقہ کار کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کمیٹیوں کا گاؤں کے تمام معاملات سے تعلق تھا۔ گویا اس چھوٹی سی جمہوریت کے تمام ضروری انتظامات ان کے سپرد تھے۔ مختلف معاملات کا تصفیہ یا تو یہی کمیٹیاں کرتی تھیں یا پھر پنچایت طلب کی جاتی تھی۔ بہت پیچیدہ اور اہم مسائل میں بھیا گاؤں کے بزرگوں

---

[1] برہمن ان مقدس کتابوں کا نام ہے جن میں ویدوں کی تفسیر کی گئی ہے۔

کو مشورے کے لئے جمع کرتا تھا اور ان کے مشورے ہی کے مطابق فیصلہ کرتا تھا۔ فیصلہ آجکل کی طرح اکثریت سے نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ صورت ہوتی تھی کہ "بات چیت اور بحث کے دوران میں زیادہ با اثر اور عقلمند لوگوں کی رائے رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ پر چھا جاتی تھی اور سب لوگ خود بخود اس کو تسلیم کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ فیصلہ اتفاق رائے سے ہوتا تھا یعنی زیادہ قوی حاوی ہو جاتا تھا اور کمزور اسے قبول کر لیتا تھا۔ اکثریت کے بجائے اتفاق رائے سے فیصلہ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور عموماً یہ چیز حاصل ہو جاتی تھی"۔ سر ہربرٹ رسلے نے ایک جگہ اس چیز کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "پنچایت کے انتخاب کا طریقہ یورپ کی سیاسی اصطلاحات میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور بات چیت کرنا شروع کرتے ہیں۔ بالآخر اسی گفتگو کے درمیان میں ایک رائے ایسی ظاہر ہوتی ہے جسے سب تسلیم کر لیتے ہیں پھر اکثریت کہاں کیونکہ وہ سب تو متفق الرائے ہوتے ہیں اور اقلیت کا کیا ذکر کیونکہ وہ تو باتوں ہی میں ختم ہو گئی اور اکثریت کی ہم خیال ہو گئی۔ اس طریقہ کو ہم زیادہ سے زیادہ "انتخاب بذریعہ تحسین عام" کی اصطلاح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جرمنی اور یونان کے ابتدائی دور کی عام جماعتیں بھی اسی طرح منتخب کی جاتی تھیں اور دراصل یہی دنیا کا سب سے پرانا طریقہ انتخاب ہے"[1]۔

اس زمانہ میں نہ تو جیل خانے تھے اور نہ پنچایت کے احکام اور فیصلوں کی تعمیل کرانے کے لئے کسی بڑے بھاری عملے کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑی سزا یہ تھی کہ سارا گاؤں عام طور پر نفرین کرے۔ جو شخص گاؤں کا حکم نہ مانتا تھا اور اس طرح گاؤں کی رائے عامہ کی ہتک کرتا تھا

---

[1] ماخوذ ہو تقریر بنگال لیجسلیٹو کونسل ۲۳ جولائی ۱۸۹۲ء

اسے گاؤں کا دشمن سمجھا جاتا تھا اور اکثر مذہبی رسوم میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جاتی تھی گویا ایک طرح سے وہ برادری باہر کر دیا جاتا تھا۔ مجرم کو ہر ہر قدم پر ذہنی کوفت اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوتا تھا اور اسے بدترین قسم کا گناہگار سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کے انتہائی تدارک کی ضرورت نہ پڑتی تھی اور ضدی سے ضدی شخص بھی چند ہی روز میں ٹھیک ہو جاتا تھا اور گاؤں کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔ فرائض کا احساس اور رائے عامہ کا لحاظ اتنا زیادہ تھا کہ خود رائی کا نام بھی نہ تھا اور پنچایت کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کی جاتی تھی۔

بعض مشہور و معروف مصنفین نے لکھا ہے کہ ان پنچایتوں کا دائرۂ عمل صرف مذہب یا برادری کے جھگڑوں تک محدود تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یہ پنچایتیں ہر قسم کے قضیے طے کیا کرتی تھیں خواہ وہ مذہبی ہوتے یا سیاسی، تمدنی ہوتے یا معاشرتی، مالی ہوتے یا فوجداری۔ "برطانوی ہند میں دیہی حکومت" کے مصنف نے نہایت تفصیل سے ان معاملوں کو لکھا ہے جن کا یہ پنچایتیں تصفیہ کیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ آجکل کی عدالتوں کی طرح ان کا یہ طریقہ نہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کام ختم کر دیا جائے۔ ہر پنچایت اپنا یہ فرض سمجھتی تھی کہ فریقین کے مطالبات کو انصاف کے ساتھ پورا کر کے ان میں صلح کرا دے۔ اس طرح وہ دونوں فریق کو مطمئن کر دیتے تھے۔ پھر اس کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی کہ ایک یا دوسرے فریق کے مقابلہ میں فیصلہ دیا جائے اور ضابطہ کے مطابق اس فیصلہ پر عمل کرایا جائے۔

برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں مقدمات پنچایت کے سپرد کرنے کا طریقہ عام طور پر رائج تھا۔ پنچایتوں کا فیصلہ بالکل آخری سمجھا جاتا تھا اور اس کی کوئی اپیل بھی نہ ہو سکتی تھی۔ جنوبی بنگال کی عدالت ہائے فوجداری کی ۱۸۵۱ء کی رپورٹ میں درج ہے کہ "آج ۱۸۵۱ء

میں[۵۱] بھی ضلع دیناج پور میں پرانے زمانے کے پنچایتی نظام کے آثار موجود ہیں اور بہت کافی تعداد میں مقدمات اس کی معرفت طے کرائے جاتے ہیں۔" چھوٹا ناگپور کے ایک آنریری مجسٹریٹ ڈاکٹر انڈریوز کیمبل نے ۱۹۰۸ء میں ڈی سنٹرلائزیشن کمیٹی کے سامنے اپنی شہادت میں فرمایا تھا کہ "میں خود پنچایتوں سے بہت زیادہ کام لیتا ہوں۔ جن مقدمات میں مفاہمت ہو سکتی ہے ان میں فریقین کو میں مشورہ دیتا ہوں کہ معاملہ پنچایت کے سامنے رکھ دیں۔ پنچ میری عدالت کے باہر جمع ہو جاتے ہیں اور ایسی خوبی سے معاملہ طے کر دیتے ہیں کہ میں خود بھی نہ کر سکتا۔" شمالی مغربی صوبہ میں ۱۸۹۲ء میں ایک خاص افسر پنچایتوں کے متعلق تحقیقات کرنے کی غرض سے مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ "گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے سامنے معاملات پیش کرنے کا رواج اب بھی باقی ہے اور اس پر عمل درآمد بھی ہوتا ہے۔ لیکن بعض جگہ کم ہے اور بعض جگہ زیادہ مثلاً اودھ اور مشرقی ممالک میں سب سے کم ہے اور مغربی ممالک میں بہت زیادہ ہے[۵۲]۔ برما کے چیف کمشنر نے ۱۸۸۷ء میں کہا تھا کہ "گاؤں کے بزرگوں کے سامنے اپنے معاملات پیش کرنے کا رواج لوگوں کی فطرت میں داخل ہے اور جدید ضابطہ اور قانون نافذ ہو جانے کے باوجود بھی کثرت سے رائج ہے[۵۳]۔" صوبہ بمبئی کے متعلق الفنسٹن نے ۱۸۲۱ء میں لکھا ہے کہ "معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں پنچایت ہی کو ذریعہ بنانا چاہیے اور ہماری طرف سے اس میں کوئی قانونی مداخلت نہ ہونا چاہیے[۵۴]۔"

---

۵۱ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۔

۵۲ ملاحظہ ہو شمالی مغربی صوبہ کی لیجسلیٹو کونسل میں آنریبل جے۔ ڈیز کی تقریر مورخہ ۱۳ اگست ۱۸۹۲ء۔

۵۳ جنوبی برما کی عدالت ہائے دیوانی کی رپورٹ ۱۸۸۶ء۔ ملاحظہ ہو چیف کمشنر کے احکامات۔

۵۴ ملاحظہ ہو رپورٹ صفحہ ۹۹۔

مدراس کے ایک سول افسر مسٹر اے۔ ڈی کیمبل نے ۱۸۳۱-۳۲ء میں ہندوستانی معاملات کی منتخبہ کمیٹی کے روبرو یہ بیان دیا تھا کہ "متروکہ اضلاع کے بلاری ڈویژن میں افسر مال کی حیثیت سے مجھے ان پنچایتوں کا کافی تجربہ ہوا ہے اور جھگڑے طے کرنے میں یہ غیر معمولی طور پر مفید ثابت ہوئی ہیں۔ کیونکہ یہ آپس کے، حکومت اور رعیت کے درمیان کے اور رعیت اور تاجروں کے درمیان کے تمام جھگڑے آسانی سے طے کر دیتی ہیں اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اور میرے اہلکار فریقین کو کوئی بات سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے لیکن وہ کسی دلیل کو نہ مانتے تھے مگر جب پنچایت نے ان کے خلاف اور حکومت کے حق میں فیصلہ کر دیا تو اسی بات کو فوراً خوشی خوشی انھوں نے منظور کر لیا۔"

لیکن رفتہ رفتہ حکام کی بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی وجہ سے یہ کارآمد جماعتیں فنا ہو گئیں ہمارے اس بیان کی تصدیق "برطانوی ہند میں دیہی حکومت" کے اس اقتباس[1] سے بھی ہوتی ہے "اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام میں پنچایت کے خلاف ابتدا ہی سے ایک زبردست جذبہ کام کرتا تھا۔ سماجی معاملات کے تصفیہ اور سرکاری مطالبات کی وصولیابی کے سلسلہ میں تو وہ پنچایت کے کارآمد ہونے کے قائل تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ عام معاملات میں بھی دخل دے۔" اس صورت سے پنچایت عضو معطل ہو گئی اور بالآخر آج بالکل فنا ہو گئی۔

پنچایت کی دیگر سرگرمیاں

ہم یہ پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ پنچایتوں کا دائرۂ عمل محض مقدمات فیصل کرنے اور سماجی معاملات طے کرنے تک محدود نہ تھا بلکہ وہ گاؤں کی صفائی اور حفظان صحت کا بھی انتظام

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶۷

کرتی تھیں اور وبا کے انسداد میں بہت مفید ثابت ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے دیہاتوں کو صاف ستھرا رکھنے کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ ہر گاؤں میں بھنگی رکھے جاتے تھے تاکہ وہ گلیوں کو صاف رکھیں اور کوڑا کرکٹ گاؤں سے دور لے جاکر جمع کریں۔ یہی کوڑا پھر کھاد کے کام آتا تھا۔ ہر جگہ مُردوں کو جلانے کا رواج تھا۔ حفظانِ صحت کے لحاظ سے یہ طریقہ سب سے بہتر مانا جاتا ہے۔ مرگھٹ عموماً آبادی سے بہت فاصلہ پر یا کسی ندی کے کنارے بنایا جاتا تھا۔ جانوروں کی لاشیں چمار گاؤں کے باہر لے جاتے تھے اور ان کی کھال اُتار کر چمڑا تیار کرتے تھے۔ یہ سب باتیں آج بھی موجود ہیں لیکن دیہاتی زندگی کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ جماعت کا اقتدار جاتا رہا ہے اور حفظانِ صحت کا انتظام ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔

مدراس ڈسٹرکٹ گزیٹیر کی تنجور کی جلد[۵۱] میں لکھا ہے کہ "جنوبی ہند میں برہمنوں کی ایک قوم ڈیمش ہوتی ہے جو عموماً تنجور کے ضلع میں پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں بطور خود گاؤں کی صفائی وغیرہ کرنے کا عجیب و غریب جماعتی نظام موجود ہے۔" مسٹر ایم۔ ڈبلیو۔ فنٹن۔ آئی۔ سی۔ ایس نے بھی ڈی سنٹرلائزیشن کمیشن کے سامنے اپنی شہادت میں بیان کیا تھا کہ "پنجاب کی بعض دیہاتی اقوام اپنے یہاں عموماً ایسے قاعدے مقرر کر دیتی ہیں کہ گاؤں کی کھاد فلاں جگہ جمع کی جائے۔"

رفاہ عام کے کام بھی گاؤں والے خود ہی کیا کرتے تھے مثلاً آبپاشی کے لئے تالاب کھودنا، کنویں کھودنا، گاؤں کے راستے درست رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی محکمۂ آبپاشی ہند کی رپورٹ[۵۲]

---

۵۱ ملاحظہ ہو صفحہ ۷۹۔

۵۲ ملاحظہ ہو حصہ اول صفحہ ۴۔

میں لکھا ہے کہ "چھوٹے تالابوں اور چشموں سے سب سے زیادہ آبپاشی صوبہ مدراس میں ہوتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ جتنا رقبہ برطانوی حکومت کے تعمیر کئے ہوئے بڑے بڑے ذرائع آبپاشی سے سیراب ہوتا ہے اتنا ہی مجموعی طور پر ان تالابوں اور چشموں سے سیراب ہوتا ہے۔" یہ تمام تالاب گاؤں کے باشندوں نے خود ہی کھودے تھے اور وہی ان کو درست حالت میں رکھتے تھے۔

"برطانوی ہند میں دیہی حکومت" میں لکھا[1] ہے کہ "گاؤں کے رفاہ عام کے ان کاموں کی تعمیر میں جو خرچ ہوتا تھا وہ غالباً قدیم رواج کے مطابق دولتمند لوگ دیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان چیزوں کو خیرات کا صحیح مصرف سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ سب گاؤں والے مل کر خود بھی رقم جمع کیا کرتے تھے۔ یہ چیز آج بھی دیہاتی زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گاؤں کا قدیم نظام زندگی ابھی بالکل تباہ نہیں ہوا ہے۔" سر اے۔ ٹی۔ اربٹنل نے مدراس کے متعلق ۱۸۷۹ء میں لکھا تھا کہ "ضلع تناولی کے بندوبست کے دوران میں ۲½ لاکھ روپیہ سے زیادہ بنجر زمینوں کی فروختگی اور چندے سے جمع ہوا تھا اور رفاہ عام کے کاموں پر خصوصاً ذرائع آبپاشی پر صرف ہوا تھا۔ صرف ایک چشمے سے رعیت نے ۴۶ پختہ نالیاں تعمیر کی تھیں۔..... ایک اور موضع میں ایک ہزار روپیہ جمع کرکے ایک پرانے چشمہ کی ریت مٹی نکالی گئی تھی۔ کئی موضعوں نے مل کر ڈھائی ہزار روپیہ اس لئے جمع کیا تھا کہ پانی دینے کا ریگولیٹر تعمیر کیا جائے جس سے پانی صحیح طور پر تقسیم ہو سکے..... دراصل رفاہ عام کے لئے چندہ جمع کرنے کی اتنی زیادہ درخواستیں مختلف مواضعات سے آئیں کہ حکام کے لئے ان سب کاموں کا انتظام کرنا ممکن نہ تھا۔"

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۴۔

رفاہ عام کی چیزوں کے لئے پنچایت گاؤں والوں سے جبریہ کام لے سکتی تھی۔ "برطانوی ہند میں دیہی حکومت" کے مصنف نے مشترکہ عمارتوں اور سڑکوں کی تعمیر کے طریقہ کو تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ "گاؤں کی خاص خاص مشترکہ عمارتیں عموماً یہ ہوتی تھیں :-

ایک جلسہ گاہ جو عام طور پر ایک بڑے سے کھلے ہوئے چھپر سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ ایک دھرم شالہ، ایک مندر یا مسجد، ایک مدرسہ اور کسی پرانی آبادی کے کھنڈر جہاں بیرونی حملہ کے موقع پر گاؤں والے اپنا سامان چھپا دیتے تھے۔ اکثر ایک ہی عمارت بہت سے کاموں میں آتی ہے اور صاف صاف یہ بتلانا مشکل ہوتا ہے کہ گاؤں کی ضروریات کے لحاظ سے یہ کس مصرف کے لئے مخصوص ہے۔ اس کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے کہ ان عمارتوں کی تعمیر اور مرمت کس طرح ہوتی تھی۔ بظاہر یہی ماننا پڑے گا کہ یہ کام دان اور مشترکہ محنت سے سرانجام پاتے تھے۔ ذرائع آب رسانی کے مقابلہ پر تو نہیں لیکن پھر بھی گاؤں کی سڑکوں وغیرہ کا بھی اسی طرح انتظام ہوتا تھا۔

کامیابی کا راز

مذکورہ بالا تفصیلات سے ناظرین کو پنچایت کی وسیع سرگرمیوں اور اس کے طریقۂ کار کا بحیثیت مجموعی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی کونسی قوت تھی جو اس انتظام کو منتشر نہ ہونے دیتی تھی اور کیوں پرانے زمانہ میں یہ لوگ اس خوبصورتی اور کامیابی سے آپس میں منسلک رہتے تھے۔ ابتدا ہی میں ہم یہ بتلا چکے ہیں کہ اس زمانہ میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انھیں ذاتی حقوق کو نہیں بلکہ اپنے فرائض کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ دنیا کی تاریخ میں اسی قوم کے حیرت انگیز کارنامے باقی رہے جس نے انفرادی حقوق کے تحفظ کے مقابلہ میں باہمی فرائض ادا کرنے کے زریں اصول پر عمل کیا۔ ان سیدھے سادے دیہاتیوں کا دوسرا عقیدہ جو پوری طرح ان کے دل پر نقش تھا یہ تھا کہ خود پرماتما ان پنچوں کے ذریعہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ آج بھی

ملک کے طول وعرض میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ جب پنچایت کے سامنے جاتے ہیں تو بالکل سچ بولتے ہیں۔ عدالت میں گواہوں سے حلف لیا جاتا ہے لیکن وہاں وہ سچ بولنے کی پروا نہیں کرتے اور جیسے ہی پنچایت کے سامنے آتے ہیں سب کچھ سچ سچ کہہ دیتے ہیں حالانکہ یہاں ان سے حلف بھی نہیں لیا جاتا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی۔ پنچ بھی آخر اسی جگہ کے ہوتے تھے۔ وہ یا تو حقیقت حال سے واقف ہوتے تھے یا آسانی سے پتہ لگا سکتے تھے۔ اس لئے ان سے سچ کا چھپانا ممکن نہ تھا۔ اور سچ جب معلوم ہوگیا تو انصاف کرنے کے لئے کوئی بہت بڑی قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صحیح فیصلہ کرنے کے لئے صرف ذوق مناسبت کی ضرورت ہے اور یہ چیز مشق اور تجربہ سے پیدا ہوتی ہے تعلیم سے نہیں۔

مواضعات کے مابین تنازعات

"جب کبھی مواضعات میں آپس میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو مختلف دیہاتوں کی پنچایتیں ایک جگہ بیٹھ کر بڑی سہولت سے آپس میں معاملہ طے کر لیتی تھیں۔ ہندو شاستر کے ترتیب دینے والے منوجی نے لکھا ہے کہ قدیم آئین میں بھی انتظامی معاملات کے لئے کئی کئی دیہاتوں کو ملا کر ایک علاقہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی گاؤں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کی جاتی تھی اور اس کے معاملات میں دخل نہ دیا جاتا تھا لیکن ان چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں اور مرکزی حکومت کا تعلق ضرور رہتا تھا۔ اسلامی دور میں مرکزی حکومت کا تعلق ختم ہوگیا اور شاہی مطالبات کی وصولیابی کے سوا ان کو کم وبیش اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ جب تک مطالبات ادا ہوتے رہتے تھے حکومت دیہاتوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیتی تھی۔" برطانوی دور کی ابتدا میں دیہات ایک مکمل جمہوریت تھے اور بیرونی اثر واقتدار سے بالکل آزاد تھے۔ یہاں یہ بتلانا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اسلامی دور سے قبل ہندو حکومت میں بھی دیہاتوں کے اندرونی انتظام میں دخل نہ دیا

جاتا تھا۔ صرف جب کوئی گاؤں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا تھا یا مختلف دیہاتوں میں ایسے جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے جو آپس میں سہولت سے طے نہ ہو سکتے تھے تو راجہ کی خدمت میں شکایت پیش کی جاتی تھی۔ عموماً جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہر گاؤں کی اپنی عدالت اور اپنی حکومت ہوتی تھی۔ برطانوی ہند کی ایک تاریخ ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دیہات کے جمہوری نظام کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جنگ و صلح کے بیرونی حادثات سے گاؤں کے نظام پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ "ایک گاؤں یا قصبہ ایک جماعت کا نام ہے جو زمین کے کسی خاص ٹکڑے پر آباد ہو۔ اس کے حدود اربعہ نہایت احتیاط سے مقرر کر دئے جاتے ہیں، اکثر تنازعہ بھی رہتے ہیں بعض جگہ لوگ مشترکہ کاشت کرتے ہیں لیکن عموماً اپنی اپنی جداگانہ کاشت کرتے ہیں اور ایک بڑا رقبہ مشترک چھوڑ دیتے ہیں۔ عوام کی اہم خدمات کرنے والے اہلکاروں کو بھی زمین کا کچھ حصہ دے دیا جاتا ہے۔ گاؤں کی خاص خاص شخصیتیں یہ ہیں:۔

پٹیل یا مکھیا جو مجسٹریٹ اور جج کی خدمات انجام دیتا ہے اور دوسری جماعتوں یا حاکموں سے معاملات کرتا ہے۔ باقی فرائض پٹواری، چوکیدار، مہتمم آب رسانی، جوتشی، لوہار، بڑھئی، کمہار، نائی، دھوبی اور سنار انجام دیتے ہیں۔

سلطنت میں خواہ کوئی تبدیلی ہو، تاج و تخت خواہ کوئی درانتا پائے یا غصب کرلے یا اس پر زور شمشیر قبضہ کرلے۔ بادشاہ خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان دیہاتوں کے نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ اگر کسی زبردست اور تباہ کن حملے سے یہ لوگ اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے اور برسوں انھیں جلاوطنی میں زندگی گذارنا پڑتی لیکن امن و امان قایم ہوتے ہی یہ پھر واپس آجاتے تھے اور بلا کسی مزاحمت یا مقابلہ کے اپنی سابقہ جائداد پر قابض ہو جاتے تھے۔ زبردست شخصی حکومت کی موجودگی میں بلاشبہ یہ بے شمار جمہوریتیں ہی بڑی حد تک ہندوستان کی خوش حالی کا باعث تھیں لیکن وہ اتنی

منتشر تھیں کہ خود مختار فرمانروائوں اور سرداروں پر جو اس وسیع سرزمین کی حکومت کے لئے آئے دن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے کوئی مستقل نگرانی اور قبضہ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔"

باب سوم

گاؤں کا مہاجن

مہاجن گاؤں کے اقتصادی نظام کی بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ سماج میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ آجکل سرکاری اور غیر سرکاری حضرات سب کا یہی خیال ہے کہ مہاجن ہی کسان کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ پچھلے کسی باب میں ہم نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یہ موقع اس بحث کا نہیں ہے کہ کون شخص کس حد تک کسان کی تباہی کا ذمہ دار ہے نہ ہم اس بحث میں پڑنا چاہتے ہیں کہ نسبتاً کس پر اس کی ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مہاجن کو خون چوسنے والی بلا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی چیز کے پیش نظر ہم قدیم زمانہ کی ہندوستانی سماج کا حال اور مہاجن کا درجہ ذرا تشریح کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

قدیم دیہات میں مہاجن کا درجہ

دیہاتی زندگی کے ابتدائی دور میں مہاجن کسانوں کی ضروریات مہیا کیا کرتا تھا اور بوقت ضرورت انھیں روپیہ یا اناج قرض دیا کرتا تھا۔ پھر فصل پر یا اور کسی موقع پر سہولت سے وصول کر لیتا تھا۔ قرض لینے کا طریقہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ خوشحال سے خوشحال ملکوں میں بھی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ غریب ملکوں کے مقابلہ میں دولتمند ملکوں میں قرض کی مجموعی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ دراصل شرح سود اور وصولیابی کا طریقہ کسی ملک کی خوشحالی یا افلاس کا سبب ہوتا ہے۔ خوشحال ملکوں میں روپیہ کم شرح سود پر آسانی سے مل جاتا ہے اور

ایک شخص تھوڑے سے ذاتی سرمایہ سے بڑی بڑی تجارتیں اور کارخانے چلا سکتا ہے لیکن مفلس ملکوں میں شرح سود اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سود اصل سے بڑھ جاتا ہے۔ پہلے زمانہ میں مہاجن کسانوں کو روپیہ قرض دیا کرتا تھا لیکن وصولیابی کی اسے وہ سہولتیں نہ تھیں جو آج حاصل ہیں جس طرح آج وہ فوراً دیوانی کی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس طرح پہلے آسانی سے ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسے سراسر لوگوں کی نیک نیتی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر اس کا یہ مقصد بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کرلے اور جائز و ناجائز طریقہ سے دولت جمع کرے۔ اگر وہ ایسا خیال بھی کرتا تو پنچایت بیچ میں حائل ہوتی تھی۔ فصل کے موقع پر بزرگوں کی موجودگی میں مہاجن کا حساب کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ مہاجن کو اس کی رقم پر معقول منافع دیتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھتے تھے کہ قرضدار بے وجہ پریشان نہ ہو اور تباہ نہ ہو جائے۔ انھیں پورا اختیار تھا کہ قرض کی رقم کو کم کر دیں لیکن اس سلسلہ میں جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر کام نکالا جاتا تھا۔ اسی طرح وہ قرضدار کی تمام جائداد مہاجن کے مطالبہ کی ادائگی کے لئے فروخت بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ان تمام معاملوں میں پنچوں کو یہ خیال ضرور رہتا تھا کہ کسان بھوکوں نہ مرنے لگے۔ ساتھ ہی مہاجن کو بھی یہ موقع نہ دیا جاتا تھا کہ وہ کسان کے پیسہ سے عیش کرے۔ شرح سود آجکل کے مقابلہ میں کم نہ تھا۔ عام طور پر غیر مکفولہ قرضوں پر ۲ فیصدی ماہوار لیا جاتا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ سود پورا پورا کبھی وصول نہ ہوتا تھا۔ عموماً ان مویشیوں اور جائداد کی قیمت جو قرض کے عوض میں دئے جاتے تھے بازار کی شرح سے کہیں زیادہ لگائی جاتی تھی مثلاً فرض کیجئے کسی کسان نے دو سو روپیہ قرض لیا۔ اس پر ۲۵ روپیہ سود ہوا۔ گویا کل سوا دو سو روپیہ واجب الادا ہوا۔ اب اس کے پاس صرف چار مویشی ہیں جن کی

مجموعی قیمت ۲۱۰ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ تصفیہ کرتے وقت پنچ ان کی قیمت عموماً ۲۲۵ روپے لگا کر قرض بیباق کر دیتے تھے۔ دراصل وہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ کہ زر اصل تو پورا پورا ادا ہو جائے لیکن سود کی رقم اس طرح کم کر دی جائے کہ مہاجن پر بھی زیادتی نہ ہو اور قرضدار بھی اپنے بار سے سبکدوش ہو جائے۔ اس زمانے میں سود کم کرنے کے لئے کسی قانون کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ گاؤں کے بزرگوں کو سود کم کرنے کا اختیار تھا۔ اور ان کے فیصلے کی تعمیل کی جاتی تھی۔ کسان کے پاس صرف دو ہی چیزیں ایسی ہوتی تھیں جن کی بازار میں کچھ قیمت اُٹھ سکتی تھی یعنی مویشی اور کھیت کی پیداوار۔ اس زمانے میں قیمتوں میں اتنا زیادہ اتار چڑھاؤ نہ ہوتا تھا۔ نہ اپنے نفع کے لئے کوئی حکومت رائج الوقت سکے کی قیمت کو کم و بیش کر کے اشیا کی قیمت کو مصنوعی طور پر گھٹاتی بڑھاتی ہے۔ گویا قرضے کی ایک مستقل حیثیت ہوتی تھی۔ اور غریب قرض دار کو قیمت اور اس کے مصنوعی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے حد سے زیادہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ زمین کی بھی کوئی نقد قیمت نہ تھی۔ اس لئے مہاجن اسے اپنے کفالت میں لینے کا خیال بھی نہ کرتا تھا۔ پھر مہاجن کو یہ بھی اجازت نہ تھی کہ وہ قرض دے کر عرصے کے لئے خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ پنچوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ہر فصل کے موقع پر قرضے بیباق کرا دیں اور کسی قرض خواہ کو اصل سے دگنے سے زیادہ نہ مل سکتا تھا اس قسم کے لین دین میں کوئی باضابطہ دستاویزیں بھی نہ لکھائی جاتی تھیں اور ہر شخص کی زبان ان دستاویزوں سے زیادہ وقعت رکھتی تھی۔ جن میں ضابطہ کی بیکار خانہ پری کرنا ہوتی ہے۔ رجسٹری ہوتی ہے اور اسٹامپ لگتا ہے آج کل کی باضابطہ دستاویزوں میں کثرت سے ایسی اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے۔ جن کے طرح طرح کے معنی لئے جا سکتے ہیں۔ اور قانونی موشگافیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس زمانے میں قرض خواہ کے بہی کھاتے میں

بس ایک اندراج کافی تھا۔ اس بھلے زمانے میں کبھی ایسا سننے میں نہیں آتا تھا کہ کسی قرضدار نے روپیے سے انکار کیا ہو۔ حالانکہ نہ کوئی تحریر ہوتی تھی نہ نشانی انگوٹھا لی جاتی تھی اور نہ دستخط ہوتے تھے۔

"قدیم زمانے میں قرض خواہ کو قرضے کی وصولیابی کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے کوئی امداد نہ دی جاتی تھی۔ اس کے لئے دیوانی کی عدالتیں بھی نہ تھیں اور اپنی رقم وصول کرنے کے لئے اسے بطور خود کوشش کرنا پڑتی تھی۔ پھر اگر وہ کبھی تشدد سے کام لیتا تھا تو حکومت بھی چشم پوشی کرتی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود نتائج حسب توقع نسبتاً خراب نہ ہوتے تھے۔ یعنی معاہدوں کی شاذ و نادر ہی خلاف ورزی ہوتی تھی جس سے اس زمانے کے لوگوں کی اعلیٰ سیرت کا پتہ چلتا ہے۔ کمشنروں کی رائے ہے کہ ان معاملات میں عوام ایمانداری کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ اور مہاجنوں کے لئے احتیاط شرط تھی"[1]

اگر کبھی کوئی شخص قرض ادا کر ہی نہ سکتا تھا تو بالکل آخری صورت میں وہ مہاجن سے درخواست کرتا تھا کہ تمہارے بہی کھاتے میں میرے نام پر جو اندراجات ہیں مہربانی کرکے انھیں کاٹ دو۔ یہ حرکت بڑی بے شرمی اور بے ایمانی کے مترادف سمجھی جاتی تھی اس لئے کوئی قرضدار اس کی ہمت ہی نہ کرتا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ درخواست کرتا تھا تو اسے تمام مطالبوں سے سبکدوش کر دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں بھی اگر وہ شخص یا اس کے بیٹے پوتے کبھی اس قابل ہوتے تھے تو اپنا فرض سمجھتے تھے کہ قرض ادا کر دیں۔ کیوں کہ عام طور پر عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص قرض ادا کئے بغیر مرجائے تو دوسرے جنم میں اسے ادا کرنا ہوتا ہے اسی وجہ سے

---

[1] ملاحظہ ہو روئیداد کونسل گورنر جنرل۔ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۸۹۷ء

قرض دار کوشش کرتا تھا کہ قرض بالکل معاف کرانے کے بجائے قرض خواہ کو تھوڑی بہت ہی رقم قبول کر لینے پر راضی کر لے۔ یہ عقیدہ آج بھی موجود ہے اگرچہ اس کا وہ تقدس جاتا رہا ہے۔ آج بھی اولاد اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اپنے باپ کا قرض ادا کرے۔ وہ اس کا تمام بار اپنے سر لے لیتی ہے۔ اور عدالت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ اس رواج پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جب مہاجن کو قانونی چارہ جوئی کا موقع نہیں ہوتا تو عموماً وہ مرحوم کے بیٹوں یا دوسرے رشتہ داروں کے پاس جاتا ہے اور قانونی ذمہ داری یا مذہبی فرض کی بنا پر انھیں اس بات پر آمادہ کر لیتا ہے کہ اس قرض کو اپنا فرض اعتباری تصور کریں"[1] ایمان داری دونوں کا مسلک تھا اور قرض دار و قرض خواہ دونوں اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے معاملات میں پاک صاف رہیں اگر کوئی فریق بے ایمانی کی کوشش بھی کرتا تھا تو تحقیقات کے وقت صحیح واقعات پنچایت کے سامنے آجاتے تھے

گاؤں میں مہاجن کی عزت کی جاتی تھی لیکن اس کا درجہ سب سے افضل نہ تھا۔ گاؤں کے بزرگ اس کے محافظ ہوتے تھے اور کوئی شخص اسے نقصان نہ پہنچا سکتا تھا جب کبھی اس پر کوئی مصیبت آتی تھی تو سارے گاؤں والے اسے اور اس کے خاندان کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک سے مہاجن کی حفاظت میں دریغ نہ کرتے تھے اسی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ قحط اکال کے موقع پر مہاجن بھی گاؤں والوں کے لئے اپنے کھلیانوں کے دروازے کھول دیتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا اور بالکل صحیح تھا کہ جو سب گاؤں کا حال وہ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲

اپنا حال۔ چنانچہ اس کی ساری دولت گاؤں والوں کے لئے حاضر رہتی تھی اور خطرے کے وقت سارے گاؤں والے اس کی مدد کو تیار رہتے تھے۔ گویا اجتماعی زندگی کے صحیح اصولوں کو فریقین تسلیم کرتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔

پرانے زمانے میں کسی کو بھی عدالت میں جاکر دیوالیہ ہونے کی درخواست نہ دینا پڑتی تھی۔ ایسا کوئی نہ تھا جو ذرا بھی سرمایہ رکھتے ہوئے اپنا قرض ادا کرنے سے انکار کرے اگر یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ کوئی شخص مطالبات ادا کرنے سے بالکل قاصر ہے تو پنچایت اور قرض خواہ دونوں اسے معاف کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں افلاس کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا اور امارت باعثِ عزت نہ تھی۔ سماج محض دولت کے معیار پر قائم نہ تھی اور مہاجن سماج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھا۔ اپنی دولت کے ذریعے لوگوں کو غلام بنانے کے لئے نہیں تھا۔ وہ اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں لوگوں کی امداد کرتا تھا۔ اپنے نفع کے لئے انھیں لوٹنا نہ تھا۔

باب چہارم

تعلیم

عام طور پر یہ خیال ہے کہ پرانے زمانے میں تعلیم اتنی عام نہ تھی جیسی آج کل ہے اور نہ تعلیم حاصل کرنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عوام کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا حکومت بھی اپنا فرض نہ سمجھتی تھی۔ حکومت کی جانب سے اسکول، کالج یا یونیورسٹیاں نہ تھیں۔ سائنس اور دوسرے فنون کی تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ اور حکومت اپنی رعایا کو وہ مفید ہنر سکھانے کی بھی کوشش نہ کرتی تھی۔ جو مہذب دنیا میں نہایت ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں یہ ثابت کرنا بے موقع ہوگا کہ آج کل کے مقابلے میں اس زمانے میں بچوں کی تعلیم کا بہتر انتظام تھا اور زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ ہم اپنے ناظرین کی اطلاع کے لئے صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ تعلیم یافتگان کا اوسط پہلے کے مقابلے میں اب بہت کم ہوگیا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ سائنس کی طرف اتنی توجہ نہ کرتے تھے جتنی مذہبی تعلیم کی طرف۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ دنیاوی تعلیم بالکل مفقود تھی۔ ہندو شاستر کے مطابق برہمن، چھتری اور ویش قوموں کو چاروں ویدوں میں سے ایک وید پڑھنا لازمی تھا۔ گویا تین چوتھائی آبادی پر مذہبًا یہ فرض عائد ہوتا تھا۔ کہ فلسفہ اور مذہب کی زبردست تصانیف کا مطالعہ کریں۔ اسی غرض کے لئے انھیں سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ صرف شودروں کو وید پڑھنے کی ممانعت تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کی بھی ممانعت تھی، "چھندوگیہ" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ راجہ اشوپتی نے ایک دفعہ کہا تھا

کہ میری ساری سلطنت میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ اس سے ہمیں اس زمانے کے حالات کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ نیز ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کے راجہ نہ صرف عام تعلیم کے حامی تھے بلکہ اس مقصد کی تکمیل پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت طریقۂ تعلیم بالکل مختلف تھا لیکن گذشتہ اور موجودہ طریقہ تعلیم کے نتائج سے ہمیں اس کی خوبی کا اندازہ کرنا چاہیئے۔

اس لئے "برطانوی ہند میں دیسی حکومت" کے چند اقتباس اس سلسلے میں پیش کرنے کی ہم اجازت چاہتے ہیں۔ مصنف مذکور[1] نے لکھا ہے کہ "ہندوستانی دیہات میں اس کی تاریخ کا اگر ہم مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ابتدائی دیہاتی نظام سے شروع کرنا چاہیے۔ مدرس کو بھی، مکھیا، پٹواری، چوکیدار اور دوسرے اہلکاروں کی طرح دیہاتی نظام میں ایک خاص درجہ حاصل تھا۔ وہ بھی گاؤں کا ایک اعلیٰ رکن سمجھا جاتا تھا۔ اسے یا تو بلا لگان کے زمین دے دی جاتی تھی یا پھر فصل میں ایک خاص حصہ مقرر ہوتا تھا۔ عموماً گاؤں کا برہمن یا پروہت ہی مدرس بھی ہوتا تھا۔ وہ گاؤں والوں کی پوجا پاٹ بھی کرتا تھا اور خالی وقت میں ان اعلیٰ ذاتوں کے بچوں کو جن پر پڑھنا لکھنا فرض تھا تعلیم بھی دیتا تھا۔ شاستروں کی رو سے پنڈتوں کا صرف یہی فرض نہ تھا کہ وہ مذہبی خدمات انجام دیں بلکہ درس تدریس بھی جاری رکھیں پنڈتوں کے گذارے کے لئے جو زمین دی جاتی تھی اس میں مندر کے لئے بھی ایک حصہ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ اس آمدنی کے علاوہ چیلے اور ان کے والدین خوشی سے ان کو نذرانے دیتے تھے۔" آگے چل کر مصنف موصوف لکھتے ہیں[2] قدیم موضع کے مدرسہ کی چند نمایاں خصوصیات

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹۱ [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۴۰

تھیں مثلاً تعلیم اور عام تربیت کے لحاظ سے روحانیت حاوی نہ تھی یعنی براہِ راست مذہبی تعلیم نہ دی جاتی تھی۔ مدرسوں کے دروازے نہ صرف برہمنوں ہی کے لئے بلکہ چاروں ذاتوں کے لئے یکساں کھلے ہوئے تھے۔ اور نصاب تعلیم میں دیسی زبان میں لکھنے پڑھنے اور حساب کے علاوہ کچھ تھوڑی سی سنسکرت۔ قواعد اور شاعری بھی داخل تھی۔

یہ بتلا دینا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ بدقسمتی سے اس زمانے کے قابل اعتبار کاغذات موجود نہیں ہیں اور مختلف مواقع پر جو مردم شماریاں کی گئیں ان سے بھی کوئی صحیح نتائج ترتیب نہیں دئے جا سکتے۔ کیونکہ اعداد شمار اصل واقعات پر نہیں بلکہ محض قیاس پر مبنی ہیں۔ البتہ ریورنڈ کی نے اس سلسلے میں کافی تحقیقات کی ہے اور برطانوی حکومت سے پہلے کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ اپنی کتاب موسومہ "قدیم ہند میں تعلیم" میں فرماتے ہیں۔ "برطانوی قبضے سے پہلے یہاں وسیع پیمانے پر معقول نظام تعلیم جاری تھا یہ صرف دو ایک صوبوں تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود تھا۔ اگرچہ بعض اضلاع اوروں سے پیش پیش تھے۔ صوبہ مدراس میں ۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء میں ایک تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ قابل تعلیم لڑکوں میں سے چھٹے حصے سے بھی کم تعداد زیر تعلیم ہے ۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۸ء میں اسی قسم کی ایک تحقیقات صوبہ بمبئی میں کی گئی تو پتہ چلا کہ صرف آٹھواں حصہ زیر تعلیم ہے۔ بنگال کے ایک ضلعے میں مسٹر آدم نے تحقیقات کی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ۲ر۳ فی صدی مرد زیر تعلیم ہیں۔ ایک دوسرے ضلعے میں قابل تعلیم بچوں میں سے ۹ فی صدی زیر تعلیم ملے۔

ان اعداد کا ذرا ۱۹۳۱ء کے اعداد سے مقابلہ کیجئے۔ گذشتہ مردم شماری کی رو سے ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ تھی۔ اس میں صرف ۲ کروڑ ۸۱ لاکھ

تعلیم یافتہ تھے۔ ان میں ۲ کروڑ ۳۹ لاکھ تو مرد اور ۴۲ لاکھ عورتیں تھیں۔ زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۱۹۳۱ء میں ایک کروڑ ۲۶ لاکھ ۹۲ ہزار تھی۔ جن میں سے ۹۴ لاکھ ابتدائی مدارس میں۔ ۲۳ لاکھ ثانوی مدارس میں۔ ۳ لاکھ خاص مدارس میں اور ۹۲ ہزار کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تھے۔

ڈاکٹر لیٹنر نے ایک کتاب "پنجاب میں دیسی تعلیم کی تاریخ" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "راولپنڈی میں ۱۷۱ اسکول ہیں جن میں ۳۷۰۰ طالب علم پڑھتے ہیں سابقہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۶۷ء تا ۱۸۶۹ء میں ۳۰۲ اسکول تھے جن میں ۵۴۵ طالب علم زیر تعلیم تھے۔ لیکن جب مسٹر تمر نے خود تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ ۶۸۱ اسکول ہیں جن میں ۱۷۵۴ طالب علم تعلیم پا رہے ہیں"۔ ڈاکٹر لیٹنر لاہور کالج کے سب سے پہلے پرنسپل تھے اس کے بعد وہ پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہو گئے تھے

مسٹر ہوڈیل بھی بیان کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسا بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں پرانے زمانے میں بھی دیسی مدرسے تھے۔ مسٹر آدم نے ۱۸۳۵ء میں اندازہ کیا تھا کہ صرف بنگال میں ان کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ مدراس میں ۱۸۲۲ء میں سر تھامس منرو نے تحقیقات کی تھی ان کا بیان ہے کہ صوبے میں ۱۲۴۹۸ مدرسے تھے جس میں ۱۸۶۵۰ طالب علم پڑھتے تھے۔ بمبئی میں بھی اسی زمانے میں اسی قسم کے مدرسے تمام صوبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ جب فاتح کی حیثیت سے ہمارا رعب چھا رہا تھا۔ اور لوگوں کے دلوں میں خبگ اور مظالم سے نجات دلانے پر ہماری طرف شکر گذاری کا جذبہ موجود تھا

لہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴

تو حکومت نے موقعہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور دیہاتی نظام میں مدرسے کو اہمیت نہ دی۔ بنگال کے ایک انسپکٹر مدارس کو ۱۸۶۸ء میں پنجاب کے مدرسوں کا معائنہ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے "ہندوستان کی دیسی تعلیم شاستروں کے احکام پر مبنی تھی اس لئے اسے مذہبی فرض کا مرتبہ حاصل تھا۔ جو لوگ تعلیم دینے کا کام کرتے تھے ان کی بڑی قدر و منزلت تھی وہ لوگ نہ صرف اپنے مدنی بلکہ مالی اور عدالتی انتظامات بھی خود ہی کرتے تھے جس سے تعلیم کے پھیلانے میں بے انتہا امداد ملتی تھی"۔

"قدیم طرز تعلیم کے نتائج کا اندازہ ان بے شمار پاٹھ شالوں سے ہوگا جو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آج اگرچہ ان کی حالت بہت ہی خراب ہے لیکن ہزاروں سال کی مسلسل بے پروائی۔ نفرت اور دوسرے مخالف حالات کے باوجود ان کا باقی رہنا ہی یہ ثابت کرنا ہے کہ ابتدا میں انھیں زبردست مذہبی تائید حاصل تھی آج وہ مذہبی تائید مفقود ہوتی جا رہی ہے گاؤں کی جماعتی زندگی درہم برہم ہوگئی ہے ضعتیں تباہ ہو چکی ہیں۔ محصول کا انتہائی بار پڑ رہا ہے اور ایک بیرونی زبان عدالتی اور تجارتی زبان بن گئی ہے جب تعلیم حاصل کرنے کے قدرتی حوصلے اس طرح پست ہو گئے ہوں تو پھر اس کی ترقی ایسی روشن خیال حکومت کی کوششوں ہی پر منحصر ہے۔ جو غیر ملکی حکومت کے لازمی نقصانات کی تلافی کرنے کو بھی تیار ہو"۔

ڈاکٹر لیٹنر جن کی کتاب کا ایک اقتباس ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں لکھتے ہیں[1] کہ :۔ "ہونشیار پور جیسے غیر ترقی یافتہ ضلع کی ۱۸۵۲ء کی بندوبست کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ۱۹۷۶۵ مردوں کے درمیان میں ایک مدرسہ تھا۔ اس کا مقابلہ ذرا موجودہ حالت سے کیجئے کہ ہر ۲۸۱۰ شخصوں

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۳

کے درمیان میں ایک سرکاری یا نیم سرکاری اسکول ہے۔" تمام صوبے کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ "دہلی اور حصار ڈویژن کو شامل کرتے ہوئے (جن میں ۶۰۷ گاؤں اور قصبے ہیں) ۱۸۵۴ء کی نامکمل مردم شماری کے مطابق کل صوبے میں ۳۳۰۰ گاؤں اور قصبے تھے۔ فرض کیجئے کہ ان مواضعات میں کم از کم ۳۳۰۰ ہی مسجدیں، مندر، دھرم شالے وغیرہ تھے۔ جن میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ (اس تعداد میں ہم نے ۳۳۰۲ مدرسے شامل نہیں کئے ہیں جن کا ۱۸۵۴ء میں موجود ہونا ثابت ہے۔ نہ وہ بے شمار مدرسے شامل کئے ہیں جو استادوں کے گھروں میں ہوں گے) اور فرض کیجئے کہ ان مدارس میں اوسط حاضری دس تھی تو گویا کم از کم ۳۳۰۰۰ طالب علم سرکاری اور نیم سرکاری مدرسوں میں زیر تعلیم ہوں گے۔ (گذشتہ مردم شماری کی رو سے کل ۱۵۷۶۲۳ زیر تعلیم تھے)۔ رانا رنجیت سنگھ کے زمانے میں پنجاب کی تعلیمی حالت کا اندازہ سکھ مصنفین کی اس تعداد سے کیا جا سکتا ہے جو ہم پچھلے باب میں درج کر چکے ہیں۔ دوسرے شعبوں کے قابل آدمیوں کی فہرست اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔ اس کے علاوہ خود ہماری نظم و نسق اور بندوبست کی رپورٹوں کی (جہاں تک مجھے ان کے دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے) شہادت کافی ہے۔ کہ تمام صوبے میں تعلیم عام تھی۔"

تعلیم نسواں

صرف یہی نہیں کہ مرد تعلیم یافتہ تھے بلکہ عورتوں میں بھی تعلیم موجود تھی۔ ڈاکٹر لیٹنر اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں[1] کہ پنجابی عورتیں ہمیشہ نہ صرف خود کچھ نہ کچھ تعلیم یافتہ رہی ہیں بلکہ دوسروں کو

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۹۷، ۹۸

تعلیم دیتی رہی ہیں۔ مثلاً دہلی میں ایسے ۶ مدارس نسواں ہیں جنھیں پنجابی عورتیں چلا رہی ہیں یہ عورتیں اسی مقصد کے لئے وہاں گئی ہیں۔ اسی طرح دوسرے مقامات میں بھی پنجابی عورتیں استانیوں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ گویا جیسے گرو اپنی تعلیم صوبے کے باہر بھی پھیلاتے ہیں اور بے انتہا مقبول ہوتے ہیں۔ ویسے ہی عورتیں بھی تعلیم پھیلانے میں برابر مصروف ہیں۔

مسلمانوں میں بھی بیوہ عورتیں اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہیں کہ لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھائیں۔ اگرچہ دہلی بھی باقی شمالی مغربی صوبے کی طرح تعلیم نسواں میں بہت پیچھے ہے لیکن پھر بھی وہاں ۱۸۴۵ء زنانہ مدرسے گھروں میں موجود ہیں"۔

ڈاکٹر لٹنر نے ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیٹی کے روبرو شہادت دی تھی اس میں لڑکیوں کے دیسی طریقہ تعلیم کے متعلق بہت دلچسپ تفصیلات بیان کی تھیں۔ یہاں پر مناسب ہوگا اگر ہم ان کے ایک جواب کا کچھ حصہ نقل کر دیں۔ کیوں کہ اس سے حکومت برطانیہ کے قبل تعلیم نسواں کی حالت پر کافی روشنی پڑے گی۔

سوال:۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس صوبے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام ہے۔ اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟

جواب:۔ جی ہاں۔ مثلاً مولوی اور سکھ صاحبان اپنی بیویوں کو خود پڑھاتے ہیں اور پھر وہ خود اپنے بچوں کو ایک خاص عمر تک پڑھاتی ہیں۔ اور مذہبی باتوں کی تعلیم دیتی ہیں۔ معزز مسلمانوں کی عورتیں عموماً کچھی پڑھی ہوتی ہیں (اگرچہ خاص وجوہ کی بنا پر جن پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے لکھنے پر زیادہ زور نہ دیا جاتا تھا) بعض بعض عورتیں تو فارسی میں اچھی خاصی قابلیت رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کے ایک معزز خاندان سے میرے تعلقات ہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس خاندان کی اکثر عورتیں بڑی اچھی شاعرہ ہیں۔ مسلمانوں اور سکھوں میں عورتوں

کی حالت بہت بہتر ہے۔ اور ان کو تعلیم دلانے کے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ان کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہ پڑے دیسی ریاستوں میں بھی جہاں برطانوی ہند کی طرح تعلیم نسواں کا زیادہ چرچا نہیں ہے۔ اسی تناسب سے تعلیم یافتہ عورتیں موجود ہیں۔ چناب اور اٹک کے درمیانی اضلاع میں سکھ عورتوں کے مدارس ہمیشہ رہتے ہیں۔ یہ طریقہ کہ پنڈتوں کی عورتیں اپنی قوم کے گھروں پر جاکر لڑکیوں کو پڑھایا کریں نہایت مناسب ہے۔ بخلاف اس کے جوان لڑکیوں کا بازاروں سے ہوکر اسکول جانا میرے نزدیک نہایت نامناسب ہے۔ ابتدائی مذہبی کتابوں کا پڑھنا۔ سینا، کاڑھنا، کھانا پکانا، امور خانہ داری، انتہائی صفائی، عزیزوں کی تکلیف اور مصیبت میں دل سوزی کرنا، خانگی جھگڑے خوش اسلوبی سے طے کرنا۔ اعلیٰ طبقوں میں گھروں میں یہی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ عورتیں اپنے عزیزوں کی عزت کرتی ہیں اور ان سے حقیقی محبت رکھتی ہیں۔ یورپ میں یہ چیزیں دکھاوے کو بھی نہیں ملتیں"۔

تعلیم کے تنزل کے اسباب

ڈاکٹر لیٹنر نے پنجاب میں پرانے طریقہ تعلیم کے فنا ہونے کے حسب ذیل اسباب بیان کئے ہیں:۔

"پنجاب میں منتظمہ بورڈ کو حکم ملا کہ زمینوں کی معافیاں ضبط کرلی جائیں۔ حتیٰ کہ بڑے اوقاف کی صورت میں مدرسوں اور مذہبی عمارتوں کی معافیاں بھی ضبط کرلی جائیں۔ اس طرح بنگال کی ضبطی جائداد کی پیروی کی گئی"۔

"اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دیسی اسکولوں کے بہت سے اوقاف رفتہ رفتہ تباہ ہوگئے"۔

پنجاب کے محکمہ تعلیم کے رویہ نے دیسی اسکولوں کو تو برباد کردیا۔ لیکن اس نے خود اپنے

پرائمری مدارس پر کوئی توجہ نہ کی"

انگریز مصنفین اور سرکاری رپورٹوں سے ہم نے جو مندرجہ بالا اقتباسات پیش کئے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ قدیم ہندوستان میں کافی تعلیم تھی۔ طریقہ تعلیم اگرچہ مختلف تھا لیکن مکمل اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے بالکل موزوں تھا۔ ریورنڈ کیز اپنی کتاب کے آخری باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ" مغربی ممالک میں تو اس کا ذکر بھی نہیں ہے لیکن ان سے قطع نظر عام طور پر بہت کم ملک ایسے ہیں جن میں ہندوستان کی طرح طریقہ تعلیم کی طویل اور مسلسل تاریخ موجود ہو اور جس میں بہت کم ترمیم ہوئی ہو۔ صدیوں تک یہ طریقہ جاری رہا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد مفید اور قابل قدر اصولوں پر قائم تھی۔ اور ان لوگوں کی ضروریات کے لئے یہ قطعی موزوں تھا جنھوں نے اسے ترقی دے کر اختیار کیا تھا۔ اس نے بہت بڑی بڑی شخصیتیں اور حق کے سچے متلاشی پیدا کئے ان کے علمی کارنامے کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ انھوں نے بہت سے اعلیٰ تعلیمی نظریے قائم کئے جو علم و عمل میں گراں قدر اضافہ ہیں" ہم یہ پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ تعلیمی نظام اتنا مکمل تھا کہ انقلاب اور جنگ کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ مسٹر ہوویل اپنی کتاب موسومہ" برطانوی ہند میں تعلیم"۔ میں لکھتے ہیں" ہندوؤں کا یہ مقدس اور مفید نظام سینکڑوں انقلابوں کے بعد بھی باقی رہا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں عموماً اچھے اہل قلم اور محاسب ہوتے تھے"۔

ہندوستان کی ایک چوتھائی آبادی اپنا یہ مذہبی فرض سمجھتی تھی۔ کہ دوسروں کو تعلیم دے۔ برہمن اگرچہ غریب تھے لیکن وہ بڑے شوق اور دلچسپی سے اپنے چیلوں کو پڑھاتے تھے ان کی زندگی کا مقصد یہی تھا کہ وہ تمام عمر علم حاصل کریں اور اسے دوسروں تک پہنچائیں گویا پڑھنے پڑھانے ہی کے لئے جیتے تھے۔ اور اس انسانی ہمدردی اور محبت کی خدمت کے عوض میں انھیں حکومت یا پنچایت کی جانب سے کوئی مستقل تنخواہ یا معاوضہ ملتا تھا۔ دراصل

پڑھانے کا معاوضہ لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ علم کا فروخت کرنا معیوب تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گاؤں والے انھیں مفت زمین دیتے تھے اور تقریبوں کے موقع پر بھی انھیں نذرانہ دیا جاتا تھا۔ لیکن تعلیمی خدمت کا معاوضہ لینا وہ بڑی ذلت سمجھتے تھے۔ حکومت بھی مدرسوں کی زمین پر لگان نہ لیتی تھی۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں کو حکومت خود امداد دیتی تھی لیکن وہاں بھی گرو ملازم کی حیثیت سے کام نہ کرتے تھے۔ وہ معاوضے کی خاطر تعلیم نہ دیتے تھے۔ بلکہ اسے اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ ان یونیورسٹیوں میں وہ محض قیام و طعام اور بعض ضروریات زندگی کی چیزیں منظور کر لیتے تھے۔ طالب علموں سے بھی کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ اسکول اور کالج تجارت گاہیں نہ تھیں اور نہ استادوں کے لئے ملازمت کے محکمے تھے۔ "برطانوی ہند میں دیسی حکومت" کے مصنف نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1] "مفت تعلیم کا نقش اب بھی اس ملک میں لوگوں کے دلوں پر اتنا گہرا ہے کہ گاؤں کے مدرسوں میں فیس ادا کرنا بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تحفے تحائف مدرس کی آمدنی کا ایک خاص جزو ہیں۔ کیونکہ تعلیم خریدنے کے مقابلے میں لوگ اسی طریقے کو قومی روایات سے قریب تر سمجھتے ہیں۔

ایک گروہ جو محض محبت کی بنا پر تعلیم دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہتر سے بہتر تعلیم کم سے کم وقت میں دے گا۔ اور یہ تعلیم واقعی حاصل کرنے کے لائق ہوگی۔ وہ قوم جو ایسے بے غرض کام کرنے والے پیدا کر سکتی ہے۔ یقیناً قابل مبارک باد ہے۔ تبائیے کہ آئندہ نسل کو ان سے بہتر اور کون تیار کر سکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ طرز تعلیم آج فنا ہو چکا ہے یہ امر واقعہ ہے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۶۹

کہ برطانوی حکومت سے پہلے ہندوستان میں ایک ایسا نظام تعلیم موجود تھا جو اس وقت دنیا کے بہترین اور ترقی یافتہ نظام کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔

تعلیم کا مقصد سیرت کی درستی تھی تاکہ لوگ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بہتر زندگی بسر کریں۔ یہ کوئی تجارت کا ذریعہ نہ تھا۔ کوئی بھی ملازمت کے خیال سے تعلیم حاصل نہ کرتا تھا۔ اور ہر شخص صرف اس لئے پڑھتا تھا کہ صحیح معنوں میں نوع انسانی کی خدمت کر سکے

ہمارے لئے یہ بہت دشوار ہے کہ ہم قدیم زمانے کے اس عجیب و غریب طریقہ تعلیم کے محاسن کو سمجھ سکیں۔ برما میں یہ طریقہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں تلخ تجربہ ہونے کے بعد حکومت نے ہماری خوش قسمتی سے اس کو وہاں باقی رہنے دیا ہے۔ وہاں پر گاؤں میں مٹھ اور مندر ہیں۔ اور ان کے ساتھ اوقاف ہیں۔ گاؤں کا ہر بچہ وہاں پڑھنے جاتا ہے اور پروہت انھیں تعلیم دینا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔ پروہت کا گذارہ گاؤں کی دی ہوئی زمین اور نذرانوں پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے چیلوں سے کوئی فیس نہیں لیتا۔ گویا وہ ویدک زمانے کے برہمنوں کے قدیم مسلک کا سچا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرد عورت دونوں میں وہاں سب صوبوں سے زیادہ تعلیم ہے۔

باب پنجم

تبدیلی اور اس کا اثر

ہندو دور میں گاؤں ضلعوں میں اور ضلعے صوبوں میں منسلک ہوتے تھے اور سب کے اوپر مہاراج ادھیراج کی حکومت ہوتی تھی۔ لیکن اندرونی انتظام اور مالی اختیارات کے لحاظ سے ہر گاؤں اپنے طور پر ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی مقامی حکومت کو ہر قسم کے مقدمات طے کرنے اور تمام ضروریات بہم پہنچانے کے پورے پورے اختیارات حاصل تھے آج کل کی طرح اس زمانے میں معمولی دیوانی یا فوجداری کے مقدمات طے کرنے میں کوئی بیرونی مداخلت نہ کی جاتی تھی۔

اسلامی دور میں بھی مطالبات کی وصولیابی کے سوا مرکزی حکومت نے گاؤں کو کم و بیش ان کی حالت پر چھوڑ دیا تھا۔ جب تک سرکاری مطالبات باقاعدہ ادا ہوتے رہتے مغل بادشاہ گاؤں کے مقامی نظم و نسق میں دخل نہ دیتے تھے۔ اس لئے گاؤں کا قدیم جماعتی نظام اور نظم و نسق بدستور قائم رہا۔ ہندو رسم و رواج اسلامی دور میں بھی اسی طرح جاری رہے۔ اور رعایا کو وہی حقوق اور مراعات حاصل رہیں غرضکہ مسلمان حکمرانوں نے قدیم سماجی روایات کو بدلنے کی کوشش نہ کی۔ انھیں تو عموماً حکومت اور خراج سے تعلق تھا۔ ممکن ہے بعض بیرونی حملہ آور رعایا کا مال و دولت اپنے ملک میں لے گئے ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب وہ اپنی حکومت یہاں قائم کر لیتے تھے تو یہیں کے لوگوں میں مل جاتے تھے۔ اور بڑی حد تک یہیں کی زبان اور یہیں کے رسم و رواج اختیار کر لیتے تھے۔

وہ ان کی شادی و غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے اور صرف ایک مذہب کے اختلاف کے علاوہ ہر طرح یہاں کے باشندوں کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتے تھے۔ ہندوستان اسلامی دور میں مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں اقتصادی تباہی اور نفع بازی کا شکار نہیں ہوا ان کی سرپرستی میں تمام فنون اور تجارتیں سرسبز تھیں۔ اپنے طور پر وہ کوشش کرتے تھے کہ ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دیں۔ بعض نے حکومت کی تنظیم کرنے اور اسے معقول اصولوں پر ترتیب دینے کی کوشش بھی کی۔ یہاں ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم اسلامی حکومت کے محاسن بیان کریں۔ نہ ہم اسلامی دور کا موجودہ طرز حکومت سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک خالص اقتصادی تصنیف سے اس قسم کی سیاسیات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا مقصد صرف واقعات بیان کرنا ہے۔ تاکہ اقتصادی تنزل کے اسباب کا صحیح طریقہ پر مطالعہ کیا جا سکے۔

انگریز اس ملک میں تاجر کی حیثیت سے آئے۔ ان کا خاص مقصد یہ تھا کہ اس ملک سے درآمد برآمد کا سلسلہ قائم کریں اور اس تجارت سے نفع اٹھائیں۔ روپیہ اور صرف روپیہ انھیں ہندوستان کی سرزمین تک کھینچ کر لایا تھا۔ اس وسیع براعظم کے باشندوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بحیثیت تاجر کے انھوں نے یہاں کے عمال و امرا میں رسوخ پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ اسلامی حکومت اس وقت دم توڑ رہی تھی۔ مرکزی اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ اور مخالف قوتیں اسے منتشر کرنے کے لئے مجتمع ہو رہی تھیں۔ جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کو دیہات سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ بجز اس کے کہ خراج کے طور پر پیداوار کا اپنا مقررہ حصہ وصول کر لیں۔ اس لئے یہ خراج چاہے براہ راست وصول ہوتی یا کسی ذریعے سے ان کے لئے یکساں تھا۔ انھوں نے اپنا یہ حق انگریز تاجروں

کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح بعض علاقوں میں دوعملی کا دور شروع ہوگیا۔ ان غیر ملکی مستاجروں نے طرح طرح سے زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کی کوشش کی اور ذرا بھی پروانہ کی کہ اس کا اثر غریب رعایا پر کیا پڑے گا۔ اپنے مفاد کے خیال سے انھوں نے ہر قسم کے دیہاتی نظام کی مخالفت کی کیونکہ تجارتی مقاصد کے لئے جماعتوں کی موجودگی میں ان کا پورا قبضہ نہ ہو سکتا تھا۔

"برطانوی ہند میں دیہی حکومت" کے مصنف تحریر فرماتے ہیں[1]:- "ظاہر ہے کہ شروع ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران میں پنچایتوں کے خلاف ایک جذبہ موجود تھا۔" یہ رقابت لازمی تھی۔ کیونکہ انگریز قوم کا مفاد اسی میں مضمر تھا۔ آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ حاکم و تاجر کی ایک معجون مرکب تیار ہوگئی۔ فطرتاً وہ تاجر تھے اور ان کے ہر عمل اور ہر فعل میں روپیہ کمانے کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ انھوں نے خواہ لڑائیاں لڑیں یا جائدادیں لیں یا ملک کے بعض حصوں میں شاہی اختیارات حاصل کئے۔ سب کچھ صرف روپیہ پیدا کرنے کے لئے کیا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ان طریقوں سے ان کی تجارت کو فروغ اور آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ ایک ہندوستانی کہاوت ہے۔ "بنیا حاکم بغضب خدا" یعنی اگر تاجر حکمران ہو جائے تو سخت مصیبت اور تباہی کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک حاکم کا مفاد تاجر سے بالکل جدا ہے۔ تاجر تو محض نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن حاکم کا فرض رعایا کی حفاظت کرنا ہے۔ نفع طلبی اور حفاظت دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان کا کبھی ساتھ نہیں ہو سکتا اور اگر نفع کا طالب خود حاکم بھی ہو جائے تو پھر

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶۷۔

رعایا کی کون حفاظت کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقتصادی لوٹ ہی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت ہندوستان کی بھی یہی درگت ہوئی۔

اس زمانے میں اور اس سے کچھ عرصے قبل گاؤں والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی زمانہ دیہاتی نظام کے انتشار کا زمانہ تھا۔ انگریز تاجر نہ ہماری زبان جانتے تھے اور نہ ہماری رسم و رواج سے واقف تھے۔ جب عنان حکومت ان کے ہاتھ میں آئی تو وہ اپنے آپ کو بالاتر ہستی سمجھنے لگے۔ اس لئے لوگوں میں ملتے جلتے بھی نہ تھے۔ آج بھی وہ بے تکلفی سے نہیں ملتے اور نہ ہماری شادی غمی میں شریک ہوتے ہیں۔ انھوں نے ملک کے باشندوں کو۔ ان کے رسم و رواج کو، یا ان کی تہذیب کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کی ۱۸۵۷ء کے بعد بھی جب کہ حکومت برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ حالات بدستور رہے اور اس وقت بھی حاکم و محکوم کے درمیان کوئی براہ راست تعلق قائم نہ کیا گیا۔

برطانوی حکومت کی کامیابی کا راز

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ میں انگریزوں کی خود انکاری اور اپنے ملک کی خاطر قربانیوں کی کافی مثالیں ملیں گی۔ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلق کے ابتدائی زمانے میں سر تھامس رو کی نذیر موجود ہے۔ انھوں نے ۱۶۱۵ء میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی قوم کے لئے شہنشاہ سے تجارتی حقوق عطا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اسی طرح انگریزوں نے اس ملک میں کبھی اپنی ذات یا اپنی نسل کے لئے کوئی حقوق طلب نہیں کئے بلکہ ہمیشہ سچے محب وطن کی طرح انھوں نے جو کچھ کیا وہ انگلستان اور صرف انگلستان

کے لئے ۔ لارڈ کلایو نے بھی جب تلوار ہاتھ میں لی اور اپنی جان پر کھیل کر متعدد لڑائیاں لڑیں تو اس کے پیش نظر صرف یہی چیز تھی کہ اس کا ملک دولت مند ہو اور دشمنوں کے مقابلے میں اس کی قوت میں اضافہ ہو۔ پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے کسی وائسرائے یا گورنر جنرل نے غیر محدود اختیارات رکھنے کے باوجود کبھی حکومت کو غصب نہیں کیا۔ اگرچہ فوج اور حکومت کے دوسرے شعبوں پر براہ راست ان کا پورا قبضہ تھا مگر ہمیشہ وہ اپنے ملک کے وفادار رہے ان کی وطن پرستی اور وفاداری کے مقابلے میں مسلمان صوبہ داروں کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ جہاں ذرا بھی موقع ملا اُن میں سے تقریباً ہر ایک نے بغاوت کی۔ اس بدقسمت ملک کے لوگوں میں وطن پرستی کا جذبہ ابھی مفقود ہے اور بڑے سے بڑے شخص کو ملک کے ساتھ غداری کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے انگریزوں کی برتر شیر کی اس خوبی نے فطرتاً ان کے ذہن میں ایک برتری کا جذبہ پیدا کر دیا اور وہ اس ملک کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ وہ ہندوستانیوں کو اعتماد کے عہدوں کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے جب باضابطہ حکومت قائم ہوئی تو تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں کو دے دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں ایک ہندو کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکے۔ وہ فوج کا کمانڈر انچیف بھی ہو سکتا تھا۔ اور صوبے کا اعلیٰ ترین حاکم بھی۔ مرہٹہ سردار شیواجی بھی ایک مسلمان کو جرنل بنا سکتا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت میں کوئی ہندوستانی ان عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے اس کی تہ میں یہ خیال کام کر رہا ہو کہ اپنے ہم وطنوں کو فائدہ پہنچے۔ یا پھر انگریزوں نے یہ ضروری سمجھا ہو کہ اہم عہدے اپنے ہی قبضے میں رکھے جائیں تاکہ حکومت کے سربستہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں یا ایک تیسری وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ

انگریزوں نے ہندوستانیوں کی ماتحتی میں کام کرنا پسند نہ کیا ہو۔ بہرحال اس وقت ہمیں یہ طے کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اصل سبب کیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ فوج اور دوسرے محکموں میں ہندوستانی افسر مقرر کرنے کے لمبے چوڑے وعدے آج بھی پورے نہیں ہوئے ہیں یا اگر ہوئے ہیں تو محض جزوی طریقے پر۔ ریلوے بورڈ تو ایک تجارتی محکمہ ہے۔ لیکن اس کے 'مقدس' حدود میں بھی ہندوستانیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

ڈیڑھ صدی سے زیادہ گذرنے کے باوجود انگریز اب بھی ہندوستانی زبانوں پر عبور حاصل نہیں کر سکے ہیں اور نہ انھوں نے کبھی اس کی پروا کی۔ انگریزوں کو ہمیشہ ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اور اگر کبھی وہ ملنے جلنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کی حرکات و سکنات سے کشیدگی اور برتری کا جذبہ ٹپکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ ہندوستانیوں نے ان کے لباس اور خارجی معاملات کی نقل کی لیکن انگریزی کیرکٹر کی خوبیوں سے استفادہ نہیں کر سکے۔

تنخواہوں اور پنشنوں کی صورت میں ہندوستان کا بہت کافی روپیہ ملک کے باہر چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کو سب سے بڑا اور اہم نقصان یہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کو جو معلومات اور تجربہ یہاں کے قیام کے دوران میں حاصل ہوتا ہے ان سے بعد کو وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ انگلستان مستفید ہوتا ہے۔ اور پنشن ہندوستان سے دلوائی جاتی ہے۔

حکومت نے تعلیم پر اپنا پورا قبضہ رکھا ہے وہ اپنے قائم کردہ یا منظور شدہ اسکول اور کالجوں کے لئے مضامین اور کتابیں خود طے کرتی ہے۔ پھر ذریعۂ تعلیم سراسر

انگریزی زبان ہے۔ حتیٰ کہ قدیم اور دیسی زبانیں بھی انگریزی ہی کی مدد سے پڑھائی جاتی ہیں۔ اسکول اور کالج بیشتر تعلیم انگریزی کے ذریعے دیتے ہیں صنعت و حرفت سائنس اور فنون کی کتابیں انگریزی ہی میں ملتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبانیں متروک ہو گئیں۔ اور اس سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ذہنیت پر بڑا مہلک اثر پڑا۔ انھوں نے نہ صرف انگریزی لباس اختیار کر لیا بلکہ انگریزی تخیل سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ ہر ہندوستانی چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ چونکہ خود اپنی تہذیب سے ناواقف ہیں اس لئے وہ اجنبیوں سے زیادہ اجنبی ہو گئے ہیں۔ ان کی نظر میں ہندوستانی لباس۔ ہندوستانی رسم و رواج اور ہندوستانی تہذیب سب حقیر ہیں۔ انگریز افسر عموماً ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی کو ہندوستانی لباس پہنے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اور یہی خیال اپنے ماتحتوں کے ذہن نشین کرتے ہیں۔ انگریزوں نے ہمارے ملک میں ہر انگریزی چیز رائج کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستانی اپنے وطن میں اجنبی معلوم ہوتا ہے۔

سر ہنری۔ ایس۔ مین نے بھی اپنی مشہور کتاب موسومہ "مشرق اور مغرب کی دیہاتی اقوام" میں اس چیز کو تسلیم کیا ہے[۵۱]۔ وہ فرماتے ہیں "مجھے ایک ہندوستانی صوبے میں تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی کیفیات کے مطالعہ کرنے کا خاص موقعہ ملا۔ یورپین اثرات ان پر اتنے حاوی ہو گئے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی انھیں ملکی سماج کا صحیح نمونہ سمجھنا غلطی ہے۔ یہی خیالات ان اثرات کا منبع ہیں جو کم و بیش ہر جگہ کام کر رہے ہیں

---

۵۱ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵

یہاں خیالات میں، علم و ادب میں، مذاق میں، اخلاق میں اور قانون میں غرضکہ ہر چیز میں قطعی انقلاب ہو گیا ہے۔ اس کا مقابلہ مغربی دنیا کے صرف اس دور سے کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ علم کا اعادہ ہوا تھا اور لوگوں میں یونانی اور رومی ادب پڑھنے کا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ صحیح تقابل نہیں ہے کیونکہ یہاں کی بہت سی چیزیں جو اپنے اندر ایک خاص شان اور عظمت رکھتی تھیں ترک کی جا رہی ہیں۔ اور ان کے بجائے ذلیل اور ناکارہ چیزیں اختیار کی جا رہی ہیں۔

انگریزوں نے عمداً یا اتفاقاً اپنی تہذیب کو ترقی دینے کے جوش میں پنچایت کے اقتدار کو کم کیا۔ عدل و انصاف کرنے کے اپنے طریقے رائج کئے۔ آج پنچایت کو مقدمات طے کرنے کے لئے ملک کے قانون کی تائید حاصل نہیں ہے۔ عدالت کی امداد کے بغیر وہ دیوانی کے معاملات بھی طے نہیں کر سکتی ہے۔ اور اگر کرے بھی تو اس کے احکام کی کون تعمیل کرے گا۔ کیوں کہ اب وہ تائید باقی نہیں رہی ہے۔ اگر پنچایت کا حکم نہ ماننے والوں کو برادری باہر کرنے کا پرانا طریقہ اختیار کریں تو پنچ بیچارے عدالت میں کھینچ کھینچ پھرتے ہیں۔ اور تاوان دینا پڑتا ہے۔ فوجداری کے معاملات میں جو قابل دست اندازی پولیس ہیں۔ انھیں ذرا بھی دخل دینے کا حق نہیں ہے اور اگر وہ ایسا کریں تو الٹا ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے پنچایت کے اختیارات جب اس طرح چھین لئے گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے ارکان بھی خود بخود بیکار ہو جائیں گے۔

دورِ جدید میں مکھیا کی کیفیت

موجودہ حکومت نے بھی ہر گاؤں میں ایک مکھیا ایک پٹواری اور ایک چوکیدار

مقرر کرنے کا طریقہ جاری رکھا ہے گویا حکومت کو ان اہلکاروں کا کارآمد ہونا تسلیم ہے لیکن دیہی نظام میں جس اعلیٰ مقصد کے لئے یہ لوگ مقرر کئے جاتے تھے اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ مکھیا اب عوام کا خادم نہیں ہوتا اور نہ عوام خود اسے منتخب کرتے ہیں عموماً پولیس اس کا نام تجویز کرتی ہے اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ اس کا تقرر کرتا ہے جو لوگ پولیس میں مخبری کیا کرتے ہیں یا پولیس کی امداد سے علاقے پر اپنا اثر جمانا چاہتے ہیں یا اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں انھیں کے نام تجویز کئے جاتے ہیں۔ شریف اور دیانت دار لوگ مکھیا بننے سے بچتے ہیں۔ کیوں کہ گاؤں میں کوئی واردات ہونے کی صورت میں مکھیا کو جس پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اس سے یہ لوگ سبق حاصل کرتے ہیں۔ پولیس کے کارکن کی حیثیت سے مکھیا کے متعلق یو پی پولیس رپورٹ سنہ ۱۹۱۰ء کے ضمیمہ میں حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے "گاؤں کے مکھیا کو ضلع کا افسر جیسا چاہے بنا سکتا ہے گویا اس نظام کی کامیابی یا ناکامی ان افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اچھا مکھیا عوام اور پولیس کے درمیان ایک کارآمد ضروری کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پولیس کو وہ امداد پہنچا سکتا ہے اور عوام کا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ اس کی مدد سے دیہات میں پولیس اپنے فرائض زیادہ خوبی اور ایمانداری سے ادا کر سکتی ہے۔ وہ تمام بدظنی دور کر سکتا ہے۔ اور غلط فہمیاں رفع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ برا ہو تو برے سے برے پولیس والوں سے بھی بازی لے جاتا ہے" اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ گاؤں کی بہبودی کا انتظام کرے۔ یا جھگڑے قضیے آپس میں سہولت سے طے کرائے۔ اس کا سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ گاؤں میں جو واقعہ ہو فوراً پولیس کو اطلاع کرے "برطانوی ہند میں دیہی حکومت" کے مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے

کہ[1] "مکھیا اب تو عوام کا نمائندہ ہونے کے بجائے زیادہ تر حکومت کا نمائندہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور پنچایت کے موجودہ قانون کی رو سے اسے جو وسیع اختیارات حاصل ہیں اس کی وجہ سے لوگ اس ادارے کی جمہوری حیثیت کو تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں"

چوکی دار

چوکیدار سرکاری خزانے سے مقررہ تنخواہ پاتا ہے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے اب اس کی تنخواہ ۴/۱ کر دی گئی ہے۔ اب اسے پہلے کی طرح نہ تو مفت زمین ملتی ہے اور نہ پیداوار میں سے حصہ ملتا ہے۔ اب اسے یہ قطعی احساس نہیں ہوتا کہ اگر گاؤں میں ڈکیتی یا چوری ہو جائے تو اس کا وہ ذمہ دار ہوگا۔ پہلے زمانے میں جو چوری سے نقصان ہوتا تھا۔ وہ اُسے بھرنا پڑتا تھا اس وجہ سے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کبھی غفلت نہ کرتا تھا۔ اور ہمیشہ ہوشیار رہتا تھا۔ لیکن اب حکومت کا خیال ہے کہ چوری یا ڈکیتی کے معاملے میں حکومت کا فرض یہیں ختم ہو جاتا ہے کہ وہ ملزم کا پتہ لگائے اور اس کی گرفتاری اور سزایابی کی کوشش کرے اب چوکیدار یا پولیس افسر اس نقصان کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاتا۔ جو اس کی غفلت سے رعایا کو برداشت کرنا پڑے۔ اب اس پرانے اصول کی معقولیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ اگر رعایا کے کسی فرد کی کوئی چیز چوری جائے تو حکومت کو اسے پورا کرنا چاہیے۔ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو پولیس میں ملازمت کرنے کو شاید کوئی بھی تیار نہ ہوتا چوکیدار کو پولیس اور عوام کے درمیان

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۲

تعلق پیدا کرنے کی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ مانا کہ اسے خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام کے سامنے اب وہ اپنے آپ کو قطعاً جواب دہ نہیں سمجھتا۔ قانونی اصطلاح میں تو وہ عوام کا ملازم ضرور ہے لیکن درحقیقت وہ پولیس کا آلہ کار ہے۔

دورِ جدید کا پٹواری

پٹواری کے سپرد اب بھی دیہی کاغذات ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب اندراجات زیادہ بہتر اور زیادہ باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی عوام کا خادم نہیں رہا ایک پٹواری تو گاؤں والوں کے لئے اور مصیبت کا سامان بن جاتا ہے۔ گاؤں والے اب اسے تنخواہ نہیں دیتے ہیں۔ اس لئے اس پر ان کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے۔ دیوانی کی عدالتوں میں اس کی شہادت بہت وقیع سمجھی جاتی ہے۔ غریب بے پڑھا کسان یہ نہیں جانتا کہ آیا کاغذات میں اس کی زمین اس کے نام پر صحیح طور پر درج ہے یا نہیں پٹواری کے قلم کی ایک جنبش سے ان زمینوں کا لگان اس سے وصول کیا جا سکتا ہے جنھیں اس نے کبھی کاشت نہیں کیا۔ یا ان زمینوں کے موروثی حق سے محروم کیا جا سکتا ہے جنھیں وہ پشتہا پشت سے کاشت کرتا رہا ہو۔ قانوناً کسان کو دیہی کاغذات کی نقل مل سکتی ہے۔ لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ روپیے کے بغیر یہ چیز بہت ہی مشکل ہے۔ ممالک متحدہ میں حکومت نے شاید یہ سمجھ کر کہ اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اب قانوناً اسے جائز قرار دے دیا ہے۔ یعنی دیہی کاغذات کی نقل کے لئے پٹواری کی فیس چار آنے مقرر کر دی ہے۔ لیکن پٹواری بھلا جب تک ایک روپیہ نہ رکھوا لے کب ماننے والا ہے۔

اس طرح دیہاتی نظام بالکل تباہ ہو گیا ہے اور اس کے کارکن سرکاری مکاروں

کے زمرے میں شامل کرلئے گئے ہیں غرضکہ سارے اختیارات حکومت ہی کے ہاتھ میں ہیں اور ساری قوت وہیں مرکوز ہے۔ بزرگوں کی عزت اور ان کا اثر اب بالکل ضائع ہوگیا ہے۔

عدالتیں

۱۸۷۴ء میں مسٹر جیمس کیرڈ ہندوستانی قحط کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے انگلستان سے یہاں تشریف لائے تھے۔ واپسی پر انھوں نے ہندوستانی کسانوں کے افلاس اور اس کے اسباب پر لارڈ سالسبری کی خدمت میں ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ انھوں نے یہ قطعی رائے ظاہر کی تھی کہ دیہاتی نظام کا تنزل اس تباہی کا ایک خاص سبب ہے آج کل تمام جھگڑوں اور مقدموں کا فیصلہ صرف عدالت کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ مختلف ضابطے اور قانون اور عدالتوں کے فیصلے سب انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں اس لئے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے حقوق کیا ہیں۔ اور دادرسی کیسے ہوسکتی ہے اگر وہ دادرسی کے لئے عدالت میں جائیں تو انھیں بہت زیادہ کورٹ فیس دینا پڑتی ہے بعض صورتوں میں تو یہ ناقابل برداشت ہوتی ہے اگر وہ کسی نہ کسی طرح کورٹ فیس کا انتظام کر بھی لیں تو وہ عدالت میں براہِ راست نہیں پہنچ سکتے۔ انصاف حاصل کرنے کے لئے ایک وکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تکلیف دہ قانونی طول عمل کے بعد اگر فیصلہ ان کے حق میں ہو بھی جائے تو اپیل ہوسکتی ہے۔ اور عدالت بالا اسی شہادت کی بنا پر عدالت ماتحت کے فیصلے کو منسوخ کرسکتی ہے اس کے بعد اس غریب کو معلوم ہوتا ہے کہ ہائی کورٹ اور پریوی کونسل بھی موجود ہے۔ بالآخر وہ بدنصیب اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جس کے پاس

زیادہ روپیہ ہو وہی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

شاہی زراعتی کمیشن کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ہندوستانی عدالتوں میں سچ بولنے کا زیادہ پاس نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۱۲ء کے قحط کمیشن کی رپورٹ کا اقتباس پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "یہ تو گویا آپس کی بے ایمانیوں کا ایک مقابلہ ہے اس میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ جھوٹ بول سکے اور زیادہ سے زیادہ غلط شہادتیں بہم پہنچا کے گواہ پر گواہ اس اخلاقی پستی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ بے اعتمادی دونوں جانب کام کرتی ہے ایمان دار ساہوکار اور ایمان دار کسان دونوں نقصان اُٹھاتے ہیں۔ اس لئے مجبوراً اپنے معاملات میں انھیں عدالت کے فیصلے کی گنجائش رکھنا پڑتی ہے۔ کیوں کہ وہ دونوں کو بے ایمان تصور کرتی ہے"۔

حکومت کے اعلیٰ افسروں کی تنخواہیں اور کورٹ فیس بھی لوگوں کے افلاس کا خاص سبب ہیں۔ ان میں مالگذاری کو اور شامل کیجئے۔ جو ہر تیس سال کے بعد بڑھتی جاتی ہے پہلے زمانے میں ہر کاشتکار پیداوار کا کچھ حصہ حکومت کو دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح جو کچھ جمع ہوتا تھا وہ آج کل سے نسبتاً بہت زیادہ ہوتا تھا۔ حکومت نے ۱۹۰۲ء کے اپنے مشہور اعلان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلامی حکومت کے مقابلے میں آج کل مالگذاری بہت ہی کم ہے۔ لیکن حکومت بڑی آسانی سے یہ بات بھول جاتی ہے کہ اس زمانے میں دادخواہ سے انصاف کی قیمت نہ لی جاتی تھی اس کے علاوہ لوگوں کو بے شمار ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے تھے زمین کے بڑے بڑے رقبے چراگاہ کے لئے چھوڑ دئے جاتے تھے۔ اور گاؤں کے کارکنوں کو ان کی خدمت کے عوض میں زمین مفت دی جاتی تھی۔ سرکاری مطالبہ ہمیشہ پیداوار کی نسبت سے مقرر کیا جاتا تھا۔ اور وہ

نقدی کی صورت میں وصول نہ کیا جاتا تھا

زمیندار

پرانے زمانے میں زمین سارے گاؤں کی ملکیت ہوتی تھی۔ کسی کی ذاتی جائداد نہ ہوتی تھی۔ لیکن آج وہ زمیندار جو اسلامی حکومت میں صرف ٹیکس جمع کرنے والے تھے اکثر صورتوں میں زمین کے مالک بنا دئے گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عام طور پر انتہا سے زیادہ لگان بڑھ رہا ہے زمیندار چاہتا ہے کہ کسان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ چھوڑے اور اس سے ایک ایک پائی رکھوالے کسادبازاری کی پچھلی دو سالوں کے علاوہ زمیندار ہمیشہ ایک کاشتکار کے مقابلے پر دوسرے کو کھڑا کر کے لگان بڑھاتا رہا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کسان کے لئے کاشتکاری کے سوا اور کوئی پیشہ ہی نہیں ہے اس لئے وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ حکومت بھی اس اضافہ لگان سے مستفید ہوتی ہے کیونکہ ہر بندوبست کے موقع پر یہ اضافہ جمع بندی میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہر بندوبست کے بعد لگان اور بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں کسی سے بھی اس طرح لگان وصول نہ کیا جاتا تھا۔ ہر کاشتکار سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد اپنی پیداوار کا مالک ہوتا تھا۔ پنچایت کو اب کوئی حق نہیں ہے کہ کسی زمین کو مشترکہ قرار دے۔ زمین کے ایک ایک ٹکڑے پر عموماً مالگذاری لی جاتی ہے خواہ وہ کسی مندر، مسجد یا کسی دوسرے ادارے کے لئے وقف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مجبوراً ایک انچ زمین بھی غیر مزروعہ نہیں چھوڑتے۔ اس لئے اب چراگاہیں باقی نہیں رہیں۔ صرف بنجر ٹکڑے رہ گئے ہیں، وہ بھی اس لئے نہیں کہ لوگ انھیں خوشی سے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ان میں کچھ

پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ دودھ دینے والے مویشی بھوکوں مر رہے ہیں اور اچھی گائے بھینسوں کی نسل برباد ہو رہی ہے۔ چونکہ ملک کی زیادہ آبادی گوشت نہیں کھاتی ہے اور دودھ گھی کی بھی کمی ہے۔ اس لئے قوت جسمانی کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بچوں کی اموات میں ہر جگہ اضافہ ہو رہا ہے اور مضبوط، تندرست اور طاقتور نوجوانوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔

انگریز یہاں تاجر کی حیثیت سے آئے اور انھوں نے اپنے ملک کی خوش حالی کو سب سے مقدم رکھا۔ سائنس کی ایجادیں اور روزانہ کے استعمال کی چیزیں تیار کرنے کے لئے محنت اور وقت بچانے والی مشینیں ہندوستان کی گھریلو صنعت کے لئے برکت کے بجائے لعنت ثابت ہوئیں۔ ایک ایک کر کے تمام دستکاریاں تباہ ہو گئیں۔ اور لاکھوں کاریگر بیکار ہو گئے۔ مجبوراً وہ کھیتوں پر مزدوری کرنے لگے یا چھوٹی چھوٹی زمینیں کاشت کرنے لگے۔ صدیوں کا ہنر اس طرح فنا ہو گیا۔ وہ ہاتھ جو کسی زمانے میں ایسی ایسی نفیس اور نازک چیزیں تیار کرتے تھے کہ انھیں دیکھ کر بیرونی کاریگر دنگ رہ جاتے تھے۔ رشک کرتے تھے لیکن نقل نہ کر سکتے تھے۔ آج جہاں دیکھئے کھیتوں پر، ریلوے لائن پر۔ نہروں کے کنارے۔ انہی ہاتھوں میں کھرپی اور پھاوڑا نظر آتا ہے۔

ہندوستانی کاریگری کی نفیس اور عمدہ چیزوں کی جگہ اب بھڑکیلی چیزیں رائج ہیں۔ ناکارہ بدیسی چیزوں سے بازار بھرا پڑا ہے۔ اور ہندوستانیوں کی جیب سے کروڑوں روپیہ نکل رہا ہے۔ موٹر کار، لاریاں، سنما۔ ریڈیو، ہندوستان کا لاکھوں روپیہ ہضم کئے جا رہے ہیں۔ افسوس۔ جو مالی تباہی ہندوستان پر آئی

دنیا کے پردے پر اس کی نظیر نہیں مل سکتی مشین کی بنی ہوئی سستی بدیشی چیزیں ایک دیہاتی کے گھر پر پہنچ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کاریگروں کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ کسان کی عورت اب نہ کپاس اوٹتی ہے اور نہ روئی کاتتی ہے جولاہے کا کرگھا بھی بند ہوگیا۔ گاؤں کے نظام میں اب تیلی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ مٹی کا تیل تو اب قریب ترین بازار میں مل جاتا ہے۔ چمار کے بنائے ہوئے بھدے اور مضبوط جوتے اب کوئی کیوں پہنے۔ سستے اور نظر فریب بدیشی جوتوں نے انھیں بازار سے نکال دیا ہے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی اب ان خوب صورت اور سلیم شاہی جوتیوں کو جن پر پھول پتی کا سچا کام ہوتا تھا نہیں پوچھتے۔ اب تو وہ ولایتی کمپ شو پہننا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مٹی کے برتنوں کی جگہ اب ولائتی چینی کے برتن استعمال ہوتے ہیں یا دھات کے برتن جن کی چادریں باہر سے آتی ہیں۔ بیکاری کے زمانے میں جو تھوڑی بہت آمدنی کمہار کے پرگاڑیاں چلا کر ہو جاتی تھی۔ تیز رفتار لاریوں نے اسے بھی بند کر دیا مختصر یہ کہ ہر کاریگر بیکار ہوگیا ہے آج اس کے ہنر کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ کسان بھی مجبور ہے کہ صرف اتنی ہی چیز پیدا کرے جتنی باہر بھیجی جا سکتی ہے۔ خام پیداوار مثلاً اناج، دالیں، تل، وغیرہ عموماً بلا محصول باہر بھیجے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر آٹا یا تیل بھیجا جائے تو ان پر دوسرے ملکوں میں بھاری محصول لگتا ہے۔ مکھن، پنیر اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں ہندوستانی بازار میں اس لئے فروخت نہیں کی جا سکتیں کہ ان میں سور کی چربی اور تیل آزادی سے ملایا جاتا ہے عام طور پر آمیزش کو روکنے کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ اور جہاں کہیں ہے تو ناکافی اور بیکار ہے۔ اس طرح سے ہمارا لوگ بے روزگار ہوگئے۔ اور سارا بار زمین پر آ پڑا۔ کسی دوسری جگہ ہم نے ایک گوشوارہ

دیا ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ ہندوستان میں زراعت پر بسر کرنے والی آبادی میں۔
روزانہ اضافہ ہورہا ہی۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں برابر کمی ہورہی ہی۔

مہاجن

مہاجن کو جو سماج کی بنیاد سمجھا جاتا تھا اب لوگوں کی نیک نیتی پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ انفرادی حقوق اس کے ذہن نشیں کرادیے گئے ہیں۔ اور معاہدہ کے تقدس کے نام سے عدالت نے اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا ہی جسے وہ حسب مرضی استعمال کرکے بدقسمت قرض داروں کو تباہ کرسکتا ہی ۱۸۸۰ء میں فحط کمیشن نے لکھا تھا[۵۱] "عدالت دیوانی نے ایسے معاہدوں کی بنیاد ڈالی ہے جن کی بدولت نوعیت ایک طرفہ ایک فریق کی بے انتہا کمزوری اور دوسرے فریق کی غیر محتاط چیرہ دستیوں کی باعث ہے۔ ان معاہدوں میں قانون کے الفاظ کی زیادہ پابندی کی جاتی ہے۔ اور معاملے کی اصلیت اور فریقین کے حالات کا کم لحاظ رکھا جاتا ہی۔ وہ مقامی رسم ورواج اب ختم ہوچکے ہیں جو معاہدوں کی سخت گیری کو کم کردیتے تھے۔ اور سود وغیرہ کی روک تھام رکھتے تھے۔ سخت اور پیچیدہ قانون زیادہ دولت اور اچھے وکیل رکھنے والوں کے ہاتھ میں ظلم وتشدد کا ایک نیا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔"
آگے وہ فرماتے ہیں کہ[۵۲] "ہمارے نزدیک یہ چیز قابل لحاظ ہی کہ ایسے معاملات میں جو کسان کی روزانہ زندگی میں داخل نہیں ہیں اور جن کا وہ ذاتی تجربہ نہیں رکھتے قانون اور ضابطہ کو

---

۵۱ ملاحظہ ہو پریگراف صفحہ ۱۳۲ ۵۲ ملاحظہ ہو پریگراف صفحہ ۱۳۴

ان کا کافی تحفظ کرنا چاہیئے ۔ ان لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر چیز کا وعدہ کر لیتے ہیں اور آیندہ کے لئے ہر شرط منظور کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ بشرطیکہ وقتی طور پر ان کی مشکل حل ہوتی ہو ۔ چنانچہ ان ہی صورتوں میں ہندوستانی عدالتیں ان کا کافی تحفظ کرنے میں ناکام ہیں" بہت سی کمیٹیوں اور کمیشنوں نے کسانوں کی بہبودی کی خاطر زیادہ آسان اور سادے قانون دیوالیہ کے رواج دینے کی تجویز پیش کی ہے ۔ لیکن ابھی اس بارہ میں کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے اور نہ آئندہ کچھ ہونے کی امید ہو سکتی ہے ۔

اس طرح گویا گاؤں کے جماعتی نظام اور ملک کے رسم و رواج میں انقلاب ہو گیا ہے جس سے غریب کاشتکاروں کی مالی اور سماجی دونوں حیثیتوں پر اثر پڑا ہے ۔ ایگاؤں کی صفائی اور دوسرے مفید کاموں کے لئے کوئی بھی ذمہ دار نہیں ہے ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اس طرح ترتیب دے گئے ہیں کہ یا تو وہ بے دست و پا ہیں ۔ یا ان اہم کاموں کے انجام دینے کے لئے ان کے پاس روپیہ ہی نہیں ہے ۔

پرانا طریقۂ تعلیم بھی بالکل فنا ہو گیا ہے ۔ اب وہ برہمن پنڈت موجود نہیں ہیں جو ملک کے بچوں کو تعلیم دینا باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اگر ایسے لوگ کچھ ہیں بھی جو قدیم مسلک پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ یا فاقے مرتے ہیں یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی دی ہوئی بخشش پر برے حالوں گذر کرتے ہیں اور اگر ان کا طریقۂ تعلیم سرکاری ٹیکسٹ بک کمیٹی کے مجوزہ نصاب کے مطابق نہیں ہوتا ہے تو یہ ذرا سی امداد بھی منسوخ کر دی جاتی ہے ۔ حکومت پرانے نظامِ تعلیم کے بجائے اب تک کوئی ایسا معقول نظام تجویز نہیں کر سکی ہے جس سے تعلیم عام اور لازمی ہو جائے ۔

باب ششم

کیا ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے

یہ خیال ہمارے ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت نے ہندوستان کو اسی لئے بنایا ہے کہ وہ خام اشیا پیدا کرکے دوسرے ملکوں کو بھیجا کرے اور اس کے بدلے میں تیار شدہ سامان منگوایا کرے یہ عقیدہ متواتر ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے اتنا ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ ان میں سے اکثر اس پر یقین کرنے لگے ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اس کی تردید کرے تو بڑے شد و مد کے ساتھ اس کی حمایت کرتے ہیں ہندوستان کے افلاس کے متعلق تعلیم یافتہ طبقے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ عقیدہ بھی بڑی حد تک اس کا ذمہ وار ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے خصوصاً اس وجہ سے کہ سرکاری رپورٹوں میں، اخباروں میں اور تحریر و تقریر میں اس کی پرزور حمایت کی جاتی ہے۔ حتی الامکان اس بحث کے دوران میں اختلافی چیزوں سے ہم گریز کریں گے۔ کتاب موسومہ "حکومت اور صنعت و حرفت" کے مصنف نے بہت صحیح لکھا ہے کہ مغربی ممالک گرم ملکوں سے خام پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک ممکن ہوگا وہ لازمی طور پر یہی کوشش کرتے رہیں گے وہ لکھتے ہیں کہ "ان ملکوں سے خام پیداوار اور خوردنی اشیا کثیر تعداد میں سمیٹنا اصولاً نامناسب ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہماری یہ حرکت وہاں کے

باشندوں کو ایک حد تک غلام بنانے اور ان پر بیجا تصرف کرنے کے مترادف ہو لیکن ہم ماضی کے پابند ہیں کسی ملک کا رویہ فوراً تبدیل نہیں کیا سکتا اور شاید کبھی تبدیل نہ کیا جا سکے" آگے انھوں نے بیان کیا ہے کہ حصول مقصد کے لئے کیا کیا صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔ ذیل میں ہم خود مصنف کے الفاظ درج کرتے ہیں اپنے دعوے کی تائید میں انھوں نے پارلیمنٹ کے ایک ممبر کا مقولہ پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "مسٹر چیمبرلین کا عقیدہ تھا کہ ان ملکوں کے باشندوں سے ان ہی کے نفع کی خاطر کام کرانا چاہیئے دار العوام میں ایک تقریر کے دوران میں انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک مزدوری کی اہمیت ان کے ذہن نشین نہ کرائی جائے۔ اور اس کا سب سے کامیاب ذریعہ یہی ہے کہ سب سے پہلے تو ان سے وہ سب زمین لے لی جائے جس پر وہ گذر کرتے ہیں پھر اتنا تھوڑا حصہ ان کو دیا جائے جس سے صرف چند آدمیوں کا بڑی تنگی سے گذارہ ہو سکے۔ اس کے بعد ان پر اتنا محصول لگایا جائے جو بغیر مزدوری کئے ہوئے ادا نہ ہو سکے"۔

اس اقتباس پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ الفاظ خود منہ سے بول رہے ہیں۔ مصنف مذکور اس پر لکھتا ہے کہ "یہ دلیل کوئی نئی نہیں ہے۔ اور غلام قوموں کے لئے ہمیشہ استعمال کی گئی ہے"۔

بدقسمتی سے یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان اپنی خام پیداوار دوسرے ملکوں کو بھیجتا ہے اور اپنی ضروریات کے لئے تیار شدہ سامان زیادہ تر باہر سے منگواتا ہے۔ انڈین ٹریڈ ریویو کے دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ قریب قریب ہماری تمام درآمد تیار شدہ مال پر مشتمل ہے اور ہماری تمام برآمد خام پیداوار پر اس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ ہمارا ملک روزانہ کی ضروریات کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے بھی دوسرے ملکوں کا محتاج ہے۔ پن، سوئیاں، کیلیں، کاغذ، پنسل وغیرہ۔ سب باہر سے آتا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے یہ کس قدر شرمناک ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کے لئے غیر ملکوں کا اس حد تک محتاج ہو۔ دوسرے ملک ہندوستان کے ساتھ خام پیداوار کی اس تجارت سے نفع اٹھاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کو کچھ نہیں ملتا وہ تو صرف زراعتی ملک رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی پیداوار باہر بھیج دیا کرتا ہے۔ اور دوسرے ملک اپنے مزدوروں سے سامان تیار کراتے ہیں۔ اس لئے ان بیانات کو تسلیم کرنے سے پہلے بہت احتیاط سے ان کی چھان بین کرنا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری تین چوتھائی آبادی آج صرف زراعت پر بسر کرتی ہے اور ان کا خاص پیشہ خام اشیا پیدا کرنا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنے ملک کے فائدے کے لئے ہم اس میں کوئی تبدیلی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر گذشتہ ۵۰ سال میں دوسرے ملک اپنی اقتصادی حالت میں تبدیلی کر سکے ہیں اور صنعت و حرفت کو ترقی دے سکے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان بھی ایسا نہ کر سکے۔ انگلستان کی خاص تجارت کپڑے کی ہے۔ اسے ہندوستان، افریقہ، امریکہ اور مصر سے روئی منگانا پڑتی ہے۔ انگلستان میں ہندوستان کے مقابلے میں مزدوری کی شرح بہت زیادہ ہے۔ پھر بھی وہ ہندوستان کے لئے کپڑا تیار کر سکتا ہے اور نفع بھی حاصل کر سکتا ہے بیس سال پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ انگلستان فطرتاً اقتصادی معجزے دکھانے کی اہلیت رکھتا ہے اور صنعتی ترقی کے ان اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکا ہے۔ کہ روئی لیجانے اور کپڑا لانے کے اخراجات برداشت کرنے کے باوجود وہ ہندوستانی بازاروں

میں آسانی سے سستا مال بیچ سکتا ہے۔ اس وقت ہم میں سے اکثر حضرات اس کا یقین کرتے تھے لیکن اس مختصر سے عرصے میں ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ ایک چھوٹا سا جزیرہ جاپان بھی یہی معجزہ دکھا سکتا ہے اور ہمارے بازاروں میں انگریزی مال سے بھی کم قیمت پر اپنا مال بیچ سکتا ہے۔ حکومت ہند نے اس پر ترجیحی محصول بھی لگایا لیکن پھر بھی اس کے پانوں نہ اکھڑے اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دوسری ترکیبوں سے اس کی تجارت کو ختم کر دیا جائے۔

جنگ عظیم کے دوران میں حکومت نے ایک اسلحہ سازی کا بورڈ قائم کیا تھا تاکہ فوج کے لئے یہیں سے سامان بنا کر بھیجا جائے یہ ترکیب اتنی کامیاب ہوئی کہ بیشتر ضروریات ہندوستان ہی سے پوری کی گئیں۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان تمام چیزوں کو تفصیل سے درج نہیں کر سکتے جو اس قلیل عرصے میں یہاں تیار ہوئیں۔ لیکن قارئین اگر چاہیں تو اس طویل فہرست کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو صنعتی کمیشن کے روبرو پیش ہوئی تھی[1] اگر جنگ عظیم کچھ دن اور جاری رہتی تو ہندوستان اپنی ضروریات کی تقریباً تمام چیزیں خود تیار کرنے لگتا بلکہ انگلستان کو کافی سستی قیمت پر بھیج سکتا دنیا کی موجودہ اقتصادی کشمکش کی وجہ سے تمام خود مختار حکومتوں کو اپنی پوری قوت صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف لگانا پڑی۔ اور حفاظتی محصول تو عام ہو رہے ہیں تجارت کی آزادی کا پرانا اصول آج کہیں نہیں برتا جاتا انگلستان بھی اس اصول کا سب سے بڑا علمبردار تھا لیکن واقعات سے مجبور ہو کر فی الحال تحفظ پرست ہو گیا ہے دنیا کے قریب

---

[1] ملاحظہ ہو شہادت جلد پنجم

قریب تمام ملک اب پھر تحفظات کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عام کساد بازاری کی تلافی کا صرف یہی ذریعہ ہے۔ گویا انھوں نے اپنے دروازے بالکل بند کرلئے ہیں اور ایسے مال کو جو وہ خود تیار کرسکتے ہیں ہرگز داخل ہونے نہیں دیا جاتا گاہک کی بہبودی کے دعوے اب ہندوستان کے سوا کہیں سننے میں نہیں آتے۔ چین اور ہندوستان صرف دو ملک ایسے ہیں جن کے بازار ساری دنیا کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ چین بھی اپنی صنعتوں کی تنظیم کر رہا ہے اور امید ہے کہ حالات روبہ اصلاح ہونے پر کسی نہ کسی وقت وہ بھی اپنی ضروریات کے لئے غیر ملکوں کا محتاج نہ رہے گا۔ لیکن ہندوستان میں اتنی آسانی سے یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی۔ تاوقتیکہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہماری نجات صرف اقتصادی آزادی میں ہے اور ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔

قدیم ہند صنعتی ملک تھا

اپنے قصور پر قسمت کو الزام دینا بیکار ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ چند صدی پہلے ہندوستان خوشحال صنعتی ملک تھا۔ اس وقت یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کی افسوسناک تاریخ دہرائیں۔ یا اس کے کارپردازوں کے ہاتھوں اپنی صنعتوں کی تباہی کا افسانہ بیان کریں۔ لیکن یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے۔ کہ اگر ہندوستان کا تیار شدہ مال حاصل کرنا مقصود نہ تھا تو پھر یہ کمپنی قائم کیوں ہوئی؟ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان ٹرانفیس کپڑا اور بہت سی دوسری چیزیں تیار کرتا تھا جو انگلستان اور دیگر مغربی ممالک میں کافی گران قیمت پر فروخت ہوتی تھیں کمپنی کے زمانے میں حسب ذیل چیزیں یہاں سے

یورپ جاتی تھیں۔

مسالے، مرچ، دوائیں، شکر، قہوہ، کچا ریشم، شورہ، نیل، خام روئی، اور سب سے بڑھ کر ہزاروں قسم کا بے انتہا خوب صورت سوتی کپڑا[1]

سر جارج برڈ وڈ اپنی کتاب موسومہ[2] "ہندوستان کے کارنامے" ڈھاکے کی ململ کی نفاست کے متعلق فرماتے ہیں۔ کپڑوں میں اول نمبر ڈھاکے کی ململ کو دیا جاتا ہے۔ آب رواں، بافت ہوا، شبنم، یہ سب سادے کپڑے ہوتے ہیں ان شاعرانہ ناموں ہی سے ان کی انتہائی نفاست اور نزاکت کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر وہ کتنے مرغوب تھے۔ اگر صفحے کے صفحے اُن کی توصیف میں رنگ دئے جائیں تب بھی یہ مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔" سترھویں صدی میں مشہور فرانسیسی سیاح ٹریور نیر ہندوستان آیا تھا۔ ململ کی نفاست کے متعلق اس کی رائے قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "محمد علی بیگ جب ہندوستان کی سفارت سے ایران واپس آیا تو اس نے چاسیف ثانی کی خدمت میں ایک ناریل پیش کیا یہ ناریل شتر مرغ کے انڈے کے برابر تھا اور اس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔ کھولنے سے اس میں ایک صافہ برآمد ہوا، یہ صافہ ساٹھ ہاتھ لمبا تھا اور کپڑا اتنا نفیس تھا کہ ہاتھوں میں محسوس بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ لوگ اتنا باریک سوت کاتتے تھے کہ بمشکل نظر آتا تھا یعنی بالکل مکڑی کا جالا معلوم ہوتا تھا۔" جیمس ٹیلر نے ۱۸۴۰ء میں ایک کتاب "اعداد و تذکرۂ ڈھاکہ" کے نام سے شائع کی تھی اس میں حسب ذیل الفاظ ہیں انھوں نے ململ کی تجارت کی تباہی پر افسوس

---

[1] ملاحظہ ہو ایسٹ انڈیا کمپنی کی چوتھی رپورٹ کا ضمیمہ۔ گوشوارہ ضمہ، ۴، [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۹

ظاہر کیا ہے: "جہانگیر کے زمانے میں ڈھاکے میں ۱۵ گز لمبا اور ایک گز چوڑا ململ کا تھان تیار ہوتا تھا۔ اس کا وزن ۹۰۰ گرین (۲½ چھٹانک سے کچھ زیادہ) ہوتا تھا۔ اور قیمت ۴۰ پونڈ تھی۔ اب بہترین ململ کے تھان کا وزن ۱۶۰۰ گرین (۵ چھٹانک) ہوتا ہے اور ۱۰ پونڈ میں ملتا ہے لیکن یہ تھان بھی خاص فرمائش پر بنائے جاتے ہیں۔ پرنس آف ویلز کو تین تھان خاص طور پر تیار کرا کے پیش کئے گئے تھے۔ وہ ۲۰ گز لمبے اور ایک گز چوڑے تھے اور ہر ایک کا وزن ۱۶۸۰ گرین تھا۔"[۵۱] مسٹر این این سرجی نے "بنگال کے سوتی کپڑے" پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے مغلیہ زمانے کی ململ کی خوبی کا معیار بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ایک معیار تو یہ تھا کہ ۲۰ گز لمبا ایک گز چوڑا ململ کا پورا تھان معمولی چھلے میں سے نکل جائے۔ دوسرا معیار یہ تھا کہ تہ ہو کر کتنی کم جگہ میں آتا ہے اور سب سے بڑا معیار یہ تھا کہ لمبائی چوڑائی کی نسبت سے اس میں کتنا وزن ہے اور سوت کے تاگوں کی تعداد کتنی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ۲۰ گز لمبا ایک گز چوڑا تھان اتنا باریک اور ہلکا ہوتا تھا کہ اس کا وزن صرف ۹۰۰ گرین ہوتا تھا اور قیمت ۴۰ پونڈ" مشہور انگریزی شاعر سر والٹر اسکاٹ بھی اپنی نظم "لاسٹ منسٹریل" میں "آگرے کے ریشمین کرگھے" کے گیت گاتا ہے۔

یورپ، امریکا اور بنگال کے درمیان نجی تجارت کی سالانہ رپورٹ بابت یکم جون ۱۷۹۶ء لغایت ۳۱ مئی ۱۸۰۳ء بھی پر از معلومات ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "۱۸۰۰ء سے پہلے کلکتہ کے دیسی تاجر ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ کا کپڑا اور کچا ریشم نہیں منگاتے تھے لیکن ۱۸۰۱ء میں ان دونوں چیزوں کی مجموعی قیمت

---

۵۱ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۹-۲-۵۰

ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ سے بڑھ گئی"۔

مسٹر لارکن نے ۱۸۰۵ء میں لکھا تھا کہ "۱۸۰۲-۳ء میں کپڑا اس کثرت سے لندن بھیجا گیا کہ وہاں کی مانگ سے بھی زیادہ پہنچ گیا[۵]"۔

یہ تجارت مشین کے بنے ہوئے سامان کے مقابلے سے یا ہندوستانی کاریگروں اور تاجروں کی بے پروائی سے فنا نہیں ہوئی بلکہ ہندوستانی مال کی درآمد پر انگلستان میں زبردست محصول لگا دئے گئے اور اُن کا بیچنا جرم قرار دے دیا گیا۔ ذرا ملاحظہ کیجئے ان قوانین کے بل پر انگلستان "آزاد تاجر" بن سکا ہے! ہندوستان میں تجارت کی آزادی" کی ان حالات سے تلقیص کرنا کہ گذشتہ دو صدیوں میں طرح طرح کے ناجائز اور قابل اعتراض طریقوں سے اس کی صنعت و حرفت کو بالکل تباہ کر دیا ہے زخم پر نمک پاشی کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ مسٹر براؤن ۱۸۰۲-۳ء میں "برطانوی ہند کی تجارت" پر لکھتے ہیں کہ "ہندوستانی کاری گروں کی عام تباہی اور برطانیہ کو جانے والے سامان کی کمی کا سبب ہمارے شہنشاہ کا وہ عجیب و غریب فرمان ہے جو اس سے قبل شاید کبھی نافذ نہ ہوا تھا۔ اس حکم کی رو سے آنریبل کمپنی کی رعایا کے بنائے ہوئے کپڑے کی درآمد قطعی بند کر دی گئی ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے یہ تجارت کرتے چلے آئے تھے اور یہ ان کے ملک کے لئے بڑی منفعت بخش تھی"۔

حکومت ہند اور کورٹ آف ڈائرکٹرس اور انڈیا بورڈ کے درمیان کی مراسلت

---

۵ ملاحظہ ہو ایسٹ انڈیا آفیرس بنگال کی بیرونی تجارت کی رپورٹ بابت ۱۸۰۳-۴ء مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۸۰۵ء۔

سنہ ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی ہے اس میں لارڈ ایلن برو کا بھی ایک خط ہے جو انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کو جولائی سنہ ۱۸۳۳ء میں لکھا تھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو "انگلستان کے سوتی مال پر ہندوستان میں ۳½ فی صدی محصول لیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی روئی پر انگلستان میں ۵ فی صدی کپڑے پر مزید ڈھائی فی صدی۔ اور اگر روئی رنگی ہوئی ہو تو ڈھائی فی صدی اور لیا جاتا ہے۔ .... اس طرح گویا ہندوستان کے مال پر کل ۱۰½ فیصدی محصول دینا ہوتا تھا"

ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تجارت کی رپورٹ کے ضمیمہ بابت سنہ ۱۷۹۵ء لغایت سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھا ہے کہ "جب انگریز ہندوستان کی معمولی ململ اور چھینٹ کی نقل اتارنے میں کامیاب ہو گئے اور انھیں بہتر بنانے اور لوک پلک تیار کرنے کی طرف متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ مشین کی مدد سے بھی وہ ایسا عمدہ ڈورا تیار نہیں کر سکتے جس میں اتنا بل موجود ہو کہ وہ کافی مضبوط رہے"

ریشمین کپڑے

یہی نہیں کہ ہندوستان صرف سوتی کپڑا تیار کرتا تھا بلکہ ریشمین کپڑا بنانے کے فن کا بھی ماہر تھا حتیٰ کہ کوئی ملک یہاں کے ریشمین کپڑے کی خوب صورتی اور سستے پن کو نہ پہنچتا تھا ابھی انیسویں صدی کے وسط میں یہاں کی ریشم کی تجارت بالکل ختم ہو گئی۔ کیونکہ انگلستان نے سخت تجارتی قیود اور زبردست محصول عائد کر دئے تھے۔ ہندوستانی ریشمیں کپڑے

کی درآمد پر انگلستان کے اون اور ریشم کے کپڑے بنانے والوں نے سخت مخالفت کی سنہ ۱۷۰۰ء ہی میں برطانیہ میں ایک قانون نافذ ہو گیا تھا جس کی رو سے ہندوستان ایران، چین اور دوسرے ایشیائی ممالک سے ریشم کی درآمد کی قطعی ممانعت کر دی گئی تھی۔

سن کی صنعت

ابھی نصف صدی قبل یہاں کے غربا گھر کے بٹے ہوئے سن کے کپڑے پہنا کرتے تھے اور آج بھی ہندوستان کے قدیم باشندے یہی استعمال کرتے ہیں[1] سنہ ۱۸۳۸ء میں بنگال سے آناسن کا کپڑا اور بورے انگلستان اور دوسرے ممالک کو گئے۔ کہ یکایک ڈنڈی کے سن کے کاری گروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ سن کی تجارت بھی اعلیٰ پیمانے پر ہو سکتی ہے سنہ ۱۸۵۰ء میں بھی بنگال سے ۸۷۸ و ۱۵ پونڈ کا سن کا سامان انگلستان گیا تھا۔ اور کچا سن صرف ۱۷۰۰ر ۹۷ر ۱ پونڈ کا گیا تھا

دیگر سامان

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان اور دنیا کے دوسرے حصوں میں لوگ اون کے علاوہ دوسرے قسم کا کپڑا جانتے بھی نہ تھے۔ انگلستان میں روئی کو "اونی روئی" کہا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ یہی جانتے تھے کہ صرف اون سے کپڑا تیار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح گنا بھی کوئی نہ جانتا تھا غیر ملکی سیاحوں نے لکھا ہے کہ یہ ایک پودا ہوتا

---

[1] ملاحظہ ہو ڈکشنری آف دی اکنامک پروڈکٹس جلد ۲ صفحہ ۵۰۰

ہے جس سے شہد نکلتا ہے لیکن بدقسمتی سے حکومت بدلتے ہی حالت بھی بدل گئی قومی حکومت تو تھی نہیں جو قومی صنعتوں کی حفاظت کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام صنعتیں رفتہ رفتہ تباہ ہو گئیں۔ اور لوگ محض زراعت پر بسر کرنے پر مجبور ہو گئے جو لوگ جہازوں میں سامان لے کر گلستان جایا کرتے تھے وہاں انھیں اترنے کی ممانعت کر دی گئی۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہندوستان اور باقی دنیا کے درمیان ایک دیوار اُٹھا دی گئی جس سے تمام سلسلے بالکل منقطع ہو گئے۔ طرح طرح کی دلیلیں ایجاد کی گئیں کہ ہندوستان صنعتی ملک ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ آج ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا روئی کی صنعت کے لئے موزوں نہیں ہے، لیکن بمبئی، احمد آباد، اندور، دہلی وغیرہ میں جہاں کبھی کبھی ۱۱۰ ڈگری تک گرمی پڑتی ہے کامیابی کے ساتھ بے شمار کارخانے چل رہے ہیں کیا ان واقعات سے ان بیانات کی تردید نہیں ہوتی۔ ابھی چند سال پہلے تک ہندوستان کے بنے ہوئے روئی کے کپڑے پر ہندوستان ہی میں ساڑھے تین فی صدی محصول لگتا تھا حو حال ہی میں منسوخ کرا دیا گیا ہے۔

ہندوستان میں معدنیات کی فراوانی ہے ہر قسم کے درخت بھی پیدا ہوتے ہیں اور قدرت نے طرح طرح کی آب و ہوا اور طرح طرح کے موسم عطا کئے ہیں اس لئے ہم کیسے یقین کر لیں کہ اتنے زبردست وسائل رکھنے والا ملک قدرتاً محض زراعت کے لئے موزوں ہے قابلیت کی بھی یہاں کمی نہیں ہے ہندوستان نے سر پی سی رے، سر جے سی بوس اور مسٹر رمن جیسے مشہور عالم سائنس داں پیدا کئے ہیں کوئی ملک جو خام پیداوار میں مالا مال ہو جہاں سائنس کی استعداد کی کمی نہ ہو، مزدوری سستی ہو، اور بازار موجود ہو کس طرح صنعتی ترقی کے لئے ناموزوں ہو سکتا ہے؟ البتہ جو سہولتیں دوسرے ملکوں کو

حاصل ہیں ان کے بہم پہنچانے میں بحل کیا جائے تو اور بات ہے صنعتیں حکومت کی امداد اور سرپرستی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتیں۔ لیکن ہندوستان میں ہمیشہ حکومت نے عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا۔ گویا حقیقت میں اس کے یہ معنی ہیں کہ انگلستان کے مفاد کا خیال رکھا گیا خواہ ہندوستان کو اس سے نقصان ہی پہنچا ہو۔ ۱۹۲۸ء میں ایک سرکاری کتاب "حکومت اور صنعت" کے نام سے شائع ہوئی تھی اس کے مصنف نے اس چیز کا صاف صاف اقرار کیا ہے[1] "صنعتوں کا انتظام کرنا حکومت کے لئے معیوب ہے اس میں امداد دینا بے کار ہے اور اس میں شریک ہونا ملک کے روپیے کو ضائع کرنا ہے" لیکن کیا ہم یہ سوال کر سکتے ہیں۔ کہ انگلستان کی حکومت بھی اپنے ملک کی صنعتوں کا انتظام کرنا اسی طرح معیوب سمجھتی تھی۔ ان کی امداد کرنا ایسا ہی بے کار تصور کرتی تھی اور اس میں شریک ہونا اسی طرح ملک کا روپیہ ضائع کرنے کے مترادف سمجھتی تھی اگر ایسا نہیں ہے تو یہ امتیاز کیوں ہے؟ لیکن سب سے بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہندوستان کے غریب اور بے پڑھے لوگ عام طور پر اس مسئلے کی پوری اہمیت کو محسوس نہیں کرتے وہ زراعت کا پیشہ اختیار کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ ان کے لئے کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لاکھوں فاقہ کشوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد

۱۸۸۱ء میں صرف ۵۸ فی صدی آبادی کاشتکاری کرتی تھی اتفاق سے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ

اس سے پہلے کے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ پہلے زمانے میں یہ اوسط اور بھی کم تھا۔ بہر حال اس وقت سے اب تک کا اوسط ملاحظہ کیجئے۔

سنہ ۱۸۸۱ء	۶	۵۸ فی صدی
سنہ ۱۸۹۱ء	۶	۶۱٫۰۶ "
سنہ ۱۹۰۱ء	۶	۶۶٫۵ "
سنہ ۱۹۱۱ء	۶	۶۸٫۹ "
سنہ ۱۹۲۱ء	۶	۷۱٫۶ "
سنہ ۱۹۳۱ء	۶	۷۲٫۸۳ "

شاہی زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ[۵۲] میں لکھا ہے کہ ۳۰ء۵ فی صدی آبادی زراعت پر بسر کرتی ہے۔ گویا ۳۰ سال کے اس قلیل عرصے میں کاشتکاری کرنے والوں میں ۱۴ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ زمین پر متواتر بار بڑھ رہا ہے۔

بخلاف اس کے دوسرے ملکوں میں زراعت کرنے والوں کا اوسط مسلسل گھٹ رہا ہے۔ زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل[۵۳] نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ تمام ملکوں میں جتنی کہ زراعتی

---

۵۱ مردم شماری کی رپورٹ میں زراعت پیشہ کا اوسط ۶۷٫۱۱ فی صدی دکھایا گیا ہے۔ لیکن صفحہ ۲۸۱ پر یہ امر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس اوسط میں ۵٫۲۷ فی صدی وہ اشخاص شامل نہیں ہیں۔ جو سنہ ۲۱ء کی مردم شماری کے بموجب شامل ہونا چاہیئے تھے اس لئے اگر مردم شماری سنہ ۳۱ء کے اصولوں کے مطابق کی جاتی تو اوسط ۷۲٫۸۳ سے زیادہ ہوتا

۵۲ ملاحظہ ہو صفحہ ۵ ۵۳ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۵

ملکوں میں بھی گذشتہ ۵۰ سال میں دیہاتی آبادی نسبتاً بہت کم ہوگئی ہے مثلاً ڈنمارک میں ۱۸۸۱ء میں یہ اوسط ۱۷ فی صدی تھا ۱۹۲۱ء میں ۵۰ فی صدی رہ گیا۔ فرانس میں ۱۸۷۶ء میں ۶۰ فی صدی تھا ۱۹۲۱ء میں ۵۳٫۶ فی صدی رہ گیا۔ جرمنی میں ۱۸۷۵ء میں ۶۱ فی صدی تھا ۱۹۱۹ء میں ۳۷٫۸ فی صدی رہ گیا۔ انگلستان اور ویلس میں ۱۸۷۱ء میں ۳۸٫۲ فیصدی تھا ۱۹۲۱ء میں ۲۰٫۸ فی صدی رہ گیا۔ مذکورہ بالا اعداد منہ سے بول رہے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ مغربی ممالک میں شہری اور دیہاتی آبادی کا بہت بڑا حصہ صنعتوں میں لگ گیا۔ لیکن ہندوستان میں زراعتی آبادی برابر بڑھ رہی ہے ۱۸۸۱ء میں ہندوستان کی زراعتی آبادی کا اوسط بھی قریب قریب ڈنمارک، فرانس اور جرمنی کے برابر تھا۔ بلکہ وہاں کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس لئے آخر کوئی وجہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان نے کیوں دوسرے ملکوں کے برعکس راستہ اختیار کیا۔ یعنی ہر جگہ زراعتی آبادی کم ہوئی لیکن یہاں اضافہ ہوا۔ آخر کیوں ہندوستان ہی کی قسمت میں زراعتی ملک بننا لکھا ہے۔ حالانکہ اسی عرصے میں ڈنمارک، فرانس اور جرمنی عظیم الشان صنعتی ملک بن گئے۔ ہندوستان معدنیات اور جنگلی و زراعتی پیداوار سے مالا مال ہے۔ مزدوری سستی ہے عام استعداد اور سائنس کی قابلیت کی کمی نہیں ہے۔ ہندوستانی طالب علم غیر ملکی یونیورسٹیوں میں نہ صرف ادبی مضامین میں بلکہ سائنٹیفک اور ٹکنیکل مضامین میں بھی ہمیشہ ممتاز رہے ہیں ان واقعات کی موجودگی میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں کوئی ایسی بنیادی خرابی ہے جو صنعتی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ اگر یہی خرابی ہے کہ ہندوستان اپنی پیداوار دوسرے ملکوں کو بھیجتا ہے تو اس کا جواب نہایت آسانی سے دیا جا سکتا ہے کہ جب اس پیداوار کو یہاں کام میں لانے کی کوئی صورت نہیں تو پھر اس کو کیا کیا جائے علاوہ ازیں اس کا علاج

بھی تو ہو سکتا ہے مثلاً ابھی ۳۰ سال پہلے ڈنمارک میں بھی یہی صورت تھی لیکن اس قلیل عرصے میں وہ اپنی ساری خام پیداوار سے خود مختلف چیزیں تیار کرنے لگا اس کی پیداوار بھی پیشتر زراعتی چیزوں پر مشتمل تھی۔

اس بے بنیاد خیال کی وجہ سے آج زمین پر اتنا بار بڑھ گیا ہے کہ فی کس صرف دو ایکڑ زمین حصے میں آتی ہے جو ایک خاندان کے گذارے کے لئے قطعی ناکافی ہے جن حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ باضابطہ اور سائنٹیفک طریقے پر اگر کاشت کی جائے تو کسان خوشحال ہو سکتا ہے۔ وہ ذرا حسب ذیل نقشہ ملاحظہ فرمائیں۔ امید ہے اس سے واضح ہو جائے گا کہ دوسرے ملکوں کی کامیابی کا کچھ اور راز بھی ہے جن ملکوں میں ہندوستان کے بہت بعد کاشتکاری کو پیشے کی حیثیت سے اختیار کیا گیا وہاں بھی ہندوستان کے مقابلے میں رقبہ فی کس بہت زیادہ ہے مسٹر ایل ڈارلنگ نے اپنی مشہور کتاب موسومہ ''پنجابی کسان۔ خوشحال اور مقروض'' میں[1] مختلف صوبوں کا حسب ذیل اوسط رقبہ فی کس درج کیا ہے۔

۱۔ بمبئی	۱۲ ر ۱۵
۲۔ سرحد	۱۱ ر ۲۲
۳۔ پنجاب	۹ ر ۱۸
۴۔ سی پی و برار	۸ ر ۱۸
۵۔ برما۔	۵ ر ۶۵

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸۸ ؛ ۲۹۱

۶۔ مدراس	۴ر ۹۱
۷۔ بنگال	۳ر ۱۲
۸۔ بہار اُڑیسہ	۳ر ۰۹
۹۔ آسام	۲ر ۹۶
۱۰۔ یوپی۔	۲ر ۵۱

لیکن دوسرے ملکوں میں حسب ذیل اوسط ہے۔

۱۱۔ ڈنمارک	۴۰
۱۲۔ ہالینڈ	۴۶
۱۳۔ جرمنی	۲ر ۱ر ۵
۱۴۔ فرانس	۲ر ۰ر ۵
۱۵۔ بلجیم	۱۴ر ۵

۱۹۲۶ء کے زراعتی ہندوستانی جرنل[1] میں جوت کی وسعت کے متعلق حسب ذیل اعداد دیے گئے ہیں۔

ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم	۲۳ فی صدی
ایک سے پانچ ایکڑ تک	۳۳ "
پانچ سے دس ایکڑ تک	۲۰ "
دس ایکڑ سے زائد	۲۴ "

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۹

افسوس ہے کہ ہندوستان میں پٹی کی وسعت کے متعلق کوئی صحیح اعداد موجود نہیں ہیں لیکن اس سلسلے میں شاہی زراعتی کمیشن کا ایک اقتباس دینا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ[1] "صرف پنجاب کے متعلق اعداد ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۲٫۵ فی صدی کسانوں کے پاس ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم رقبہ ہے۔ ۱۵ فی صدی ایک سے ڈھائی ایکڑ تک کاشت کرتے ہیں ۱۷٫۹ فی صدی۔ ڈھائی سے پانچ ایکڑ تک اور ۲۰٫۵ فی صدی پانچ سے دس ایکڑ تک بمبئی میں بھی یہی صورت ہے۔ برما میں کچھ اس سے زیادہ ہے۔ باقی تمام صوبوں میں فی کسان اس سے کم ہی رقبہ پڑتا ہے" اب ذرا اس کا مقابلہ جرمنی اور انگلستان اور ویلس کی بڑی بڑی پٹیوں سے کیجئے۔

انگلستان اور ویلس

ایک سے پانچ ایکڑ		۱٫۱ فی صدی
۵	۲۰	۵
۲۰	۵۰	۹٫۷
کل ۱۵۰ ایکڑ سے کم		۱۵٫۸
۵۰ سے ۱۰۰ ایکڑ		۱۶ فی صدی
۱۰۰	۱۵۰	۱۲٫۵
۱۵۰	۳۰۰	۲۹

[1] ملاحظہ ہو رپورٹ صفحہ ۱۳۳

۳۰۰ سے زائد	۲۴٫۷	فی صدی
کل ۵۰ ایکڑ سے زائد	۸۴٫۳	"

جرمنی

½۱ سے کم	۱٫۱	فی صدی
½۱ سے ۵ ایکڑ	۴٫۳	"
۵ " ½۱۲ "	۱۰٫۴	"
½۱۲ " ۵۰ "	۳۲٫۷	"
کل ۵۰ ایکڑ سے کم	۴۸٫۵	"
۵۰ سے ۱۲۵ ایکڑ	۲۱٫۴	"
۱۲۵ " ۲۵۰ "	۷٫۹	"
۲۵۰ " ۵۰۰ "	۴٫۷	"
۵۰۰ " ۱۲۵۰ "	۹٫۴	"
۱۲۵۰ " ۲۵۰۰ "	۶٫۵	"
۲۵۰۰ سے زائد	۱٫۶	"
کل ۵۰ ایکڑ سے زائد	۵۱٫۵	فی صدی

انگلستان میں ۸۴ فی صدی اور جرمنی میں ۵۱ فی صدی کھیت ۵۰ ایکڑ سے زیادہ کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ۷۶ فی صدی کھیت ۱۰ ایکڑ سے بھی کم کے ہیں ان میں سے ۱۵ فی صدی تو ایسے ہیں جن کا رقبہ ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم ہوتا ہے اور ۵۰ ایکڑ سے زیادہ کا اوسط تو ایک فی صدی بھی نہیں ہے۔

کوئی شخص یقین نہیں کر سکتا کہ ہندوستان صنعت و حرفت کے لئے ناموزوں ہے۔ جاپان نے بھی جو ہندوستان کی طرح قدیم ملک ہے اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دینا شروع کر دیا ہے چھوٹے چھوٹے ملک جن کے یہاں کچھ پیدا بھی نہیں ہوتا وہ بھی صنعتی مقابلے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ ہندوستان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ ترقی کرنے کا اسے موقع دیا جائے۔ اگر قوم اس کا ارادہ کرلے اور حکومت بھی کافی امداد و سرپرستی کرے تو ہندوستان بہت تھوڑے عرصے میں ترقی کر سکتا ہے۔ مذکورہ بالا واقعات سے ناظرین پر ثابت ہو گیا کہ ہندوستان زراعتی ملک نہیں ہے بلکہ حالات سے مجبور ہے اور اگر موقع ملے تو آسانی سے صورت حالات بدل سکتی ہے۔

باب ہفتم

طرز زندگی یا پیشہ

پچھلے صفحات کے مطالعے سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ پرانے زمانے میں زراعت لوگوں کا پیشہ نہیں۔ بلکہ طرز زندگی تھی اس زمانے کے کسان آج کل کی اصطلاح میں نہ سرمایہ دار ہوتے تھے نہ مزدور کاشتکاری کے خاص خاص موقعوں کے علاوہ عام طور پر وہ لوگ مزدور نوکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انھیں سرمایہ دار کہنا غلطی ہے اور مزدور بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ دوسروں کی مزدوری کر کے اپنی روزی نہیں کماتے تھے، ان کا انحصار سراسر کھیت کی پیداوار پر تھا اور اپنی محنت کو وہ شمار نہ کرتے تھے یہ دونوں چیزیں انھیں پیشہ ور لوگوں سے بالکل جدا کر دیتی ہیں اس کے علاوہ ان کی زندگی سے متعلق اتنی ہی اہم ایک اور چیز بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ زراعت کو روپیہ کمانے کے لئے اپنا پیشہ نہ بناتے تھے۔ بلکہ ان کی پشتہا پشت کی طرز زندگی یہی تھی اور نفع و نقصان کا خیال ان کے ذہن میں آتا ہی نہ تھا۔ ان کے نزدیک روپیے کی شکل میں پیداوار کی کوئی قیمت نہ تھی۔ کیونکہ وہ تبادلے کے ذریعے اس سے اپنی تمام ضروریات پوری کرتے تھے بونی کے وقت بھی وہ یہ تخمینہ نہیں کرتے تھے کہ کون سی چیز کاشت کرنے سے بہت نفع ہوگا۔ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ اپنے گذارے کے لائق تمام چیزیں مہیا کر لیں اس لئے وہ تھوڑا سا گیہوں بوتے تھے۔ تھوڑا سا چنا بوتے تھے کھیت کے کنارے کنارے تیل کے لئے سرسوں کی چند قطاریں بوتے تھے۔ تھوڑی سی روئی بھی بوتے تھے۔ تلی اور ترکاریوں کے تھوڑے سے بیج بھی ڈال دیتے تھے اپنے لئے دالیں بھی

بوتے تھے۔ اگرچہ عام طور پر دال کی کاشت سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہی لیکن ان کا مقصد تو یہ تھا کہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود پیدا کریں۔ شکر کے لئے تھوڑا سا گنا بھی بو لیتے تھے اپنے جانوروں کے لئے چارہ بھی خود بوتے تھے اور یہ تخمینہ نہیں لگاتے تھے کہ قرب جوار سے کم شرح پر خریدنے سے سستا پڑے گا یا نہیں۔ گویا زراعت سے روپیہ کمانا اور ایسی فصلیں بونا جن ہی خوب نفع ہو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اُن کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ کسی کی خدمت کئے بغیر آزادانہ زندگی بسر کریں اور اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوں اس طرز زندگی ہی کی وجہ سے لوگ کسان کی عزت کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ کاشتکاری کو معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اب حالات میں آسمان زمین کا فرق ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے بازار کھل گئے ہیں اور وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار جاری ہو گئے ہیں آمد و رفت اور رسل رسائل کے ذرائع میں آسانیاں ہو گئی ہیں۔ اور ساری دنیا ایک بین الاقوامی بازار بن گئی ہے مہذب دنیا کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا ہے اور سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے بجائے روپیہ کمانے اور دولت جمع کرنے کا خیال عام طور پر طاری و ساری ہو رہا ہی۔ آج کل کی معاشرت کا نظریہ ہے کہ موجودہ حالات سے مطمئن نہ رہو۔ جہاں تک ممکن ہو اپنی ضروریات بڑھائے جاؤ۔ پھر انھیں پورا کرنے کے لئے پیداوار میں اور اضافہ کرو۔ بخلاف اس کے پرانی معاشرت کا یہ نظریہ تھا کہ سادہ زندگی بسر کرو اور جہاں تک ممکن ہو ضرورت کو کم کرو۔ اس وقت یہ بحث کرنا ہمارا کام نہیں ہے کہ روحانیت اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے کون سا نظریہ بہتر ہی۔ ہم تو صرف واقعات پر نظر ڈال رہی ہیں۔ پہلے زمانے میں کسان نقدی بہت کم استعمال کرتے تھے۔ لیکن اب تو ہر چیز نقدی کی شکل میں شمار کی جاتی ہے۔ پہلے کسان پیداوار کا ایک مقررہ حصہ حکومت کو ادا کرتا تھا لیکن اب ایک مقررہ رقم دینا پڑتی ہے خواہ پیداوار کم ہو یا

جنس کی قیمت گر جائے یا اخراجات زیادہ آئیں لیکن لگان کی رقم وہی رہتی ہے اور سرکاری سکے کی شکل میں ادا کرنا ہوتی ہے اب بازار میں پیداوار کے بدلے میں کوئی چیز نہیں مل سکتی پہلے پیداوار کو فروخت کرکے روپیے کی صورت میں تبدیل کرنا ہوتا ہے پھر اس روپیے سے ضروری چیزیں خریدی جا سکتی ہیں کسان نے موجودہ سماج کے لحاظ سے اپنی ضروریات میں اضافہ نہیں کیا ہے۔ پھر بھی شہر کے بازاروں میں سستی، دل کش اور نمائشی چیزیں دیکھ دیکھ کر اسے بھی خواہ مخواہ شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی گاڑھی محنت کی کمائی کا بیشتر حصہ ان چیزوں پر صرف کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کی پیداوار کا زیادہ حصہ اس کے پاس سے نکل جاتا ہے اور اس کی ضروریات کے لئے بہت تھوڑا سا باقی رہ جاتا ہے اب وہ پہلے کی طرح سماج کا ایک آزاد رکن نہیں ہے پہلے وہ اپنے گاؤں کے پٹواری، چوکیدار، مہاجن اور مختلف پیشہ وروں کو روزی مہیا کرتا تھا۔ لیکن آج بدقسمتی سے ان سب کا محتاج ہے۔ غرض کہ سماج کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا ہے

تجارت اور طرز زندگی میں فرق

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تجارت اور طرز زندگی کا فرق اور زیادہ واضح کر دیا جائے اگر ان دونوں کا صحیح فرق ہمارے ذہن نشین ہو جائے تو ہمیں مشکلات کا پورا پورا احساس ہو سکے گا اور ہم سمجھ سکیں گے کہ اس تبدیلی سے کسان کس کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ طرز زندگی اس آزاد زندگی کو کہتے ہیں جو انسان اپنی فطرت عادت اور روایات کے مطابق بسر کرتا ہے نہ کہ وہ بناوٹی زندگی جو نفع و نقصان کے خیال سے بالقصد اختیار کی جائے آزاد زندگی میں انسان کا یہی مطمح نظر ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج نہ

رہے۔ اور آسائش سے بسر کرے اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ روپیہ کمائے اور دولت جمع کرے اور اس کے ذریعے اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی سماج میں عزت حاصل کرے۔ پرانے زمانے میں جب کسان کو نقد لگان ادا کرنا نہیں ہوتا تھا اور اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے بازار لیجانا پڑتی تھی تو وہ اسی قسم کی آزاد زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ روپیہ کمانے سے قطعی بے نیاز تھا اور اسے اس کی ذرا پروا نہ تھی کہ دنیا کدھر جارہی ہے۔ بخلاف اس کے تجارت کو طرزِ زندگی نہیں کہہ سکتے مثلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص بہت امیر ہے اور کسی کارخانے یا دکان سے ہزاروں روپیہ پیدا کر رہا ہے تاہم بڑی کنجوسی سے بسر کرتا ہے اور اپنی آسائش اور ضروریاتِ زندگی پر بہت کم خرچ کرتا ہے یعنی کارخانے یا دوکان کی آمدنی کا اس کی ذات پر اس کے معیارِ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دوسری جانب یہ ہوسکتا ہے کہ روپیے کی کمی کی وجہ سے ایک شخص اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر نہ کرسکتا ہو۔ دونوں صورتوں میں انسان طبعاً ایک خاص طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے اور اس کے پیشہ یا تجارت کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مارواڑی تاجر جس کی لاکھوں روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو بہت سادہ زندگی بسر کرے اور ایک انگریز جس کی بہت تھوڑی آمدنی ہو زندگی کا اعلیٰ معیار قائم رکھے تجارت کا مقصد زیادہ نفع کمانا ہے اور نفع حاصل کرنے کے لئے نیک و بد کا خیال رکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ بہت ممکن ہے کہ ایک تاجر اپنی تجارت میں زیادہ نفع کمانے کے لئے دیانت داری کا بھی لحاظ نہ کرتا ہو لیکن اس کے باوجود وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرتا ہو یا شاہانہ انداز سے رہتا ہو۔ بہرحال تجارت کی کامیابی کا راز تو اس کے اندازوں کی صحت میں پوشیدہ ہے۔ تجارتی دنیا میں قیمتوں کا اتار چڑھاؤ متعدد اثرات کے ماتحت رہتا ہے ان ہی حالات کا غلط یا صحیح اندازہ لگانے

سے وہ پلک جھپکتے فقیہ پکھ پتی ہو سکتا ہے۔ اسے بازار کے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور نہ صرف اس خاص تجارت کے کرنے والوں سے مسلسل تعلق رکھنا پڑتا ہے بلکہ اس سے متعلق تمام فطری مصنوعی اور سیاسی حالات سے آگاہی رکھنی ہوتی ہے اس کے برعکس جو شخص ایک معینہ طرز زندگی اختیار کرتا ہے وہ اس کے مالی رخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اس کا مقصد تو صرف یہی ہوتا ہے کہ اپنے کام میں محنت کئے جائے اور پھر جتنی چادر دیکھے اتنے ہی پاؤں پھیلائے۔

پرانی وضع کا کسان ہمیشہ فطری زندگی بسر کرتا تھا اور چیزوں کی قیمت میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنے والے بیرونی اثرات سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ شاذ و نادر ہی وہ اپنی پیداوار بازار میں بیچتا تھا یا خانگی ضروریات کے لئے کوئی چیز بازار سے خریدتا تھا۔ گویا اس کے معاملات میں نقد قیمت کو بہت کم دخل تھا اس کے پیش نظر صرف ایک مقصد ہوتا تھا اور وہ یہ کہ اناج اور روئی اتنی پیدا کرے کہ اس کے کھانے اور پہننے اور دوسری ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لئے کافی ہو۔ قحط کے لئے بھی وہ اناج کا کافی ذخیرہ جمع رکھتا تھا۔ اگر فصل اچھی ہوگئی تو وہ چند زائد چیزیں بھی خرید لیتا تھا لیکن اگر فصل خراب ہوئی تو اسی کے مطابق اپنی ضروریات کم کر دیتا تھا۔ سرکاری مطالبہ بھی اسے پیداوار کے تناسب سے ادا کرنا ہوتا تھا۔ اور وہ بھی نقدی کی شکل میں نہیں بلکہ جنس کی صورت میں۔ اس لئے اس پر سرکاری مطالبے کا کوئی خاص اثر نہ پڑتا تھا۔ اگر اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے علاوہ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ تبادلے کے ذریعے حاصل کر لیتا تھا۔ پشتہا پشت سے وہ ہر چیز کو نقد کے نہیں بلکہ تبادلہ جنس کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا لیکن آج ہر چیز نقد کے معیار سے پرکھی جاتی ہے اس لئے وہ بیچارہ اپنے آپ کو سخت مشکل میں پاتا ہے۔ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اس کی سمجھ سے

باہر ہے۔ اور یہ تمام چیزیں اس کے لئے سخت پریشان کن ہیں۔ پہلے زمانے میں وہ صرف اپنے گاؤں کی مانگ اور بہم رسانی کے سادہ اصولوں سے واقف تھا۔ یعنی اگر فصل اچھی ہوئی تو اپنی ضروریات کی چیزوں کے تبادلے میں اسے زیادہ۔ اور اگر خراب ہوئی تو کم ناج دینا پڑتا تھا۔ دوسرا اصول وہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ فصل کے کٹنے کے وقت قیمتیں زیادہ گر جاتی ہیں کیونکہ بازار میں مال کی افراط ہوتی ہے اور بونی کے وقت قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ ذخیرہ ختم کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن آج کل وہ اکثر کاروبار میں دیکھتا ہے کہ فصل اچھی ہونے پر بھی قیمت بہت چڑھی رہتی ہے اور فصل خراب ہونے کے باوجود قیمت گر جاتی ہے۔ دراصل وہ یہ نہیں جانتا کہ بازار کا بھاؤ محض اس کے گاؤں کی پیداوار پر منحصر نہیں ہے اب اسے یہ تجربہ ہوا ہے کہ اگر وہ اپنی پیداوار جمع بھی کرلے اور یکایک قیمت گر جائے تو اسے سخت نقصان ہوگا چونکہ اب دنیا کے تمام حصے آپس میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اس لئے قیمتیں کسی خاص جگہ کی مانگ اور بہم رسانی پر منحصر نہیں ہوتیں بلکہ عام طور پر تمام دنیا کے حالات پر مبنی ہوتی ہیں پھر اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ مانگ اور بہم رسانی ہی کی بنا پر قیمتوں کا تعین نہیں ہوتا بلکہ اور چیزیں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً درآمد اور برآمد کا محصول اپنے ملک اور غیر ملکوں کے سکوں کی قیمت لانے لیجانے کا کرایہ وغیرہ وغیرہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ ماہرین اقتصادیات کے لئے بڑا پریشان کن اور پیچیدہ ہے۔ پھر بھلا بے پڑھا کسان اسے کیا سمجھ سکتا ہے جو گاؤں کے محدود دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلتا۔ اور قیمتوں میں مدوجزر پیدا کرنے والے اقتصادی اثرات سے قطعی ناواقف ہے

پیشہ کی کامیابی کا راز

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صنعتی کاروبار کی کامیابی کے لئے قیمتوں کی رفتار کا بغور مطالعہ کرنے والے اور بہتر سے بہتر حساب پھیلانے والے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کاشتکاری میں ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے ہر شخص آسانی سے اسے بطور پیشہ کے اختیار کر سکتا ہے نااہل کسان کو کچھ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی آسانی سے اپنے پیشے سے برطرف نہیں کیا جا سکتا۔ "تاجروں کے زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ[1] "ایسے کسان کافی تعداد میں ملیں گے جن کی قابلیت کو اگر معمولی تجارتی اصولوں پر جانچا جائے تو وہ کاشتکاری کی تجارت کے نااہل ثابت ہونگے مگر وہ کاشتکاری تجارت کے خیال سے نہیں کرتے بلکہ اس سے کسی نہ کسی طرح اپنی گذر کرتے ہیں یہ ممکن ہے کہ جدید طریقہ کاشت ان کے لئے تباہ کن ثابت ہو لیکن جس طرح ایک نااہل تاجر کو مجبوراً تجارت سے دست کش ہونا پڑتا ہے ایک نااہل کسان زراعت کو نہیں چھوڑ سکتا" یہ تو ممالک متحدہ امریکہ کے کسانوں کی حالت بیان کی گئی لیکن ہندوستان میں حالت اور بھی خراب ہے۔ یہاں ہر کارِ بیگمہ مجبور ہو کر کاشتکار یا مزدور کی حیثیت سے زراعت کا پیشہ اختیار کر رہا ہے اسی وجہ سے کاشتکاری میں منافع گھٹتا جا رہا ہے عقل مند اور قابل لوگ یہ پیشہ اختیار نہیں کرتے۔ اور کوئی رہبری کرنے والا بھی موجود نہیں ہے اس سبب کا نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار نااہل لوگ اس میں داخل ہو رہے ہیں تعلیم یافتہ حضرات یا سرکاری افسر

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۸

جاہل اور بے پڑھے کسانوں کی رہبری نہیں کر سکتے۔ اب تک تو انھوں نے صرف ناصح کا کام کیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مشورہ دینے کے بعد وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے خالی نصیحت خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو بے کار ہوتی ہے۔ کسان اتنا ضرور سمجھ سکتا ہے کہ اس شخص کی نصیحت کی کیا وقعت ہو سکتی ہے جس نے ہل کو کبھی ہاتھ نہ لگایا ہو۔ چاہے وہ کتنا ہی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر مامور کیوں نہ ہو کسان اپنے ناصح کی گفتگو سنتا ہے اور دل ہی دل میں ہنستا ہے۔ چنانچہ مشورے کی صداقت کا پورا اطمینان دلانے کے لئے اسے عمل کر کے دکھانے کی ضرورت ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ ایک خاص قسم کا بیج بوئے تو اس کے کھیت پر جائیے اسے بو کر بتلائیے صحیح وقت پر پانی دیجئے جو کھاد اسے مل سکتی ہو وہی ڈالئے اور تمام امکانی نقصانات سے اس کا تحفظ کیجئے۔ اگر آپ عملاً اسے یہ دکھا دینے میں کامیاب ہو گئے کہ آپ کے مجوزہ بیج سے پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے تو وہی نہیں بلکہ قرب و جوار کے کسان بھی آپ کے مشورے کو قبول کریں گے اور آپ کے بہت ممنون ہوں گے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ زراعت اب نفع بخش پیشہ نہیں رہا ہے اب بھی جو لوگ یہ پیشہ کرتے ہیں وہ نفع کے خیال سے نہیں بلکہ محض فطری رجحان کی بنا پر کرتے ہیں۔ سیسل ڈیمپر وتیہم نے اپنی کتاب موسومہ "سیاسیات اور زمین" میں لکھا ہے کہ[1] "اگر قیمتوں کو قرار بھی رہے تب بھی یہ امکان نہیں ہے کہ انگلستان جیسے امیر ملک میں بھی زراعت میں کبھی اتنا نفع ہو سکے گا۔ کہ قابلیت اور ہمت والے لوگ اس طرف توجہ کرنے لگیں" ذرا غور کیجئے۔ اگر قابلیت، اور ہمت والے لوگ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۷

کاشتکاری کے لئے انگلستان میں میسر نہیں آسکتے تو کیا توقع ہوسکتی ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے لوگ کاشتکاری کیلئے تیار ہو جائیں گے۔

نتیجہ

اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پیشے میں لائق آدمیوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے اور صرف وہ لوگ باقی رہ گئے ہیں جنھیں اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے اس طرح ایک جانب تو یہ معزز پیشہ طرز زندگی کے اعلیٰ مقصد کے بجائے روپیہ کمانے کا ذریعہ بن گیا ہے پھر زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو تجارتی اصولوں پر اسے چلانے کی قطعی اہلیت نہیں رکھتے۔ کسانوں کے افلاس کا سب سے بڑا سبب ایک یہ بھی ہے زراعت کو تجارتی اصول پر چلانے کے لئے ہندوستانی کسان موزون نہیں ہے جہاں تک زراعتی طرز زندگی کا تعلق ہے نہ تو اب اس کا وجود ہے اور نہ اس میں قابل اور اعلیٰ اخلاق کے لوگوں کے لئے کوئی کشش ہی باقی رہ گئی ہے۔ اب صرف جاہل اور بے پڑھے لوگ یہ پیشہ کرتے ہیں ان میں نہ تو وہ حسابی ملکہ ہے اور نہ تجارتی میلانِ طبع۔ اس لئے فطرتاً وہ اس کے نااہل ہیں اور قدم قدم پر انھیں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تاجر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پڑھا لکھا ہو اور اپنے پیشے کے متعلق تمام باتوں کا مطالعہ کرنے کا اسے پورا پورا موقع حاصل ہو۔ کسان کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا وہی پرانا تخیل موجود ہے وہی جذبات وہی رسم و رواج اور وہی عادات و خصائل باقی ہیں اور اب بھی نفع و نقصان کا سوال اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر پیدا بھی ہو تو وہ اس معاملے میں بالکل بے بس ہے اس کو ضروری معلومات بہم پہنچانے کی کوئی منظم کوشش نہیں کی جاتی

تاکہ وہ دنیا کے بازاروں کا مطالعہ کر سکے اور یہ اندازہ کر سکے کہ کون سی چیز بونے سے نفع ہوگا۔ اور کس سے نقصان۔

ممکن ہے بعض حضرات یہ خیال کریں کہ جب زراعت میں نفع نہیں ہے تو لوگ کیوں اس کے پیچھے پڑے رہیں بظاہر یہ بہت معقول سوال معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کسی شخص کو اگر روزگار اور بے روزگاری کے درمیان انتخاب کرنا ہو تو وہ کسی نہ کسی روزگار ہی کو ترجیح دے گا۔ کسانوں کی ساری آبادی میں مشکل سے ۲ فیصدی لکھے پڑھے ہوں گے اور ہزاروں میں شاید ایک ایسا ہوگا جو صحیح اندازہ کر سکتا ہو اور نفع نقصان کی نظر سے یہ طے کرنے کے قابل ہو کہ کیا بوئے کیا نہ بوئے کاشت کے تجارتی تخمینے بڑے مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ممالک متحدہ امریکا میں زراعت کا نظام بہت باترتیب ہے اور کسانوں کے پاس بڑے بڑے کھیت ہیں۔ لیکن وہاں بھی صحیح حساب شاذ و نادر ہی لگایا جا سکتا ہے ہندوستان میں تو حالت اور بھی ردی ہے نہ تو حکومت نے اور نہ رعایا نے کبھی اس امر کی کوشش کی کہ حسابی نقطۂ نظر سے اس اہم پیشہ کی چھان بین کی جائے اور کہیں اس کی کوشش کی گئی تو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ یہ تو سراسر نقصان کا سودا ہے سنہ ۱۹۱۷ء یا بنکنگ تحقیقاتی کمیٹی نے بڑے پرزور الفاظ میں لوگوں کو اس جانب توجہ دلائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ اکثر صورتوں میں تو اسی میں فائدہ ہے کہ اراضی کو فروخت کر دیا جائے اور جو رقم اس طرح وصول ہو اس کو کوآپریٹو بنک میں لگا دیا جائے اور پانچ آنے روزانہ ہی پر مزدور کی حیثیت سے کام کرنا قبول کر لیا جائے اس تحقیقات کے سلسلے میں اس زمانے کے اعداد لئے گئے تھے جب فصلیں اوسط درجے کی یا اوسط

سے بھی زیادہ ہوئی تھیں۔ پھر اگر اچھی فصلوں کا یہ حال ہے تو خراب فصلوں کے زمانے کے نتائج تو یقیناً بدتر ہوں گے۔" لہٰذا ہماری تشخیص یہ ہے کہ موجود تبدیلی اور کسان کا اپنے آپ کو ان تبدیل شدہ حالات کے مطابق نہ بنا سکنا ہی اس مرض کا اصلی سبب ہے۔ یعنی دنیا بدل گئی ہے اور وہ اسی پرانی لکیر کا فقیر ہے۔

کسان کے افلاس کا خاص سبب یہی ہے کہ پس و پیش کے حالات کی وجہ سے وہ زراعت کو تجارت کی حیثیت سے اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور اس کی وہ قطعی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہ عرض کرنے سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ کسان فصول خرچ یا بے وقوف ہے بلکہ ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ تجارت کی کامیابی کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت کی ضرورت ہے اور کسی چیز کو طرز زندگی کے طور پر اختیار کرنے سے وہ بالکل مختلف ہے ممکن ہے نہایت ہوشیاری سے زراعت کے تمام کام انجام دینے کے باوجود اور اچھی سے اچھی فصل پیدا ہونے کے باوجود ایک کسان کو مصیبت کا سامنا رہے محض اس وجہ سے کہ اس نے غلط چیز بونا منتخب کیا تھا اسی طرح مال کو اس وقت فروخت کر دینے سے جب اسے محفوظ رکھنا چاہیئے تھا یا محفوظ رکھنے سے جب اسے فروخت کر دینا چاہیئے تھا وہ تباہ ہو سکتا ہے تجارت میں یہ دونوں چیزیں بہت اہم ہیں لیکن ایسے پیشے میں جو صرف طرز زندگی کے طور پر اختیار کیا گیا ہو اس کا کوئی کام نہیں ہے جیسے جیسے کسان طرز زندگی سے کنارہ کشی کر کے جدید تجارتی زندگی کی حقیقتوں کی طرف آتا جائے گا ویسے ہی ویسے وہ زیادہ مفلس اور بے بس ہوتا جائے گا۔ ہم یہ توقع تو نہیں کر سکتے کہ دنیا پرانے زمانے کی طرف لوٹ جائے البتہ ہم کسان کو صحیح راستہ بتا کر اس کی امداد تو کر سکتے ہیں تاکہ اس کی ہستی فنا ہونے سے بچ جائے۔

حصّہ سوم

زراعت کی خصوصیات

تمہید

زراعت کی کامیابی کا راز

جنگ عظیم کے بعد اکثر ممالک نے زراعت میں اصلاح کے طریقوں پر غور کرنے کیلئے کمیشن اور کمیٹیاں مقرر کیں۔ کیونکہ جنگ کے زمانے میں ہر ملک نے یہ محسوس کیا کہ جنگ کی کامیابی یا ناکامی دراصل خام پیداوار اور خصوصاً ان چیزوں کی افراط یا قلت پر منحصر ہے جو بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں۔ زندگی کے لئے غذا نہایت ضروری چیز ہے۔ اور زراعت کے ذریعہ سے وہ حاصل ہوتی ہے، اس لئے لازمی طور پر تمام قومیں اسطرف متوجہ ہوئیں اور انھوں نے اس اہم فن کو مضبوط اور مستقل بنیادوں پر قایم کرنے کے لئے پوری جدوجہد کی۔ باوجودیکہ ہندوستان کے مقابلہ میں دوسرے ملکوں کے کسانوں کی حالت اچھی ہے اور ان کے پاس کاشتکاری کا ساز و سامان بھی ترقی یافتہ ہے۔ پھر بھی وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ کسان کی آمدنی برابر کی تعلیم، اہلیت اور ذہانت رکھنے والے مزدور کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ ان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں زراعت میں سب سے کم آمدنی ہوتی ہے۔ اسی لئے لائق اور ذہین لوگ زراعت

کو ترک کر کے دوسرے پیشے اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اور زرعی آبادی میں برابر کمی ہوتی جاتی ہے۔ یہ واقعات سیاست دانوں اور اقتصادیات کے ماہروں کو چونکا دینے کے لئے کافی تھے اس لئے انھوں نے طے کیا کہ صورت حالات کی مفصل تحقیقات کی جائے۔ نقائص دور کر کے زراعت کو مضبوط بنیادوں پر قایم کیا جائے اور اس پیشے کو زیادہ دلچسپ اور مفید بنایا جائے۔ آئندہ چل کر ہم ان کمیشنوں کی پیش کی ہوئی تجویزوں اور علاج پر بھی بحث کریں گے۔ لیکن یہاں صرف ان چیزوں کا تذکرہ کرنا کافی ہے جو ان کے نزدیک زراعت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل نے اپنی آخری رپورٹ ۱۹۲۴ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی اور چند خاص خاص باتوں کو منتخب کر لیا جو زراعت کی بہتری کے سلسلے میں کافی اہمیت رکھتی تھیں۔ یہ باتیں محض انگلستان کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ (جیسا کہ خود رپورٹ میں درج ہے) دنیا کے ہر ملک پر منطبق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ ہم اپنے ملک کے لحاظ سے بھی انھیں باتوں پر تفصیلی بحث کریں جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ کسان خود اپنی قسمت کو بنا یا بگاڑ نہیں سکتا۔ بلکہ بعض چیزیں، جو مختلف صورتوں سے اسکی آمدنی پر اثر انداز ہوتی ہیں اس کے اختیار سے باہر ہیں +

ٹریبونل مذکور نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ[1] مختلف ممالک کے زراعتی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہر ملک میں زراعت کی کامیابی بہت سی چیزوں پر منحصر ہے۔ جن چیزوں کو ہم خصوصیت سے اہم سمجھتے ہیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۶۔

(۱) نظام حقوق اراضی جس میں چھوٹی چھوٹی جوت کا انتظام بھی شامل ہے۔
(۲) ملک کی مالی تنظیم خصوصاً درآمد پر محصول لگانا اور خاص خاص فصلوں کے لیے کسانوں کی مالی امداد کرنا۔
(۳) عام تعلیم کا انتظام کرنا۔ زراعتی تعلیم اور تحقیق (ریسرچ) کا خاص انتظام کرنا۔
(۴) زراعت کی اقتصادی تنظیم۔ خصوصاً کسانوں میں خرید و فروخت کیلئے امداد باہمی کے طریقوں کو رائج کرنا کوآپریٹو سوسائٹی کے ذریعہ قرضہ دینا۔ بیمہ وغیرہ کا انتظام کرنا۔
(۵) ایسے ادارے کا قیام جو موشیوں اور فصلوں کی اصلاح کرنے پیداوار کا معیار قایم کرنے اور گھاس اور کیڑوں کا انسداد کرنے کی اسکیم تیار کرے۔
(۶) رسل و رسائل۔ برقی قوت اور وائرلیس مہیا کرنے کا انتظام ضمنی دیہی صنعتوں کی امداد اور نئے جنگل لگانے کی کوشش۔
(۷) ایسی سرکاری اور غیر سرکاری جماعتوں کا قیام جو زراعتی پالیسی کو مرکزی اور مقامی طور پر عملی جامہ پہنائیں۔

ہم مذکورہ بالا ہر مد کی اہمیت پر سلسلہ وار اپنے ملک کے حالات کے لحاظ سے تفصیلی بحث کریں گے۔

باب اول

نظام[1] حقوق آراضی

زمین قومی سرمایہ ہے اور قوم کی خوش حالی اس پر منحصر ہے کہ وہ قدرت کے اس عطیہ کو کس طرح استعمال کرتی ہے۔ اس لئے ملک کی خوشحالی کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ زمین کو مختلف افراد میں تقسیم کرنے کا بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کیا جائے۔ تاکہ قوم اس کا بہترین استعمال کر سکے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زمین قومی سرمایہ ہے (اور بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے!) تو پھر ہر قوم کا فرض ہو جاتا ہے کہ قدرت کے اس عطیہ سے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے طریقے اختیار کرے۔ ٹریبونل مذکور کی رپوٹ میں بالکل صحیح لکھا ہے[2] کہ "معدنیات ایک مرتبہ نکال لینے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن زمین کی یہ دولت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک طریقہ سے ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔" زمین چونکہ خام پیداوار کا کبھی ختم نہ ہونے والا ذخیرہ ہے اور زراعت مختلف صنعتوں کے لئے خام پیداوار حاصل کرنے کا فن ہے۔ اس لئے ہر ملک کا یہ اولیں فرض ہے کہ اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرے نظام حقوق آراضی اس طرح ترتیب دینا چاہیئے جس سے کسان کو یہ اطمینان رہے کہ زمین کی پیداوار میں سے لگان و ٹیکس ادا کرنے کے بعد میرے لیے بھی کچھ بچ رہیگا کسان محنت و مشقت کے

---

[1] Land Tenure System [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰

بعد جو کچھ زمین سے پیدا کرتا ہے اگر وہ سب اسے ٹیکس یا کسی دوسری شکل میں دیدینا پڑے تو پھر وہ کیوں محنت کرے؟ اس لئے ملک کے ہر بہی خواہ کی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ اس کسان کو جو کھیت پر محنت اور مشقت کرتا ہے کافی معاوضہ مل سکے۔ وہ قوم کبھی سرسبز نہیں ہوسکتی جو اس ابتدائی اصول کو نظر انداز کردیتی ہے۔ اور اس شخص کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھتی۔ جو ملک کے لئے کھانے اور کپڑے کا سامان کرتا ہے۔

کسی کھیت سے زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی ترغیب دینے کے سلسلہ میں کسان کو سب سے پہلے یہ اطمینان دلانیکی ضرورت ہے کہ وہ بے دخل نہ کیا جائے گا۔ دراصل اسے اپنی زمین سے ذاتی دلچسپی ہونی چاہیے۔ بہترین صورت تو یہ ہے کہ کسان ہر قسم کی دست اندازی سے محفوظ ہو اور ساتھ ہی قوم کو بھی پورا حق حاصل ہو کہ جو کسان اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے اسے بے دخل کردے۔ ہم نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ پرانے زمانے میں زمین سارے گاؤں کی قومی ملکیت ہوتی تھی۔ اور پنچایت اسے مختلف افراد میں تقسیم کرتی تھی۔ پنچایت کو پورا حق حاصل ہوتا تھا کہ اچھی زمین ناکارہ کاشتکار سے واپس لے لے اور دوسرے شخص کو دیدے۔ جو اس میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرسکے۔ ان کو یہ بھی حق تھا کہ اگر کسی کا بہت بڑا کنبہ ہو اور اس کے حصہ کی زمین اس کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو تو وہ اس میں اضافہ کردے۔

درحقیقت اس زمانہ میں یہ خیال پیش نظر تھا کہ زمین قوم کی ملکیت ہے اور قوم کے منفعت کے مطابق اسے استعمال کرنا چاہیے۔ ذاتی ملکیت کا تخیل بالکل مفقود تھا۔ اس وقت نہ حق موروثی تھا اور نہ کسی فرد واحد کو بے دخلی کا اختیار تھا۔ اجتماعی طور پر ساری قوم کو یہ حق

حاصل تھا۔ بادشاہ کو بھی زمین کے انتظام میں دخل دینے کا حق نہ تھا۔ اسے پیداوار کے صرف ایک مقررہ حصہ کا حق پہنچتا تھا۔ چونکہ وہ بیرونی حملوں کی مدافعت کا ذمہ دار تھا اس لئے پیداوار میں سے اسے ایک حصہ دیدیا جاتا تھا۔ اب چاہے یہ پیداوار گاؤں کے مکھیا کے ذریعے سے جمع کیجاتی تھی یا براہ راست اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

زمین کی ملکیت کے سلسلہ میں ہندو تخیل یہ ہے کہ بادشاہ بھی زمین کا مالک نہیں ہے مشہور و معروف محقق جیمنی لکھتا ہے کہ "زمین بادشاہ کا عطیہ نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک اس کی ملکیت کا تعلق ہے سب برابر ہیں"

اس کی تشریح کرتے ہوئے سوارا سوامی نے لکھا ہے :-

کہ زمین کی ملکیت کا جس طرح بادشاہ کو حق ہے اسی طرح دوسروں کو بھی ہے۔ جہاں تک ملکیت کا تعلق ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بادشاہ ہونے کی وجہ سے اسے صرف اتنا حق حاصل ہے کہ زمین کی پیداوار کی حفاظت کے سلسلہ میں وہ اس میں سے ایک معقول حصہ لے لیا کرے "

سائن آچاریہ نے تیتریہ برہمن کے قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گیہ میں بادشاہ کو محض اپنی ذاتی ملکیت دان میں دینی چاہیے۔ زمین بادشاہ کی ملکیت نہیں ہے، اور اس لئے زمین کوئی بادشاہ دان میں ہرگز کسی کو نہیں دیسکتا شاعر کالی داس نے بھی اس خیال کو بڑی خوب صورتی سے نظم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کسانوں سے محاصل اس لئے وصول کرتا ہے کہ انھیں کی بہبودی کے لئے خرچ کرے۔ جیسے سورج زمین سے تری اس لئے جذب کرتا ہے کہ اسے

اور ہزار گنا کرکے واپس کرے۔

موجودہ حالت

پہلے پہل برطانوی حکومت میں زمین نیلام کے ذریعہ سے کاشت کیلئے زمینداروں کو دی گئی اور زمیندار کو زمین کا مالک تسلیم کیا گیا۔ جب بنگال پر برطانوی قبضہ ہوا تو بدترین قسم کی زمینداری وہاں رائج کی گئی۔ حتیٰ کہ زمیندار اور کاشتکار کے درمیان زمین میں مختلف قسم کے حقوق رکھنے والے چوبیس چوبیس درمیانی شخص تک پیدا کر دیئے گئے۔ اور اصل کاشتکار کو ان نام نہاد مالکوں نے حق ملکیت سے قطعی محروم کر دیا۔ اودھ میں ابتدا میں تو زمین کاشتکاروں کو ہی دی گئی لیکن بدقسمتی سے کچھ عرصہ بعد یہاں بھی زمینداری کا طریقہ رائج کر دیا گیا۔ اور تعلقداروں کو سندیں دیدیں گئیں۔ ملک کے نظام حقوق آراضی پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن بلاخوف تردید ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اب ملک میں قدیم نظام کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ ہندوستان میں نظام حقوق اراضی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ زمینداری اور رعیت داری ان دونوں طریقوں میں خاص فرق یہ ہے کہ زمینداری میں تو زمین کا مالک زمیندار ہوتا ہے اور رعیت داری میں حکومت۔ البتہ کاشتکار بھی حکومت کے دیئے ہوئے پٹے کو اسی طرح فروخت کر سکتا ہے جیسے زمیندار اپنی زمینداری کو زمیندار اپنی زمین کو عموماً خود کاشت نہیں کرتا۔ بلکہ کسان پر دوسرے کاشتکاروں کو اٹھا دیتا ہے۔ مانا کہ بعض زمیندار بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔ لیکن ان کے زیر کاشت بہت تھوڑی زمین ہے۔ اور وہ بھی رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے

نکل کر مہاجنوں کے پاس پہونچ رہی ہے۔ جس سے ان کی حیثیت ایک معمولی کاشتکار کی رہ جاتی ہے۔ اس قسم کے صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں کہ کتنا رقبہ زمینداروں کے زیر کاشت ہے۔ اور کتنا غیر زمیندار کاشتکاروں کے زیر کاشت صوبجات متحدہ میں ۲۹۰۲۹۹۰۷ ایکڑ میں سے صرف ۲۹۴۶۳،۵۸ سیر اور خود کاشت درج ہے اور اودھ میں ۹۸۶۶۷۷۱ میں سے صرف ۳۵،۳۹۴ ، پھر یہ امر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ سیر کا بہت کافی حصہ دوسرے کاشتکار کاشت کرتے ہیں۔ رعیت داری میں بھی صورت حالات اس سے بہتر نہیں ہے۔ بہت بڑا رقبہ شکمی درشکمی ہوتا ہے اور جس کے نام پر پٹہ ہوتا ہے وہ خود کاشت نہیں کرتا بلکہ حقیقی کاشتکار کوئی اور ہوتا ہے۔ اکثر بڑے بڑے پٹہ دار ایک چپہ زمین بھی خود کاشت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو زمین اٹھاتے ہیں۔ تاہم پٹہ داروں کے پاس زمینداروں کے مقابلہ میں خود کاشت رقبہ زیادہ ہوتا ہے۔ زمینداری اور رعیت داری دونوں صورتوں میں اصلی کاشتکار زمین کا مالک نہیں ہوتا۔ اگرچہ حکومت نے رعیت کو حق موروثی دیا ہے اور بے دخلی کے خلاف بھی کچھ تحفظ کیا ہے لیکن ایسے محفوظ کاشتکاروں کا اوسط بہت کم ہے۔ یعنی مشکل سے پچاس فیصدی سے کچھ کم ہی ہوگا۔

اصلی کاشتکار عموماً پٹہ دار یا زمیندار کو لگان ادا کرتا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات یہ خیال کریں کہ اس طرح کسان کو نسبتاً فائدہ رہتا ہوگا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ ہم نے پہلے بھی کہیں یہ لکھا ہے کہ زمین کی مانگ زیادہ ہے۔ اس لئے فطرتاً پٹہ دار یا زمیندار ایک کسان کو دوسرے کے مقابلہ میں کھڑا کر کے لگان بے انتہا

بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی کوئی روک تھام نہیں ہے۔ چونکہ حکومت زمیندار کے لگان پر اپنی مالگذاری مقرر کرتی ہے اس لئے وہ یہ تماشا دیکھتی رہتی ہے اور آئندہ بندوبست پر اپنی مالگذاری بھی بڑھا دیتی ہے۔ یہ صورت گذشتہ تیس سال سے مسلسل جاری ہے اور محنت و مشقت کرنے والے کسان کو کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرنیکی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ نہ زمیندار اسپر رحم کھاتا ہے اور نہ حکومت اسکا تحفظ کرتی ہے۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں قحط کمیشن[1] نے ایک ضابطہ کے ماتحت لگان مقرر کرنے کی اہمیت پر زور دیا تھا اور یہ سفارش کی تھی کہ لگان میں بھی صرف بندوبست کے وقت مالگذاری کے تناسب سے اضافہ ہونا چاہیئے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "ہماری رائے میں پرانا طریقہ پھر اختیار کرنے سے بہت کچھ خرابیاں دور ہوسکتی ہیں۔ یعنی لگان بھی صرف مالگذاری کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً بدلا جائے اور جو افسر مالگذاری مقرر کرتا ہے وہی لگان بھی مقرر کر دیا کرے۔ گویا افسر بندوبست کا یہ بھی فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ہر کھیت کا لگان بھی طے کر دے۔ (جنوبی ہند میں یہی طریقہ ہے) اور پھر لگان کی اس فہرست کی بنیاد پر ایک مقررہ تناسب سے مالگذاری طے کرے۔ اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ مختلف صوبوں کو یہ تجویز حکومت کے روبرو پیش کرنا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اس طرح زمینداروں کے ساتھ بے انصافی نہوگی۔ بہرحال ہماری رائے میں یہ طریقہ ملک کے لئے عام طور پر بہت مفید ہوگا۔ اس لئے تمام داخلی

[1] ملاحظہ ہو پیرا ۱۱۹

کاشتکاروں کے معاملہ میں اس کا نفاذ ہونا چاہئے۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو بنگال میں غالباً تیس سال سے پہلے لگان میں ترمیم نہ ہوگی اور مالگذاری استمراری بندوبست کی وجہ سے اس کے بعد بھی تبدیل نہ ہوگی۔" لیکن حکومت نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔ کیونکہ پھر ہر بندوبست پر لگان اور مالگذاری بڑھانے کا موقع کیسے ملتا؟ اس لئے جہاں تک زمین کے لگان کا تعلق ہے۔ کسان کی موجودہ حالت بڑی دردناک ہے۔

زمینداری کے نقائص

اس نظام میں جہاں کہاں اپنی کاشت کا خود مالک نہیں ہوتا، حسب ذیل نقایص ہیں :-

۱۔ کسان کا زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور چونکہ اسے بے دخلی یا آمدنی کے مقابلہ میں غیر متناسب اضافہ لگان کا ہمیشہ خوف لگا رہتا ہے اس لئے وہ کبھی زمین کی اصلاح اور ترقی کی پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ اصلاح اور ترقی میں خرچ تو اسے کرنا پڑتا ہے اور اضافۂ لگان کی صورت میں نفع زمیندار کو ہوتا ہے حالانکہ زمیندار اس سلسلہ میں نہ کوئی امداد کرتا ہے اور نہ خرچ کرتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی بہت ملیں گی کہ کسی کسان نے کنواں کھودنے کی کوشش کی۔ یا اپنے کھیت کی حالت سدھارنے کے لئے اسی قسم کی اور کوئی کارروائی کی تو اس کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کی گئی۔

۲۔ کسان ہمیشہ زمیندار کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ زمیندار سالم گاؤں کا واحد مالک ہو۔ یا اپنے علاقہ میں بااثر ہو۔ یہ غلامی

کسان کی اخلاقی حالت کو کمزور کر دیتی ہے۔ اور وہ ایک آزاد انسان کی حیثیت سے کام نہیں کر سکتا۔

۳۔ زمیندار ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے لگان بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس شخص کی بہبودی کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ جو اس کی جیب بھرتا ہے۔ اپنی جائداد سے انتہائی نفع حاصل کرنے کی غرض سے دو کوڑا کر حکومت کرنے کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ وہ گاؤں میں اختلافات پیدا کرتا ہے اور پارٹیاں بنواتا ہے۔ اس طرح وہ گاؤں کی جمہوری اور اجتماعی زندگی کی جڑیں کاٹتا ہے۔

۴۔ کسان اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ زمیندار کی نذر کرتا ہے اور خود ہمیشہ عسرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتا ہے۔

۵۔ طریق زمینداری نے ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جو قطعاً دوسروں کی آمدنی پر بسر کرنے کی عادی ہے۔ اور اسے اپنی اراضی کی ترقی سے جسکی وہ مالک ہے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جو زمیندار محض لگان پر گذارہ کرتے ہیں وہ سماج میں گویا مفت خوروں کی جماعت میں اضافہ کرتے ہیں اگر یہ لوگ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کریں یا اپنے کاشتکاروں پر ظلم کرنا شروع کر دیں تو ان سے سماج کو سب سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے عموماً جو لوگ بغیر محنت و مشقت کی آمدنی پر گذر کرتے ہیں، لہو و لعب میں پڑ جاتے ہیں۔ اور یہ چیز سماج اور ملک دونوں کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔

۶۔ اس سے دو جماعتیں ایسی بن جاتی ہیں جو آپس میں ہمیشہ برسر پیکار رہتی ہیں۔ اس اختلاف اور رنجش سے ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ لوگ

اپنا تمام وقت، روپیہ، اور قوت عمل سازشوں اور مقدمہ بازیوں میں صرف کرتے ہیں۔ جب تک زمیندار کا اثر و اقتدار رہتا ہے، کسان طرح طرح کے مظالم اور دست درازیوں کا شکار رہتا ہے۔ اور جہاں اس کا اثر کم ہوا کسان اسے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیر و زبر کرنے کی یہ کشمکش اسوقت تک جاری رہتی ہے جب تک دونوں تباہ نہیں ہو جاتے۔

۷۔ کسان کی ساکھ کے لئے اس کے پاس کوئی جائداد نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے اتنی زیادہ شرح سود پر قرض لینا پڑتا ہے۔ جسے زراعت کی آمدنی برداشت نہیں کر سکتی۔

۸۔ زمیندار کے دماغ میں برتری کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اس لئے وہ خود کھیت میں کام کرنے میں اپنی ذلت محسوس کرتا ہے۔ اور نوکروں سے کام کراتا ہے جس سے کسانوں کیلئے غلط مثال قایم ہوتی ہے۔

۹۔ جب کبھی قحط پڑتا ہے یا فصل ماری جاتی ہے تو زمیندار اسے چھپاتا ہے اور مالگذاری میں کمی کرنے کی مخالفت کرتا ہے کیونکہ مالگذاری کی کمی سے لگان میں بھی کمی ہو جاتی ہے گویا اس کے منافع پر اثر پڑتا ہے دوسری جانب حکومت کا بھی اسی میں نفع ہے کہ چاہے فصلیں بالکل تباہ ہو گئی ہوں لیکن زمیندار اپنے مفاد کے لحاظ سے قحط یا قلت کو تسلیم نہ کرے۔

۱۰۔ ہر تیس سال کے بعد بندوبست ہوتا ہے اور مالگذاری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ زمیندار کو بھی کبھی اضافۂ مالگذاری کے تناسب سے اور کبھی غیر تناسب طور پر اضافہ لگان کی اجازت دیدی جاتی ہے۔

۱۱ - لگان یا مالگذاری مقرر کرتے وقت ہر حکومت کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ کاشت کی واقعی آمدنی کی بنا پر محاصل مقرر کرے لیکن بدقسمتی سے نہ تو زمیندار اور نہ حکومت اس قسم کی جانچ پڑتال کرتی ہے، بلکہ مقابلہ سے بڑھائے ہوئے لگان پر مہر تصدیق ثبت کر دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز کسان کی اقتصادی حالت کے لئے بہت زیادہ مضر اور خطرناک ہے۔

۱۲ - طریق زمینداری میں کسان کو زمین بہتر بنانے کے لئے روپیہ نہیں ملتا اور زمیندار اس کی پروا نہیں کرتا کہ اپنی جائداد کی اصلاح اور ترقی کے لئے باضابطہ غور و فکر اور کوشش کرے۔

دنیا کے دوسرے ممالک بہت پہلے ان مشکلات کو محسوس کر چکے ہیں۔ اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زمین کا مالک ہونے سے کسان اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ اور زمین سے اسے ایسی دلچسپی اور اتنا تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو اور کسی دوسرے طریقہ سے نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ نجی معاملہ ہو یا انجمن ہائے امداد باہمی کا۔ بہرصورت اس سے کسان کی ساکھ قایم رہتی ہے یورپ کے اکثر ممالک میں حکومت کسانوں کو ایسی سہولتیں بہم پہونچاتی ہے کہ وہ زمینداروں سے زمین حاصل کر سکے۔ مثلاً انھیں کم شرح سود پر (جو عموماً ۳ فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی) روپیہ قرض دیتی ہے اور پھر تیس سال یا ۶۰ سال کے طویل عرصہ میں قسط وار وصول کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں ڈنمارک کی تاریخ بڑی مفید اور سبق آموز ہے۔ وہاں کے بہت سے محققین کی رائے میں ڈنمارک کی خوشحالی کا خاص سبب یہی ہے کہ

کسان خود زمین کا مالک ہے۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں ان کاشتکاروں کی تعداد جو زمین کے مالک نہ تھے ۴۲½ فیصدی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۰۵ء میں یہ اوسط کم ہوکر صرف ۱۰ فیصدی رہ گیا۔ اور آج ۹۲ فیصدی کاشتکار اپنی آراضی کے خود مالک ہیں۔ اس کا مقابلہ ذرا پنجاب کے حالات سے کیجئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں زمین کی آمدنی پر بسر کرنے والوں کی تعداد ۶ لاکھ ۲۶ ہزار تھی جو سنہ ۱۹۲۱ء تک بڑھ کر ۱۰ لاکھ ۸ ہزار ہوگئی۔ ہم نے پنجاب کے مثال اس لئے پیش کی ہے کہ وہاں قانون انتقال اراضی موجود ہے۔ اور زمین کاشتکاری نہ کرنیوالی قوموں کو منتقل نہیں کی جاسکتی۔ ظاہر ہے کہ دوسرے صوبوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔

انگلستان میں سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان تھوڑی تھوڑی اراضی حاصل کرنے کے قانون سے کسانوں کو زمین حاصل کرنے میں بڑی امداد ملی۔ سنہ ۱۸۴۸ء ہی میں ایک زبردست سیاسی جماعت "کسانوں کے دوست" کے نام سے بن چکی تھی۔ اس جماعت نے ایسے قانون پاس کرانے پر خاص زور دیا جن کی رو سے تعلقہ داروں کو مجبور کیا جاسکے کہ وہ اپنے قدیم حقوق کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کردیں۔ دوسری جانب زمینداروں کی سوسائٹی خود آگے بڑھی اور زمینداروں کو یہ ترغیب دی کہ وہ بخوشی اپنی زمین کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کردیں۔ بالآخر سنہ ۱۸۶۱ء میں ایک ایسا قانون پاس ہوگیا جسکی وجہ سے زمینداروں کو اپنی زمین فروخت کرنے کی خود بخود تحریک پیدا ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بھی لحاظ رکھا گیا کہ انھیں

اتنا زبردست معاوضہ ادا نہ کیا جائے جس کے بوجھ سے دب کر کسان ہمیشہ کے لئے بے دست و پا ہو جائے اور نہ پرشیا کی طرح اتنا زبردست رقبہ منتقل کیا جائے جس کا سنبھالنا کسان کے امکان سے باہر ہو۔ یہ قانون اگرچہ ۱۸۹۹ء تک نافذ رہا۔ لیکن اس سے بہت قبل وہ اپنا کام کر چکا تھا ۱۸۶۱ء سے ۱۸۹۰ء تک اس قانون کی وجہ سے بیشتر زمینداریاں کسان کی ملکیت ہوگئیں۔ ۱۸۹۹ء میں پھر وہ اہم قانون منظور ہوا جس میں مالکوں کی تعداد بڑھانے کا مشہور اصول مدنظر رکھا گیا تھا۔ اس قانون کی رو سے خریداروں کو جائداد کی (جس میں عمارت اور سامان بھی شامل تھا) مجموعی قیمت کا ۹۰ فیصدی روپیہ حکومت قرض دیتی تھی۔ نئی آراضی کی وسعت اور قیمت مقرر کر دی گئی تھی قرضہ کی ادائیگی کی شرائط بہت آسان تھیں۔ ابتدائی پانچ سال تک صرف ۳ فیصدی سود لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب تک کل رقم ادا نہ ہو جائے۔ اصل کے طور پر ۲½ فیصدی اور لیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۶ء کے ایکٹ کے ماتحت مفاد عام کی کمپنیوں کو بھی قرض دیا جانے لگا۔ یہ کمپنیاں بڑی بڑی جائدادیں خرید لیتی تھیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے قطعات کر کے کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیتی تھیں۔ قرض ادا ہو جانے کے بعد کسان کی ذاتی ملکیت ہو جاتی تھیں۔ انھیں فروخت کرنے کا اختیار تھا۔ لیکن مزید تقسیم کرنے کا اختیار نہ تھا۔ ۱۹۱۹ء کے قوانین کی رو سے چھوٹے چھوٹے جوت بنانے کے لئے حکومت کو اور جائدادوں پر بھی اختیار حاصل ہو گیا۔

تقریباً تمام ممالک میں زراعت کی ترقی کے لئے یہ لازمی سمجھا جاتا ہے کہ کسان خود اپنی کاشت کا مالک ہو۔ اس لئے زمینداروں سے معمولی قیمت پر زمین

تحصیل کرنے کی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی طرح جرمنی جیسے صنعتی ملک میں بھی یہ کوشش کی گئی کہ کسان زمین کا مالک ہو جائے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ملک اپنی زراعت کو ترقی دینا چاہے اسے زمین کی ملکیت کسان کو منتقل کرنے کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ ورنہ کسان کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ ناقص نظام حقوق آراضی بھی زراعت کی ترقی میں حائل ہوتا ہے۔ جہاں وراثت کا مسئلہ درپیش ہوا کہ مقدمہ بازی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ قانون اراضی لگان و مالگذاری اتنے سادہ ہونا چاہیئے کہ وکلا اور عدالتوں کی امداد کے بغیر ان کا نفاذ ہو سکے۔ پٹواری کی طرح کے ملازم درحقیقت عوام کے خادم ہونا چاہیئے اور ان کو اہم معاملات میں اتنا دخل نہ ہونا چاہیئے جیسا آجکل ہے کیونکہ اس سے ہمیشہ بدعنوانیوں کا امکان رہتا ہے۔ ہندوستان جیسے مفلس اور غیر تعلیم یافتہ ملک میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے کہ کسانوں کو بلاوجہ پریشانیاں اور غیر ضروری اخراجات برداشت نہ کرنا پڑیں۔ محکمہ مال میں کاشتکار کا شجرہ اور ورثاء کی فہرست موجود رہنی چاہیئے اور جب کوئی وراثت کا نیا سوال اٹھے اس سے مدد لینا چاہیئے انتقال آراضی اور وراثت کے قانون آسان اور عام فہم بنانا چاہیئے اور ملکی زبان میں ہونا چاہیئے تاکہ عام طور پر لوگ انھیں خود پڑھ اور سمجھ سکیں۔

باب دوم

ملک کی مالی تنظیم خصوصاً درآمد پر محصول لگانا اور خاص خاص فصلوں کے لئے کسانوں کی مالی امداد کرنا

عام طور پر یہ خیال ہے کہ زراعتی مال کی قیمت قرب وجوار یا بحیثیت مجموعی تمام دنیا کی مانگ پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک مال بھیجنے میں رسل ورسائل کے ذرائع اور خبر رسانی کے وسائل کو خاص دخل ہوتا ہے۔ اس لئے مختلف ممالک کی درآمد برآمد اور قیمتوں کے تعین پر کرایہ اور محصول کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ عموماً یہ صحیح ہے لیکن دراصل طلب ورسد کے علاوہ اور بہت سے حالات بھی قیمتوں کے مدوجزر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انگلستان میں زراعتی مال کی قیمتوں کے استحکام کے سلسلہ میں حال ہی میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی، اس کمیٹی نے ان تمام امور کی مفصل تحقیقات کی جنپر قیمتوں کا انحصار ہے اور اپنی تائید میں چند ماہرین اقتصادیات کی رائے بھی پیش کی۔ ہم اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

ہیوم ایک مشہور ماہر اقتصادیات ہے وہ لکھتا ہے کہ "قیمتوں کا انحصار اس چیز پر ہے کہ ملک میں رائج سکہ کی مقدار کسقدر ہے اور بازار میں کس مقدار میں مال موجود ہے" ایک دوسرا ماہر ریکارڈو لکھتا ہے کہ "سکہ کے کم وبیش ہونے کے تناسب سے

مال کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے"۔ اور یہ اصول ناقابل تردید ہے۔ اسی طرح اقتصادیات کے مشہور مصنف جان اسٹورٹ مل کا خیال ہے کہ اگر سکہ کی مقدار میں اضافہ ہو جائے تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور اگر مقدار کم ہو جائے تو قیمتیں گر جاتی ہیں۔ مسئلہ زر کا یہ بالکل ابتدائی اصول ہے اور اس کے بغیر کوئی دوسرا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا" دار الامرا کی ۱۸۳۷ء کی کمیٹیوں کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک بہت بڑی کاشتکار مسٹر جان لیوٹن نے کہا تھا کہ جب ملک میں سکہ کی رقم بڑھ جاتی ہے تو ہمارے مال کی قیمتیں بھی اچھی اٹھتی ہیں۔ لیکن سکہ کی تعداد جب کم ہو جاتی ہے تو قیمتیں بھی گر جاتی ہیں۔ میں گذشتہ بیس سال سے بینک کے کاروبار کو غور سے دیکھ رہا ہوں۔ جب بنک آف انگلینڈ زیادہ تعداد میں نوٹ جاری کرتا ہے تو قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ کمی کر دیتا ہے تو قیمتیں بھی گر جاتی ہیں"۔ ان آرا سے اتفاق کرتے ہوئے کمیٹی مذکور نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ "کسانوں کی زبوں حالی کی اور کوئی چیز تنہا اتنی ذمہ دار نہیں ہے جتنی سکہ کی مقدار کی وجہ سے روپیہ کی قیمت"۔

یہ ان ماہرین کی سلمہ رائے ہیں جنھوں نے زراعتی مال کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی تحقیقات کی ہے۔ ہندوستان کے تمام تاجروں کی بھی یہی رائے ہے وہ ایک عرصہ سے چلا رہے ہیں کہ حکومت نے روپیہ کی مصنوعی قیمت برقرار رکھنے کے لئے ناجائز روپیہ اختیار کر رکھا ہے۔ گذشتہ پانچ سال میں (یعنی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک) ملک کی مروجہ سکہ کی مقدار میں ۹۹ کروڑ ۶۷ لاکھ روپیہ کی کمی ہو گئی جب کسی ملک کی حکومت مروجہ سکہ کو اپنے خزانہ میں بند کر لیتی ہے تو زراعتی

مال کی معقول قیمت کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔ ہندوستان خام پیداوار باہر بھیجنے والا ملک ہے۔ اس لئے غیر ممالک کا مفاد اسی میں ہے کہ قیمتیں کم رہیں یہ چیز مروجہ سکہ کی مقدار کو کم کرکے آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جن حضرات نے کرنسی کے کم و بیش ہونے کی وجہ سے قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس معمولی سی ترکیب سے کسان کو گذشتہ چند سال میں کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوگیا۔ کسی آزاد ملک میں عرصہ تک حکومت کو یہ مذموم کارروائی جاری رکھنے کی ہرگز اجازت نہ دی جاتی۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ حال ہی میں برطانوی حکومت نے اپنے ملک کے مفاد کی خاطر طلائی معیار ترک کیا تھا۔ اسوقت ہمارے روپیہ کو ناجائز طور پر پونڈ سے منسلک کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے زراعتی مال کی قیمتوں میں مصنوعی اضافہ ہوگیا۔

ہندوستان کو اپنی مالی پالیسی پر کوئی اختیار نہیں ہے اس لئے یہ کبھی ملک کے مفاد کے مطابق طے نہیں کی جاتی۔ ساری تجارتی جماعت نے متفقہ طور پر یہ مطالبہ کیا تھا کہ شرح تبادلہ اور کرنسی کی پالیسی طے کرنے کے لئے ایک ریزرو بنک قائم کیا جائے لیکن حکومت نے اس اہم مطالبہ کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ جب ۱۹۲۹ء میں ریزرو بنک بل اسمبلی میں پیش ہوا تو حکومت نے اس امر پر اصرار کیا کہ کسی سیاست داں کو بنک کا ڈائرکٹر مقرر نہ کیا جائے۔ اس کے بعد حکومت نے بل واپس لے لیا اور پھر اسے پیش نہ کیا۔ سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی نے بھی اس امر پر زور دیا تھا کہ جلد از جلد ریزرو بنک قائم کیا جائے

لیکن اب تک اس سلسلہ میں کچھ بھی نہوا۔ اور اب جبکہ ریزرو بنک قایم ہوا تو اسکو یہ اختیارات نہیں دیئے گئے۔ کہ وہ شرح تبادلہ میں میں کوئی دست اندازی کرسکے۔ یہ امید نہیں کیجاسکتی کہ انگلستان کی حکومت آسانی سے ہندوستانیوں کو اس اہم معاملہ میں کوئی اختیار دیگی۔ دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں مالی تحفظات کے متعلق جو بحث ہوئی اس سے کافی اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا کس رخ پر چل رہی ہے۔

شرح تبادلہ

شرح تبادلہ کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ساری دنیا میں سونا تبادلہ کا معیار ہے، اور شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں سونے کا سکہ اپنے ملک میں چلانے اور دوسرے ممالک کے سکے تبدیل کرنے کے لئے رائج نہو۔ اگر سونیکا سکہ رائج ہو تو سکہ کی شرح تبادلہ مصنوعی طور پر مقرر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہندوستان اس معاملہ میں بھی بہت بدقسمت ہے۔ حکومت نے ہمیشہ وعدے کئے کہ وہ یہاں بھی سونے کا سکہ جاری کردیگی۔ لیکن کبھی مستقل طور پر اسپر عمل نہیں کیا۔ ہمیں غریب اچھی طرح معلوم ہے کہ سونے کا سکہ ایک مرتبہ جاری کرنے کے بعد پھر کیوں واپس لے لیا گیا۔ ایک نہ ایک بہانہ سے ہندوستان کو اس سے محروم رکھا جارہا ہے۔ اور سونے کی مصنوعی قیمت قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر حکومت ہند کا یہ منشا ہے کہ اس ملک میں سونے کا سکہ رائج نہ کیا جائے تو پھر شرح تبادلہ سونے کے بجائے چاندی کی قیمتوں کے مطابق مقرر کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی نہیں کیا جاتا۔ اسمبلی کے ایکٹ یا حکومت ہند کے حکم

سے روپیہ کی شرح تبادلہ مقرر کردی جاتی ہے۔ اور یہ کوشش ہوتی ہے کہ روپیہ کی قیمت زیادہ سے زیادہ شرح پر مقرر کیجائے۔ گویا ملک کے تمام مالی وسائل کو مصنوعی تناسب قائم رکھنے کے لئے برباد کیا جاتا ہے۔

تعلیم یافتہ اور اخبار بیں طبقہ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ اسمبلی کے تقریباً تمام منتخب شدہ ممبروں کی مخالفت کے باوجود حکومت نے زبردستی روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس مقرر کردی حالانکہ سارا ملک ایک شلنگ چار پنس چاہتا تھا۔ اس طرح کاشتکاروں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال سستا فروخت کریں۔ حال ہی میں جب برطانیہ نے یہ اعلان کیا کہ ان کا سکہ سونے میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ تو ہندوستان میں روپیہ کو مناسب قیمت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس صورت میں انگلستان اپنا مال سستا کرکے یہاں نہ بھیج سکتا۔ مثلاً پونڈ کی قیمت ۱۳/۱ ہے اور انگلستان سے جو مال آتا ہے اسی شرح سے اس کی قیمت ادا کیجاتی ہے لیکن دوسرے ممالک کے ایک پونڈ کے مال کے عوض میں ہندوستان کو بیس روپے دینا پڑتے ہیں۔ گویا اس طرح ہندوستان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ غیر برطانوی مال پر ۱۳/۱ فی پونڈ زیادہ خرچ کرے۔ ورنہ مال انگلستان سے خریدے۔ اگر روپیہ کو پونڈ کے ساتھ منسلک نہ کیا جاتا تو یہ صورت نہ ہوتی۔ اسی طرح اسی شرح تبادلہ کی بنا پر زراعتی مال کی قیمت انگلستان کے علاوہ دوسرے ملکوں سے کم ملتی ہے۔ یعنی ایک پونڈ کے عوض میں ہندوستان ۱۳/۱ کا مال انگلستان کو اور بیس روپیہ کا دوسرے ممالک کو دیتا ہے۔ ملتا

بہرصورت ایک پونڈ ہے۔ لیکن اس کے عوض میں انگلستان کو کم مال جاتا ہے۔ اور دوسرے ممالک کو زیادہ۔ اس طرح ہم مجبور کئے جاتے ہیں کہ مال انگلستان ہی بھیجیں۔ غرضیکہ زراعتی مال کی قیمتوں کے معاملہ میں ہر ہر قدم پر ہندوستان کے سامنے مشکلات پیش کی جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں بری طرح گرتی ہیں اور کسان کو زبردست نقصان ہوتا ہے

شرح بنک

مروجہ سکہ کی کمی اور شرح تبادلہ کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی اتنا ہی موثر ہے اور وہ شرح بنک ہے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں شرح بنک پانچ فیصدی سے کبھی کم نہیں ہوتی۔ حالانکہ دوسرے ممالک میں عموماً ۳ فیصدی رہتی ہے۔ ابھی حال میں انگلستان نے اپنے ہاں کی شرح بنک انتہائی کم کردی تاکہ تجارت اور صنعت و حرفت کے لئے آسانی سے کافی روپیہ میسر آسکے۔ کہتے ہیں کہ گذشتہ بیس سال میں اتنی کم شرح سود کبھی نہ ہوئی تھی۔ لہذا یہ سوال ہوسکتا ہے کہ کیا انگلستان اسقدر جلد یکایک اتنا دولتمند ہوگیا کہ شرح سود اتنی کم کردی!۔ یا اس نے اس قلیل عرصہ میں دیگر ذرائع سے کہیں سے روپیہ حاصل کرلیا۔ اور کیا غیر ممالک کو اس نے اپنا تمام قرضہ ادا کردیا۔! نہیں بلکہ جن لوگوں کے دلوں میں قوم کا درد ہوتا ہے، وہ اسی قسم کی صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان میں جب روپیہ افراط سے بھی ہوتا ہے اور آسانی سے ۳ فیصدی پر مل بھی سکتا ہے۔ اسوقت بھی حکومت بنکوں کو مجبور کرتی ہے کہ شرح سود زیادہ رکھیں

اگر بنک کی شرح کم ہوجائے تو کسان کو کم شرح سود پر روپیہ مل سکے۔ جو لوگ مہاجن کو زیادہ سود لینے کا الزام دیتے ہیں غالباً یہ محسوس نہیں کرتے کہ شرح بنک زیادہ رکھکر حکومت کتنی کھلی ہوئی بے انصافی کرتی ہے اور اس طرح گویا کاشتکار کو مجبور کرتی ہے کہ وہ زیادہ سود پر روپیہ قرض لے۔

موجودہ زمانہ میں جبکہ زمینوں کی قیمتیں یکایک گر گئی ہیں تمام تجارت بری حالت میں ہے اور قرضہ ادا ہونے کی کوئی سبیل نہیں رہی ہے۔ تو بنک کی شرح سود بھی کم ہوگئی ہے۔ مگر ایسے آڑے وقت میں بھی حکومت نے کاشتکاروں کے شرح سود کو کسی قانون کے ذریعہ کم کر دینے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس کمی سود کے وقت میں ملک کی ترقی اور قرضہ کی ادائیگی کی کوئی سبیل نکالی

سرکاری قرضہ جات

ایک چوتھی اہم وجہ بھی ہے جس کی بنا پر زراعتی پیداوار کی قیمتوں پر خراب اثر پڑتا ہے۔ گورنمنٹ زیادہ شرح سود پر قرض لیتی ہے اس طرح ملک کا سارا پس انداز روپیہ سرکاری خزانہ میں چلا جاتا ہے اور نہ تو نئی صنعتوں میں استعمال ہو سکتا ہے اور نہ زراعت کی اصلاح و ترقی میں کام آتا ہے۔ قرضہ لیتے وقت زیادہ کرنسی بھی جاری نہیں کیجاتی نہ یہی لحاظ کیا جاتا ہے کہ فصل کٹنے وقت جبکہ خود کسان کو روپیہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے قرضہ نہ لیا جائے۔ اگر ایسے اہم موقع پر چلتا ہوا روپیہ سرکاری قرضہ کیصورت میں جمع کر لیا جائے۔ اور اس طرح شرح سود بڑھا دی جائے تو خواہ مخواہ زراعتی پیداوار کی قیمت

معمول کے خلاف بہت زیادہ گر جائے گی۔

مزید کرنسی کی ضرورت

ایک پانچویں وجہ بھی ہے اگرچہ ایک حد تک وہ چوتھی وجہ میں شامل ہے یعنی ہندوستان میں روپیہ کی مانگ ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ بلکہ بازار کی حالت کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ فصل کٹتے وقت روپیہ کی مانگ سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن فصل کے بعد پھر بہت کم رہ جاتی ہے۔ معمولی صورت حالات قایم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فصل کٹتے وقت کرنسی میں اضافہ ہو جایا کرے اور جب مانگ کم ہو تو کرنسی بھی کم ہو جانا چاہئے۔ لیکن یہاں اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسان کو اپنی پیداوار بہت ہی کم قیمت پر فروخت کر کے سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

مالی امداد

اس پیچیدہ مسئلہ کی تفصیلات سے ہمیں یہاں تعلق نہیں ہے۔ لیکن کسان کی ترقی سے فطرتاً اس کا ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہم ذرا تفصیل سے اس بحث کرنے پر مجبور ہیں۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ یہ چیزیں نہ صرف مفلس کسان پر اثر انداز ہوتی ہیں، بلکہ بڑے بڑے لکھ پتی تاجر بھی ان کے آگے مجبور ہیں، مالیات کے ان پیچیدہ مسائل کے علاوہ درآمد پر محصول لگانا اور نئی فصل پیدا کرنے کے لئے کسان کی مدد کرنا ایسے طریقے ہیں جو کسان کی بہبودی میں بڑا حصہ رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی ملک میں کسی نئی چیز کے پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ہمیشہ کاشتکار کو معقول امداد دی جاتی ہے۔ تاکہ ابتدائی نقصان کی تلافی

ہو سکے۔ ناظرین اچھی طرح واقف ہوں گے کہ جب جرمنی نے چقندر سے شکر بنانیوالوں کو امداد دینا شروع کی تو اس نے تمام دنیا کے بازاروں کو شکر سے بھر دیا۔ ہندوستان کی شکر سازی کی صنعت تو دوسرے ممالک کی اس امداد یافتہ صنعت کے مقابلہ میں قریب قریب تباہ ہو چکی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ صورت عرصہ تک جاری نہ رہی اور دوسری صنعتوں کے معاملہ میں اعلیٰ پیمانہ پر اس کا تجربہ نہیں کیا گیا۔ حال میں حکومت برطانیہ نے امداد دیکر انگلستان میں شکر سازی کی ہمت افزائی کی۔ یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جہاں تک ہمیں علم ہے انگلستان کی آب و ہوا اور دیگر حالات اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اپنی ضرورت کے لائق شکر تیار کر سکے۔ لیکن پھر بھی انگریز یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں کم از کم اپنی ضروریات کے لئے کافی شکر تیار کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ خواہ کچھ ہی خرچ کیوں نہ آئے۔ حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۴ء میں قانون امداد شکر سازی بنایا۔ جسکی رو سے شکر اور شیرہ بنانے والوں کو زبردست مالی امداد دینا طے کیا۔ اسکی تفصیل ذیل میں ملاحظہ کیجیئے۔

شکر تیار کردہ از ۱۳ ستمبر ۱۹۲۴ء تا یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء پر ۹ شلنگ ۸ پنس سے ۹ شلنگ ۶ پنس تک فی ہنڈریڈ ویٹ
" " ۱۹۲۸ء پر ۶ شلنگ ۵ پنس سے ۱۳ شلنگ تک "
" از ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء پر ۳ شلنگ ۲ پنس سے ۱ شلنگ ۶ پنس تک "

گویا ہندوستانی اوزان کے لحاظ سے ہر شکر ساز ابتدائی چار سال میں زیادہ

سے زیادہ ۹ روپیہ فی من اعلیٰ قسم کی شکر اور ۴ روپیہ فی من ادنیٰ قسم کی شکر پر پانے کا مستحق تھا۔ اگر ہندوستان میں بھی ادنیٰ قسم کی شکر پر ایک شلنگ ۵ پنس سے لیکر ۱۲ شلنگ ۴ پنس فی ہنڈرڈ ویٹ تک امداد کا اعلان کر دیا جائے۔ تو ہر شکر ساز نہایت کامیابی کے ساتھ جاوا کے شکر سازوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کسی صنعت پر حکومت کی اس امداد کا جو اثر ہوتا ہے ناظرین اس کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

حکومت جاپان نے بھی شکر سازی کے لئے امداد دینے کا یہی طریقہ اختیار کیا۔ کتاب موسومہ "جاپان کی صنعت و تجارت" کا مصنف لکھتا ہے کہ شکر سازی کی ترقی در اصل حکومت کی ہمت افزائی اور اسکی مالی امداد کا نتیجہ ہے۔ جو عموماً صنعتوں کی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں حکومت جاپان نے شکر کی درآمد پر محصول لگایا اور اسی سال ماہ جون میں قانون امداد شکر سازی فارموسا منظور کیا۔ ساتھ ہی اس صنعت کو سرکاری امداد دینے کے سلسلے میں قواعد و ضوابط بنائے۔ قانون مذکور کی خاص مدات حسب ذیل تھیں

قانون ہذا کے ماتحت حکومت ان لوگوں کو جو گنے کی کاشت کریں گے یا کچی شکر تیار کریں گے، حسب ذیل امداد دے گی۔

(۱) گنے کے بیج کی قیمت۔

(۲) کھاد کی قیمت

(۳) کاشت کے اخراجات۔

(۴) شکر سازی کی مشین اور اوزار

۲۲ء میں اس قانون میں کچھ ترمیم ہوئی اور مصری پر امداد دینا منسوخ کر دیا گیا اور گنے کے بیج کیلئے امداد دینے کے بجائے حکومت بیج خود مہیا کرنے لگی۔ موجودہ قانون شکر سازی کے خاص خاص دفعات مختصراً حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جس شخص کے پاس اپنا ذاتی گنے کا کھیت ہوگا اور جدید مشنری سے شکر سازی کریگا اس کو بیج حکومت مفت دیگی۔

۲۔ گنے کے کھیتوں میں آبپاشی کرنے اور نالیاں بنانے کے نصف اخراجات حکومت ادا کریگی۔ اور اس سلسلہ میں مشینوں اور اوزاروں کی جو ضرورت ہوگی وہ حکومت حسب موقع عاریتاً یا مفت دیگی۔ امداد کی مجموعی تعداد بہرصورت ۱۵ ہزار سالانہ سے زیادہ نہوگی۔

۳۔ شکر سازی کی مشینیں اور اوزار ہر شخص کو جسے حکومت مناسب سمجھے گی عاریتاً دے گی۔

شکر کی درآمد حسب ذیل محصول لیا جاتا ہے۔

شرح محصول فی ایک سو کن

۱۱ ڈچ اسٹنڈرڈ سے کم	۵ر۲ ین
۱۵ " "	۱۰ر۳ ین
۱۸ " "	۳۵ر۳ ین
۲۱ " "	۲۵ر۴ ین

باقی ڈچ اسٹنڈرڈ سے کم ۵ ر ۴ ین

قند۔ کوزہ ۔ مصری ۔ اور اسی قسم کی دوسری شکر ۴۰ ر ۷ ین

(ا) ایسی کھانڈ کی بنی ہوئی اشیا جس میں کھانڈ کی مقدار ۳۰ ر ۷ ین
گنے کے حساب سے ۶ فیصدی سے زائد نہ ہو

(ب) دیگر ۵۰ ر ۲ ین

جہاں تک ہمیں علم ہے ہندوستان کے کسان کو کسی زراعتی مال کی تیاری کے سلسلہ میں کبھی کوئی امداد نہیں دی گئی ۔ حکومت نے حالانکہ شکر پر کروڑوں روپیہ محصول وصول کیا ۔ لیکن اس ضروری صنعت کی ہمت افزائی اور امداد کے لئے کبھی تھوڑی سی رقم بھی خرچ کرنا گوارا نہ کیا ۔

درآمد پر محصول

دوسرے ملکوں کے مال کی درامد پر محصول لگانے سے بھی زراعت کی بہت کچھ امداد ہوتی ہے ۔ انگلستان نے ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ آزاد تجارت کا علمبردار ہے اور ہندوستان کو بھی یہی تلقین کی ہے ۔ اقتصادیات کے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب انگلستان نے آزاد تجارت کی حمایت شروع کی ۔ اسوقت وہ صنعتی ملک بن چکا تھا ۔ اور اسنے اپنی صنعت و حرفت کی بنیادیں اچھی طرح مضبوط کرلی تھیں ۔ اول تو انگریزوں میں اتنی وطن پرستی ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کی بنی ہوئی چیزوں کی سرپرستی کرتے ہیں ۔ دوسرے مختلف چیزوں کی تیاری میں انگلستان پیش پیش تھا ۔ اس لئے وہ اچھی طرح تجارتی مقابلہ کی تاب لاسکتا تھا ۔ انگلستان ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اس لئے انگریزوں کو

اپنی خوراک کے لئے اجناس وغیرہ اور اپنے کارخانوں کے لئے خام پیداوار کے درآمد کرنے کی ضرورت تھی۔ دوسری جانب اپنے تیار شدہ مال کی نکاسی کی ضرورت تھی۔ اس لئے اس کا مفاد اسی میں تھا کہ دنیا کو آزاد تجارت کی تلقین کرے تاکہ دوسرے ممالک کے بازاروں پر قبضہ کر سکے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ انگلستان نے جو آزاد تجارت کو اپنی قومی پالیسی بنایا یہ کچھ انصاف پسندی یا حق پرستی کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ ذاتی فائدے کی بنا پر تھا۔ اگر واقعی انگلستان آزاد تجارت کے اصول کا علمبردار تھا تو اس نے ہندوستانی تجارت کے خلاف کیوں تحفظات قایم کئے۔ خود اپنے لئے محصول کی اونچی اونچی دیواریں قایم کرنا اور ہندوستانی مال کی درآمد روکنے کے لئے قانون کی پناہ لینا اس کا کافی ثبوت ہے کہ اس نے آزاد تجارت کا اصول اقتصادی مسلک کے طور پر نہیں۔ بلکہ اپنے نفع کی خاطر اختیار کیا ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ کا ذکر ہے جب تجارت معقول اقتصادی اصولوں پر قایم نہ تھی۔ لیکن آج بھی انگلستان نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے اور غیر ملکی مال کی درآمد سے محفوظ رہنے کے لئے محصولوں کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کرنی شروع کر دی ہیں۔

جرمنی میں بھی درآمد کے محصول سے زراعتی آبادی کو بڑی امداد ملی۔ ذیل میں ہم زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوگا کہ درآمد پر محصول لگانے سے کس طرح جرمن کسان تجارتی مقابلہ سے محفوظ رہا اور تباہی سے بچ گیا۔

کچھ عرصہ تک آزاد تجارت کی پیروی کرنے کے بعد ۱۸۷۹ء میں جرمنی نے پھر تحفظات اختیار کر لئے۔ زراعت کے سلسلہ میں یہ نہ صرف اس لئے ضروری تھا کہ خود جرمنی کے بازاروں میں غیر ملکی مقابلہ کا خطرہ بڑھتا جاتا تھا بلکہ یورپ کی غلہ کی منڈیاں بھی جرمنی کے زمینداروں کے ہاتھ سے نکلتی جاتی تھیں۔ اور اس طرح آزاد تجارت سے جو نقصان ہوتا تھا اسکی تلافی کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ چونکہ جرمن قوم کی خاص غذا دیوگندم تھا اور گیہوں کے مقابلہ میں دیوگندم تین گنے رقبہ میں کاشت ہوتا تھا اس لئے انھیں امریکہ کے گیہوں سے اتنا خطرہ نہ تھا جتنا روس کے دیوگندم سے۔ تاہم ۱۸۷۹ء میں بہت خفیف سا محصول عاید کیا گیا۔ لیکن ۱۸۸۴ء میں درآمد کے غیر معمولی طور پر بڑھ جانے سے جب قیمتیں زیادہ گر گئیں، تو اس میں معقول اضافہ کر دیا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں انمیں پھر اضافہ ہوا۔ اور فروری ۱۸۹۲ء تک یہی صورت قایم رہی۔ اجناس کے محصول کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

محصول فی میٹرک ٹن (مارک مین)

	گیہوں	دیوگندم	جو	جئی
یکم اکتوبر ۱۸۷۹ء سے ۳۰ جون ۱۸۹۵ء تک	۱۰	۱۰	۵	۱۰
یکم جولائی ۱۸۸۵ء سے ۲۵ نومبر ۱۸۸۷ء تک	۳۰	۳۰	۱۵	۱۵
۲۶ نومبر ۱۸۸۷ء سے ۳۱ جنوری ۱۸۹۲ء تک	۵۰	۵۰	۵۰	۴۰

گیہوں پر شلنگ کے حساب سے فی کوارٹر حسب ذیل محصول تھا:۔

۱۸۷۹ء	۲ شلنگ ۲ پنس
۱۸۸۵ء	۶ " ۶ ½ "
۱۸۸۸ء	۱۰ " ۱۰ ½ "
۱۸۹۲ء	۷ " ۷ ½ "
۱۹۰۶ء	۱۱ " ۱۰ " (از سر نو اضافہ)

ان محصولوں سے جرمنی کو جو فائدہ پہونچا، زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل نے اسکا حسب ذیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے[1]۔

"بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی نے محصولات کی امداد سے (اگرچہ محصولات ہی تنہا سبب نہ تھے) نہ صرف اپنی زراعت کو اصلی حالت پر قایم رکھا، بلکہ پیداوار میں اضافہ کر لیا۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی اپنے کسانوں کو زراعت میں مصروف رکھنے میں کامیاب ہوا زرعی اقتصادیات کے ماہرین کی یہ عام رائے ہے کہ اس سلسلہ میں محصولات سے بھی بہت کافی امداد ملی۔"

یہی صورت فرانس میں بھی ہوئی۔ چنانچہ رپوٹ مذکور[2] میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے۔

فرانسیسی محققین کی رائے سے اختلاف کرنیکی کوئی وجہ نہیں ہے کہ تباہ کن مقابلہ سے اگر تحفظ نہ کیا جاتا تو کسان اس قابل نہ رہتا کہ سائنس یا امداد باہمی سے فائدہ اٹھا سکے۔" فرانسیسی مدبر ڈیشنیل نے ۱۸۱۹ء میں لکھا تھا

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۴۹ [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۵۲

"لوگ کہتے ہیں کہ زراعت کی مشکلات کا حل محصولات سے نہیں بلکہ سائنس سے ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے، لیکن محصولات ہی تو سائنس کی ترقی کا دروازہ کھولتے ہیں۔ اور سائنس کی تمام ترقی درآمد پر محصول لگانے پر مبنی ہوتی ہے"۔

مذکورہ بالا سطور سے ناظرین نے اندازہ کیا ہوگا کہ انگلستان جرمنی اور فرانس جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی بارہا یہ کوشش کی گئی کہ کسان کو ناجائز مقابلہ سے پناہ دی جائے۔ جرمنی کے مدبرین کا قول ہے کہ ہمیں اپنی ضروریات کے لئے جو چیزیں مطلوب ہیں حتی الامکان انھیں بلا محصول یا خفیف سا محصول لگا کر آنے دیا جائے۔ لیکن اسکی وہ بہت احتیاط رکھتے ہیں کہ تیار شدہ سامان کی صورت میں کوئی چیز زبردست محصول دیئے بغیر داخل نہونے پائے۔ ان کا اصول یہ ہے کہ اگر خوراک کی کوئی چیز باہر سے منگانا ہی پڑے تو کم از کم اس کی تیاری پر جو کچھ صرف ہو وہ اپنے ہی ملک کے لوگوں کی جیب میں جائے۔ مثلاً گیہوں پر وہ ۳ شلنگ ۹ پنس فی ہنڈریڈ ویٹ محصول لیتے ہیں، لیکن آٹے پر ۹ شلنگ ۴ پنس لیتے ہیں تاکہ دوسرے ملکوں سے جرمنی میں گیہوں تو آسکے مگر آٹا نہ آسکے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کو اناج یا تلی بھیجنے کے بجائے آٹا اور تیل باہر بھیجنا چاہیئے۔ وہ شاید یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ دوسرے ممالک بہت ہوشیار ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ہندوستان کسی صنعت میں ترقی کرے پھر وہ کیوں ہندوستان کی تیار شدہ اشیاء یعنی آٹا اور تیل اپنے ملک میں آسانی سے آنے کی اجازت دینے لگے۔

قدیم ممالک کے مقابلہ میں ان ملکوں میں جہاں کاشتکاری کی ابتدا ہوئی ہے بڑے بڑے رقبوں میں کم خرچ پر آسانی سے زیادہ پیداوار ہو سکتی ہے۔ اگر آزاد تجارت کے اصول پر عمل کیا جائے تو وہ ممالک بالکل تباہ ہو جائیں۔ جہاں یہ سہولتیں میسر نہیں ہیں گذشتہ دو برس میں کناڈا اور آسٹریلیا سے کافی تعداد میں ہمارے یہاں گیہوں آیا اور ہمارے بازاروں میں دیسی گیہوں سے بھی کم قیمت میں فروخت ہوا۔ بہت کچھ احتجاج ہونے کے بعد حکومت نے یہ محسوس کیا کہ باہر کا گیہوں آنے کی اجازت دینا واقعی ملک کے ساتھ بے انصافی ہے چنانچہ محصول لگا کر درآمد روکدی۔ یہی صورت شکر کی ہوئی۔ اسپر بھی حال ہی میں حکومت نے صنعت شکرسازی کی امداد کرنے کے لئے محصول لگایا ہے۔ اگر حکومت یہ کارروائی نہ کرتی تو شکر کی قیمت پانچ روپے فی من تک گر جاتی اور کوئی ہندوستانی کارخانہ اس کی تاب نہ لا سکتا۔ شکرسازی کے بہت سے نئے کارخانوں کا قیام اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اگر ملک کے تاجروں کو حکومت کی معقول مدد کا یقین ہو جائے تو آج ہندوستان میں ہزاروں نئے کارخانے جاری ہو سکتے ہیں۔

ناظرین نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ غریب کسان کو اس کی محنت کا معاوضہ ملنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے معقول پالیسی اختیار کی جائے۔ ملک کے ان حالات پر کسان کو بدقسمتی سے کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کسان کو اپنی پیداوار کی بہت کم قیمت ملتی ہے۔

آج تمام ممالک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ اور محنت کے معاوضہ میں پیداوار

کی مستقل اور معقول قیمت ملنے کا انتظام کرنا ہی کسان کی سب سے بڑی امداد ہے اور یہی وہ بنیادی اصول ہے جس پر کسان کی خوش حالی منحصر ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر دوسرے ممالک ایسی ایسی صورتیں اختیار کرتے ہیں جس سے ہر جنس کی ایک مصنوعی مستقل قیمت مقرر ہو جائے۔ مثلاً حکومت کسی چیز کی ساری پیداوار خرید لیتی ہے پھر اس کی کم از کم قیمت مقرر کر کے فروخت کرنے کا انتظام کرتی ہے اپنے ملک سے جو زائد بچتا ہے وہ باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ اسطرح جو نقصان ہوتا ہے وہ سرکاری خزانہ برداشت کرتا ہے۔ کسان کو یہ اطمینان دلانے کے لیے کہ اسے معقول معاوضہ مل جائے گا۔ یہ بہترین طریقہ ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، فی الحال ایک خوشگوار خواب سے زیادہ اسکی کوئی وقعت نہیں۔

بہرحال یہ ثابت ہوا کہ کسان کی خوش حالی بہت سی ایسی مصنوعی چیزوں پر منحصر ہے۔ جنپر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جو آسانی سے اسکی قسمت کو بنا اور بگاڑ سکتی ہیں۔

باب سوم

عام تعلیم اور زراعتی تعلیم و تحقیق کا انتظام

ہندوستان میں زراعتی تعلیم کی حالت

سائنس کے موجودہ دور میں زراعت کی ترقی میں زراعتی تعلیم و تحقیق کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن عام تعلیم کے مکمل نظام کے بغیر کسی صنعت و حرفت کی معقول تعلیم نہیں دی جاسکتی تعلیم در اصل ترقیوں کا سنگ بنیاد ہے۔ زراعتی رائل کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں لکھا ہے[۵۱] کہ "عام تعلیم اور تعلیم نسواں کے اعداد سے عیاں طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کے کمزور ترین پہلو کیا ہیں۔ تعلیم کا سب سے ضروری مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کم از کم معمولی طور پر لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ اس کے بغیر دیہاتیوں میں ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں مروجہ ناقص نظام تعلیم کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص محنت مشقت نہیں کرسکتا اس لئے وہ کاشتکاری کیلئے موزوں نہیں ہے۔ عملی زندگی میں آئے دن جو تجربہ ہوتا ہے وہ اس خیال کو اور زیادہ پختہ کرتا ہے۔ ترقی کے تمام شعبوں میں خصوصاً اقتصادیات میں عام اور مکمل تعلیم

---

۵۱ ملاحظہ ہو ص ۵۱۹

کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہندوستانی کے سامنے ملازمت کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ یا پھر وہ طب اور وکالت کے پیشے اختیار کرے جنہیں اس وقت بھی ضرورت سے زیادہ لوگ موجود ہیں۔ موجودہ تعلیم اسے کسی مصرف کا نہیں چھوڑتی۔ نہ اسے کشاکش حیات کا جرات کیساتھ مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ خود اعتمادی اس میں بالکل مفقود ہوتی ہے اور وہ ایسے ایماندارانہ پیشوں سے نفرت کرتا ہے جن میں دست و بازو سے محنت کرنا پڑے۔ بدقسمتی سے کسان بھی یہ جانتا ہے کہ اسکولوں کے تعلیم پائے ہوئے لڑکے جنہیں کہیں ملازمت نہیں مل سکتی۔ پھر گھر کے کام کے بھی نہیں رہتے کھیتوں میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا تو کجا وہ نگرانی کا کام بھی نہیں کر سکتے۔ اور گھر والوں کو کسی قسم کی امداد پہونچانے کی بجائے الٹا انپر بار ہو جاتے ہیں۔ زراعتی اسکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں ہوتی ان کا نقطہ نظر بھی عموماً وہی ہوتا ہے جو عام اسکولوں کے لڑکوں کا۔ یہ سب اس ناقص تعلیم کا نتیجہ ہے جو غیر ملکی حکومت کے ماتحت اس بدقسمت ملک میں رائج ہے۔ اس نہایت ہی اہم مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث کرنا ہمارے موضوع باہر ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ملک کے مفاد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ زراعت کی مزید اصلاح و ترقی ممکن ہی نہیں ہے جب تک کسانوں میں فوراً تعلیم کو رواج نہ دیا جائے تاکہ وہ یہ اندازہ کر سکیں کہ انھیں کہاں اور کیوں نقصان ہوتا ہے۔ اور اپنی حالت خود درست کر سکیں۔ تعلیم یافتہ کسان بہتر طریقہ سے کسانوں کی تنظیم کر سکتے ہیں۔ اور زراعتی ترقی کے لئے خود اعتمادی

پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل نے بھی عام تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔

عام تعلیم

یہ مشہور بات ہے کہ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط ساری دنیا سے کم ہے۔ برطانوی ہند کی ۲۴ کروڑ آبادی میں سے ۱۹۲۱ء میں صرف ایک کروڑ ۸۶ لاکھ افراد پڑھے لکھے تھے۔ تعلیم کا اوسط مردوں میں ۱۲ فیصدی اور عورتوں میں ۸ء۱ فیصدی تھا۔ دیہاتی علاقہ کے اعداد و شمار جداگانہ موجود نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ شہری علاقہ کے اعداد کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم ہوں گے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں دیہاتوں کی تعداد ۷۰۴۹۸۵۲ تھی۔ ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۷۱۳۸۶ اور ثانوی مدارس کی تعداد ۱۱۵۶۶۔ گویا کل تعداد ۱۸۲۹۵۲ تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اوسطاً ہر ۲ء۲ گاؤں کے درمیان ایک مدرسہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کی اس تعداد میں شہروں اور قصبوں کے مدارس کی کافی تعداد شامل ہے۔ اگر کافی رعایت کے ساتھ تخمینہ کیا جائے تو ہر تین گاؤں میں ایک مدرسہ کا اوسط پڑے گا۔ اوسطاً ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا فاصلہ پانچ میل ہوتا ہے۔ گویا چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم حاصل کرنا بھی ممکن نہیں ہے جب تک وہ کافی فاصلہ روزانہ طے نہ کریں۔ اسی وجہ سے بہت کم تعداد، تعلیم پا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ابتدائی تعلیم

ختم کرنے کے بعد مزید تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ دیہاتوں میں نہ دارالمطالعے ہیں نہ کتب خانے۔ اور نہ ایسی کتابوں کا انتظام ہے جنہیں پڑھنے سے کاشتکاروں کو نفع پہونچے۔ تمام سرکاری مطبوعات انگریزی میں شائع ہوتی ہیں اور زراعتی رپورٹیں وغیرہ بھی ملک کی زبان میں نہیں ملتیں یا جو ملتی ہیں ان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ انھیں مشکلات اور مجبوریوں کی وجہ سے کسان محکمہ زراعت کی کارروائیوں اور دیگر ممالک کی ایجادوں اور تحقیقاتوں سے قطعی ناواقف رہتا ہے۔ علاوہ ازیں تعلیم کے سلسلہ میں اگر کوئی نجی کوشش کیجائے تو محکمہ تعلیم بے انتہا ہمت شکنی کرتا ہے۔ اگر کسی اسکول میں کوئی نیا خاص نصاب تعلیم جاری کیا جائے یا ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی منظور شدہ نہ ہوں تو گرانٹ دینے سے انکار کیا جاتا ہے۔ اور اس کے راستہ میں قدم قدم پر مشکلات پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی جاتی ہے کسقدر افسوس کی بات ہے کہ حکومت اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کا قطعی احساس نہیں کرتی۔ اور تعلیم کو رواج دینے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتی۔ زراعتی رائل کمیشن نے اس سلسلہ میں حکومت کی بے حسی اور ناگفتہ بہ حالات کا اس طرح تذکرہ کیا ہے[۵۱]:-

"ملک میں ۶۵ فیصدی مدارس نجی ہیں۔ اگرچہ حکومت کی جانب سے ان کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ ۳۳ فیصدی میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈوں کے

---

[۵۱] ملاحظہ ہو ص ۵۱۵

ماتحت ہیں اور صرف ۲ فیصدی براہ راست حکومت کے زیر انتظام ہیں" اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اگر نجی مدارس کو نظر انداز کر دیا جائے تو باقی مدارس کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ پھر ان ابتدائی مدارس میں بھی لڑکوں سے فیس لی جاتی ہے۔ گویا اس طرح غریب کسان کو اپنی مفلسی کے باوجود مالگذاری اور ٹیکس کے علاوہ تعلیم کی قیمت بھی حکومت کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب عام طور پر اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم دینا ہر حکومت کا اولین فرض ہے۔ اور ہر مہذب ملک میں مفت اور لازمی تعلیم کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں جب کبھی حکومت کی توجہ اس اہم مسئلہ کیطرف مبذول کرائی گئی تو اس نے کسی نہ کسی شکل میں اس کی مخالفت ضرور کی اس معاملہ کی تفصیلات میں جانا بے کار ہوگا۔ جس کسی صوبہ میں حکومت رائے عام سے مجبور ہوگئی وہاں محض محدود علاقہ میں تجربہ کے طور پر اسے جاری کیا۔ زراعتی رائل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے[1]۔

"اعداد کا مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ بہت کم بچے جنکی عمر تعلیم پانے کے قابل ہے خوشی سے مدرسے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد میں ذرا سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے، پھر بھی صورت حالات نہایت مایوس کن ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد طلبار کے تناسب سے بھی اور ویسے بھی غیر معمولی طور پر کم ہے"[2] کمیشن مذکور آگے چلکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۵۱۹ - [2] ملاحظہ ہو ص ۵۲۳۔

"ہمیں یقین ہے کہ تعلیم کو رفتہ رفتہ لازمی قرار دینے ہی سے والدین کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسے بھیجیں اور ان کی تعلیم جاری رکھیں۔ یہ کچھ ہندوستان ہی پر منحصر نہیں ہے کہ والدین اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجنے سے گریز کرتے ہیں، بلکہ ہر ملک میں یہی صورت ہوتی ہے اور ہندوستان جیسے غریب ملک میں تو فطرتاً اس کا امکان ہے۔ کیونکہ یہاں تو وہ کام میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں اس لئے اگر وہ اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجیں تو ان کا نقصان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر وہ اچھے کسان نہیں بنتے اور ان کے لئے ذرا بھی کارآمد نہیں ہوتے۔ اگر واقعی حکومت تعلیم کو کسان کے لئے مفید بنا سکے اور اس میں کوئی کشش پیدا کر سکے تو ہندوستانی کسان اتنا بیوقوف نہیں ہے کہ تعلیم سے استفادہ حاصل کرنے سے انکار کر دے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کا محکمہ ہندوستانی وزراء کے زیر نگرانی ہے اور ابتدائی مدارس ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ کے ماتحت ہیں۔ اسلئے ملک کے منتخب شدہ نمائندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیم کا معقول انتظام کریں۔ اور اگر وہ کوتاہی کرتے ہیں تو حکومت کو کیوں مورد الزام قرار دیا جائے۔ ہم ہندوستانی وزراء یا میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی وکالت نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن جہاں تک ہمیں ان اداروں کا تجربہ ہے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مالی حالت اس قابل بھی نہیں ہے کہ وہ موجودہ اسکولوں کو چلا سکیں۔ وہ بیشتر سرکاری گرانٹ کے محتاج ہوتے ہیں۔

یہی صورت ہندوستانی وزرا کی ہے۔ پھر بھی انھیں یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے زمانہ میں تعلیم نے اس سرعت سے ترقی کی ہے جیسی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن روپیہ کے بغیر کوئی بھی اس مہم کو سر نہیں کر سکتا۔ اگر حکومت وزیر تعلیم کی منشا کے مطابق تعلیم پر روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہو جائے تو آپ دیکھیں گے بہت جلد لازمی تعلیم رائج ہو جائے گی۔ سائمن کمیشن نے بھی اس چیز کو تسلیم کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جہاں تک زیر تعلیم طلبا کی تعداد کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ نفاذ اصلاحات کے بعد سے غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں تمام برطانوی ہند میں ۶،۴۰،۲۰۰ طلبا زیر تعلیم تھے۔ سنہ ۲۲ء میں یہ تعداد ۶،۸۹،۱۴۷ ہو گئی اور اسوقت سنہ ۱۹۲۷ء میں ۹،۲۴،۶۱۷ ہے۔ اصلاحات کے بعد سے ابتدائی تعلیم پر خرچ بھی اسی نسبت سے بڑھا ہے چنانچہ سنہ ۱۸۹۷ء سے سنہ ۱۹۲۷ء تک کے پنج سالہ اعداد ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

سال	خرچ سالانہ
سنہ ۱۸۹۷ء	۱ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۲ء	۱ کروڑ ۱۸ لاکھ "
سنہ ۱۹۰۷ء	۱ کروڑ ۵۵ لاکھ "
سنہ ۱۹۰۷ء	۲ کروڑ ۰۷ لاکھ "
سنہ ۱۹۱۲ء	۲ کروڑ ۹۳ لاکھ "
سنہ ۱۹۲۲ء	۵ کروڑ ۰۹ لاکھ "

اگر یہ اعداد تعلیمی ترقی کے متعلق صحیح رہنمائی کرتے ہیں تو یہ ثابت ہوا کہ اصلاحات کے نفاذ کے بعد سے حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے"۔ ہر شخص یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ سوویٹ روس کے بدنام دور حکومت میں کتنی تعلیمی ترقی ہوئی ہے۔ سوویٹ یونین کے ۱۹۲۹ء کے سالنامے میں حسب ذیل واقعات درج ہیں [۵]۔

"ہر سو بچوں میں جنکی عمر تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہے ۱۰۱ زیر تعلیم ہیں شہروں کا اوسط ۹۸ر۴ فیصدی اور دیہاتوں کا ۶۶ فیصدی ہے۔ یہ اوسط رفتہ رفتہ برابر بڑھ رہا ہے خصوصاً دیہاتی علاقوں میں۔

جنگ عظیم سے قبل سب سے آخری مردم شماری ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اسوقت ۸ سال سے زیادہ عمر کے ۹ر۳۷ فیصدی مرد اور ۵ر۱۲ فیصدی عورتیں تعلیم یافتہ تھیں۔ اس کے بعد آئندہ پندرہ سال تک تعلیم نے کوئی زیادہ ترقی نہ کی۔ کیونکہ روس میں یہ زمانہ انقلاب کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۶ء میں جو مردم شماری ہوئی اس سے ظاہر ہوا کہ سوویٹ نے تعلیم پھیلانے کی جو سرگرم کوشش کی وہ بار آور ہو رہی ہے۔ روس کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں کی اکثریت لکھ پڑھ سکتی تھی۔ یعنی ۸ سال سے زیادہ عمر کے ۵ر۶۰ فیصدی مرد اور ۷ر۳۶ فیصدی عورتیں تعلیم یافتہ نکلیں"

---

[۵] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۰

اگر چودہ سال کے قلیل عرصہ میں ایک ایسی حکومت جو سیاسی حیثیت سے بدنظمی کے لئے بدنام ہے اور مالی حیثیت سے دیوالیہ کہی جاتی ہے۔ ایسے حیرت انگیز کارنامے کر سکتی ہے تو اس حکومت کو تو اور بہتر مثال پیش کرنی چاہیئے جہاں انتظام بھی اچھا ہو اور مالی حالت بھی کافی مستحکم اور قابل اطمینان ہو۔ اب ذرا ان اعداد کا ہندوستان کے اعداد سے مقابلہ کیجئے۔ اس ہندوستان کے اعداد سے جسے حکومت خوشحال کہتے نہیں تھکتی۔ برطانوی ہند میں جن بچوں کی عمر تعلیم پانے کے قابل ہے ان میں سے بہت ہی کم مدرسے جاتے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں حکومت ہند نے ڈاکٹر وولکر کو ملک کے زراعتی حالات کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا تھا انہوں نے اپنی رپوٹ میں خاص طور پر یہ سفارش کی تھی کہ ملک میں عام تعلیم رائج کیجائے اور زراعت کیلئے دیسی زبانوں میں کتابیں تیار کیجائیں۔ ان کے نزدیک بھی زراعت کی ترقی اور اصلاح کے لئے سب سے پہلی چیز عام تعلیم تھی۔ آج ۳۹ برس ہو چکے ہیں لیکن حکومت نے عوام میں تعلیم پھیلانے کے لئے کوئی کاروائی نہیں کی۔ رہا دیسی زبانوں میں زراعت پر کتابیں تیار کرنے کا معاملہ۔ تو وہ بس ناگفتہ ہے۔ درحقیقت حکومت کی اس افسوسناک سرد مہری کی وجہ سے کسانوں کی حالت اتنی خراب ہے اور جب تک تعلیم کافی نہ پھیل جائے اصلاح کا کوئی امکان نہیں ہے۔

تعلیم کی قدر و قیمت

تعلیم سے انسان ایک مکمل اور ہوشیار شہری بن جاتا ہے۔

یہ ملک کا ایسا سرمایہ ہے جو نقدی کی صورت میں شمار نہیں کیا جا سکتا
مسٹر فشر نے ایکمرتبہ برطانوی دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے تعلیم کے
متعلق حسب ذیل اظہار خیال کیا تھا۔

"عام طور پر ہم لوگوں سے کیا توقع کرتے ہیں؟ یہی کہ وہ اچھے
شہری بنیں۔ مہذب اور فرض شناس ہوں۔ ذہنی اور جسمانی حیثیت
سے قوی ہوں۔ مختلف دستکاریوں میں پوری دستگاہ رکھتے ہوں
اور اپنے خالی وقت کو کارآمد بنانے کے قابل ہوں" ۱۹۱۷ء میں تعلیم
کے لئے مزید رقم منظور کرانے کے سلسلہ میں صاحب موصوف نے پھر فرمایا
تھا کہ "جب کبھی ہم کسی نفع بخش خرچ پر غور کریں ہمیں نہ صرف کارآمد طریقہ سے
سرمایہ لگتا ہو۔ بلکہ جس سے آئندہ کے خطرات کا تحفظ بھی ہوتا ہو۔ تو ہمیں
تنہا یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ آیا اس روپیہ سے کافی آمدنی ہو سکے گی نہ ہمیں
یہ سوال کرنا چاہیے کہ آیا ہم اس مقصد کے لئے روپیہ نکال بھی سکتے ہیں بلکہ یہ
دیکھنا چاہیے کہ کفایت شعاری کی عام چیخ پکار کے باوجود ہمیں انسانی سرمایہ
کا تحفظ کرنا ہے جو بہت بیش قیمت ہے اور جو اب تک برباد کیا جاتا
رہا ہے"۔ مسٹر فشر کی رائے میں انسانی سرمایہ کا تحفظ کرنا اور اس کو زیادہ
سے زیادہ مفید بنانا قوم و ملک کے لئے سب سے ضروری بات ہے۔ بریڈفرڈ
میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

"چاہے آپ محاذ جنگ پر جاکر افسران سے دریافت کیجئے یا ہیڈ کوارٹر
کے دفتر میں جائیے یا اسلحہ جات اور رسد کے کارخانوں میں جائیے ہر جگہ

آپ کو ایک ہی جواب ملیگا کہ تعلیم یافتہ افسر اور سپاہی بہرحال بہتر اور مفید تر ہوتا ہے۔ اور تعلیم انسان کو ہر کام کے قابل بنانے کا ذریعہ ہے"

مانچسٹر میں ایک اور تقریر کے دوران میں انہوں نے تعلیم کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں اپیل کی تھی

یہ الفاظ ہندوستان پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ "میں ایسی سماج پیدا کرنے کی درخواست کرتا ہوں جس میں نہ صرف کسی خاص فرقہ کے نوجوانوں بلکہ ساری قوم کے نوجوانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہو کہ تعلیم حاصل کرنا روزی کمانے سے مقدم ہے۔ آجکل تو یہ صورت ہے کہ امراء تعلیم حاصل کرتے ہیں اور غرباء روزی کماتے ہیں۔ تعلیم ہم پر نوجوانوں کا ازلی قرض ہے۔ خواہ وہ غریب ہوں یا امیر۔ ہمیں یہ قرض ادا کرنا ہے اور انہیں بہرحال وہ تعلیم دینا ہے جو وہ حاصل کر سکتے ہیں اور جو ہم دے سکتے ہیں"

ہندوستان کے اسٹیچوٹری کمیشن کی رپورٹ[1] میں ہندوستان کی تعلیمی حالت کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"مجموعی طور پر ہندوستان میں بیس سال سے زیادہ عمر والوں میں ۱۷ فیصدی مرد اور صرف ۲ فیصدی عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ صوبہ وار اس عمر کے تعلیم یافتہ مردوں کا اوسط حسب ذیل ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ۱ صـ۳۹۳

بنگال ۲۴٫۵ فیصدی	پنجاب ۹٫۷ فیصدی
مدراس ۲۱٫۴ "	سی پی ۱۰٫۴ "
بمبئی ۱۸٫۴ "	بہار و اڑیسہ ۱۲٫۶ "
یوپی ۸٫۹ "	آسام ۱۵ "

برما ۲۲٫۶ فیصدی

موجودہ تعلیم کے نقائص

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ عام تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس پر زراعتی تعلیم کی عمارت تعمیر کیجا سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جو طریقہ تعلیم ہمارے یہاں رائج ہے اس میں اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ عام مدارس میں اسکی کوشش نہیں کی جاتی۔ کہ لڑکوں میں زراعت سے دلچسپی پیدا ہو۔ ان میں نہ تو کھیتوں میں کام کرنے کا شوق پیدا کیا جاتا ہے اور نہ دست و بازو کی محنت مشقت کرنے کا جذبہ۔ یہی وجہ ہے کہ جو لڑکے زراعتی کالجوں میں داخل ہوتے ہیں وہ زراعت سیکھنے کے شوق سے نہیں، بلکہ اس لئے داخل ہوتے ہیں کہ ملازمت کی ایک نئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ہائی اسکول تک زراعتی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اور اگر کہیں ہائی اسکول کے امتحان کے لئے زراعت بھی ایک اختیاری مضمون ہے، تو انتظام اتنا ناقص ہے اور تعلیم اتنی خراب کہ اس سے اعلیٰ زراعتی تعلیم میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ پھر ایگریکلچرل کالج میں طلبا کو زراعتی تعلیم دی جاتی ہے ظاہر ہے کہ جن طلبا کو دس برس تک کی

تعلیم میں زراعت سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو ان کو ایک دم زراعتی تعلیم دینا سراسر غلط اور صرف بیجا ہے۔ ڈنمارک میں بھی زراعتی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی ہے اور یہ تعلیم ہائی اسکول تک ختم ہو جاتی ہے انٹرنس پاس کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کسان کے پاس یا کسی دودھ کے کارخانے وغیرہ میں کام کر سکے۔ کالج میں زراعتی تعلیم بہت کم لڑکے حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ بیشتر تحقیقاتی کاموں تک محدود ہوتی ہے۔ ہمارے زراعتی کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوان کاشتکار و بیر عملاً اپنی فوقیت ثابت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایک، تو انھیں زراعتی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ دوسرے عام مدرسوں میں زراعت کی ابتدائی تعلیم نہیں دی جاتی۔ اس لئے ہمارے زراعتی مدارس میں مصنوعی اور غیر حقیقی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بڑی حد تک زراعتی تعلیم کی ترقی میں حائل ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی زراعتی کالج میں جائیں تو وہاں کی عام فضا بھی دوسرے کالجوں سے مختلف نہیں پائیں گے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہم نے ان کالجوں کی تعلیمی حالت پر اعتراض کرنے میں زیادتی سے کام لیا ہے لیکن اگر کسی درخت کے متعلق اس کے پھلوں کو دیکھکر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زراعتی تعلیم بالکل ناکارہ ثابت ہوئی ہے۔ اگر ان کالجوں کے فارغ التحصیل طالب علم اپنے فارم کھول کر انھیں کامیابی سے نہیں چلا سکتے تو خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ تعلیم ناقص ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت بھی بالواسطہ طور پر یہ تسلیم کرتی ہے کہ ہندوستان کے

کالجوں میں اعلیٰ قسم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ کیونکہ جب کبھی کوئی بڑی زراعتی تحقیقات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ باہر سے ماہرین زراعت کو بلایا جاتا ہے اور ہندوستانیوں کو اس کام کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس ترجیحی سلوک کی خاص وجہ محض نسلی امتیاز ہے بلکہ ہمارا یہ اعتراض ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو معقول تعلیم دی جاتی تو یقیناً زراعتی تحقیقاتیں ان کو ذمہ دارانہ طور پر سپرد کیجا سکتیں۔ ہندوستان میں زراعتی تعلیم و تحقیق کی سب سے بڑی درسگاہ پوسہ میں ہے۔ اس کے عملے میں صرف ایک ہندوستانی تھا۔ اگر ہماری اطلاع صحیح ہے تو اس کو بھی چند روز ہوئے ترقی دیکر اس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ اور اب وہ سبکدوش ہو چکا ہے۔ اگر بیرونی ماہرین کی امداد اور غیر معمولی اخراجات کے باوجود چند ہندوستانی بھی اس قابل نہ ہو سکے کہ یہ اہم کام ان کے سپرد کیا جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس سارے نظام میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے۔ جسکی فوراً اصلاح ہونا چاہیئے۔ اور اگر اصلاح ناممکن ہے تو بہتر ہے کہ اسے بالکل ختم کر دیا جائے تاکہ غریب رعایا اس غیر ضروری بار سے بچ جائے۔ زراعتی کالجوں کی تعلیم عملی نوعیت کی ہونی چاہیئے۔ جس سے ان کے اخلاق کی اصلاح ہو اور انمیں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو تاکہ جب وہ اپنی تعلیم ختم کرکے باہر نکلیں تو کسانوں کی رہنمائی اور تنظیم کر سکیں۔ اور ان کی حالت سدھار سکیں۔

جب زراعتی ریسرچ کونسل کا مسئلہ شاہی زراعتی کمیشن کے سامنے

پیش ہوا تھا۔ تو نوآبادیات کے نمائندوں نے صاف صاف یہ کہا تھا کہ اس محکمہ میں اتنے غیر ملکی لوگ کسی ملک میں ملازم نہیں ہیں۔ جتنے ہندوستان میں ہیں۔ جب کبھی کوئی بیرونی شخص کہیں ملازم رکھا جاتا ہے تو اس کو پہلے عرصہ تک اپنے صرفہ سے اس ملک کے حالات کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے جب وہ وہاں کے حالات وہاں کی ضروریات اور وہاں کی زبان سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے تو پھر اسے کوئی ملازمت دیجاتی ہے۔ مگر اس کے برعکس ہندوستان ہی ایک ایسا بدقسمت ملک ہے جہاں ایک نووارد کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ فوراً سپرد کر دیا جاتا ہے اور اس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا کہ آیا اس شخص کو مقامی حالات سے بھی کوئی واقفیت ہے یا نہیں۔ شاید ایک یورپین افسر بھی ایسا نہ ملے جو کسانوں سے ان کی زبان میں اچھی طرح گفتگو کر سکتا ہو۔ یا ان کی ضروریات کو سمجھتا ہو اور انہیں پورا کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ غیر ملکی حضرات مقامی حالات کی پوری واقفیت حاصل کئے بغیر اپنے نظریوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کسان کی ضرورتیں کیا ہیں۔ اور وہ کن حالات میں کام کر رہا ہے۔ زراعتی تحقیقات میں کوئی ترقی نہ ہونے کا یہ ایک خاص سبب ہے۔

کسان کی قدامت پرستی

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی کسان بڑا قدامت پرست ہے۔ لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں انھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ کسان تو ہر جگہ کا قدامت

پرست ہے۔ کیونکہ ایک غریب آدمی کو جب تک پورا اطمینان نہ ہو جائے وہ اندھا دھند تجربے کرکے اپنے آپ کو تباہ کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوسکتا۔ شاہی زراعتی کمیشن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہندوستانی کسان کو کچھ زیادہ سکھانے اور بتانے کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1] "ہمیں یہ دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے کہ کھاد اور اوزاروں کے سلسلہ میں محکمۂ زراعت نے کتنا کم کام کیا ہے۔ زراعتی تحقیقات کی ابھی یہاں بالکل ابتدا ہے" پوسہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "ہم اسے زراعتی تحقیقات کی دنیا میں وہ درجہ دینا چاہتے ہیں جو اسے کبھی حاصل تھا۔ لیکن جیسا شہادت سے ثابت ہوتا ہے بدقسمتی سے اب وہ صورت نہیں رہی ہے" اس کے خاص اسباب اس تحریری شہادت سے معلوم ہوتے ہیں، جو زراعتی ڈیپارٹمنٹ ایسوسی ایشن پونہ جس کے بیشتر ممبراں ہندوستانی تھے کمیشن مذکور کے سامنے پیش کی تھی اور جو کمیشن کی رپورٹ کی شہادت کے حصہ اول اور دوم میں موجود ہے۔ ایسوسی ایشن مذکور نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "زراعت کے مقامی نظریوں، قدیم روایتی طریقوں اور موجودہ حالات و مشکلات سے مبصرین زراعت کی لاعلمی سدراہ ہے۔ کسان عموماً بے پڑھے ہیں۔ اس لئے ان پیچیدہ مسائل کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ جنپر درحقیقت ترقی کا دارومدار ہے۔ تاوقتیکہ ان کے لئے ان تمام

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۳۸

مسائل کی باقاعدہ چھان بین نہ کیجائے۔ اس بے قاعدہ تحقیق پر جو محنت اور روپیہ صرف کیا جائے وہ گویا ضائع ہوتا ہے۔ اور اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ محکمہ زراعت میں موزوں آدمی بھی موجود نہیں ہیں۔ اگر محکمہ مذکور کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ تحقیقات کا کام بہت غلط طریقہ پر کیا گیا ہے" کسان کی مشکلات سے لاعلمی کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ کسان کو کھیت میں کام کرتے ہوئے جن مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ محکمہ کو ان کا علم نہیں ہے اور سائنٹیفک اصولوں پر باقاعدہ تحقیقات کرنے میں یہ چیز حائل ہے باہر سے جو ماہرین زراعت بلائے جاتے ہیں وہ اپنے ملک کے طریقوں کو یہاں بھی رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور مقامی حالات کے مطابق ان میں کوئی ترمیم نہیں کرتے یورپین ماہرین کے معاملہ میں زبان کی دقت اور ان کا افسرانہ رعب بھی زبردست رکاوٹ ہے وہ زراعت کی عملی صورت کا مطالعہ کرنے کے لیے کسانوں سے آزادی سے مل جل نہیں سکتے۔ اس لیے اکثر یہ کام اپنے ماتحتوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ان کا فرض ہے اور وہ اسی خدمت کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں" تحقیقات کے سلسلہ میں عدم مساوات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ امپیریل پراونشل اور ماتحت ملازمتوں کے امتیاز سے بھی محکمہ کی کارگذاری پر بڑا خراب اثر پڑتا ہے۔ مختلف افسروں کی تنخواہ۔ ترقی اور درجہ کے فرق کو فوراً دور کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے اونچے درجہ کے افسروں میں فوقیت کا ایک مصنوعی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اور باہمی رواداری باقی نہیں رہتی ۔ یہ چیز علمی کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن مذکورہ بالا حالات میں کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتی ۔" ۷

جو لوگ پوسہ گئے ہیں انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہوگی کہ یہ کوئی ایسا دو یا مندر نہیں ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص شریک ہو سکے بے اعتمادی عام طور پر حادی ہے اور تحقیقاتی کام میں ترتیب اور تسلسل کا نام بھی نہیں ہے ۔ البتہ کسان پر اس کا صرف ایک احسان ضرور ہے کہ وہاں گنے کی بہتر قسمیں دریافت کی گئی ہیں ۔ مگر خوش قسمتی سے اس کامیابی کا سہرا شعبہ ہذا کے ہندوستانی افسر کے سر ہے ۔ ان میں اپنے کام سے وہ انتہائی شغف اور جوش عمل موجود ہے جو ایک تحقیقات کرنے والے میں اپنی تحقیقات کو کامیاب بنانے کے لئے ہونا چاہیئے ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اسی طرح دوسرے قابل ہندوستانیوں کو بھی موقع دیا جاتا تو زراعت کے بہت سے پیچیدہ مسائل کبھی کے حل ہو گئے ہوتے ۔

جب ماہرین زراعت کے پاس کوئی نئی چیز سکھانے ہی کو نہ ہو تو ان کالجوں اور سکولوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے جہاں ملک کے نوجوانوں کو زراعت کی تعلیم دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ۔ علم کی اشاعت خود علم سے پہلے کبھی نہیں ہوتی ۔

دیسی زبانوں میں کتابوں کی ضرورت

ہماری زراعتی درسگاہوں میں زراعت کے سائنٹفک اصولوں کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی ہے ۔ اور اس امر کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ مختلف صوبوں کی مقامی زبانوں میں کتابیں تیار کی جائیں ۔ حالانکہ چالیس سال قبل ہی ڈاکٹر والکر نے ان کی ضرورت پر زور

دیا تھا۔ دیسی زبانوں میں طلبار کے لئے جو نصاب مقرر کیا گیا ہے وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے قطعی ناکافی ہے عام طور پر ان نام نہاد ماہرین کا خیال ہے کہ سائنٹفک تعلیم دیسی زبانوں میں نہیں دیجا سکتی۔ لیکن یہ خیال محض بے بنیاد ہے۔ زبان انسانی تخیل کا ایک ذریعہ ہے اس لئے وہی زبان بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے جس میں وہ سوچتا ہو۔

زراعت پر خرچ

مسٹر ڈارلنگ نے اپنی مشہور کتاب موسومہ "پنجابی کسان۔ خوشحال اور مقروض" میں لکھا[۵] ہے "ہندوستان میں مغربی ممالک کے مقابلہ میں زراعت پر بہت کم خرچ ہوتا ہے۔ جیسا حسب ذیل نقشے سے اچھی طرح ثابت ہوتی ہے۔

سنہ	ملک	اخراجات فی ایک ہزار آبادی	اخراجات فی ایک ہزار ایکڑ
۱۹۱۰	جرمنی	۹۴۵	۷۰۵
۱۹۱۹-۲۰	امریکہ	۱۰۲۰	۲۱۰
۱۹۲۱	برطانیہ	۹۶۰	۱۳۸۰
۱۹۲۵-۲۶	اٹلی	۲۵۵	۱۸۴۰
۱۹۲۶-۲۷	پنجاب	۱۳۹	۹۵
۱۹۲۴-۲۵	برطانوی ہند	۳۴	۳۰

گویا مذکورہ بالا سطور میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اول تو ہندوستان میں ایسے مواقع بہم نہیں پہنچائے جاتے جن پر زراعتی تعلیم کی بنیاد قایم ہے اور جو علمی حیثیت سے زراعت کی تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسان کی حقیقی مشکلات معلوم کر کے ان کے حل کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔

---

[۵] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۵

باب چہارم

زراعت کی اقتصادی تنظیم۔ خصوصاً کوآپریٹو سوسائیٹی کا رواج

ہندوستان میں کوآپریٹو سوسائیٹی کے حالات

غریبوں کے لئے کوآپریٹو سوسائیٹی ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس میں وہ متحد ہو کر اپنے وسائل مجتمع کر کے اپنی اصلاح و ترقی کے کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے، اور جہاں کچھ ہوا بھی ہے وہ عموماً قرض دینے کے کام تک محدود ہے بعض صوبوں میں یہ انجمن ۱۵ فیصدی سے ۱۸ فیصدی تک سود لیتی ہیں۔ ان جماعتوں کو سرکاری تائید بھی حاصل ہے۔ اور اسٹامپ۔ کورٹ فیس وغیرہ کے سلسلہ میں قانونی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ لیکن پھر بھی انکی شرح سود بہت زیادہ ہے، اس تحریک کی ترقی میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ملک کے بہی خواہ اور تعلیم یافتہ ہندوستانی اسمیں شریک نہیں ہوتے۔ کیونکہ سرکاری عنصر ان جماعتوں میں حاوی ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ ان افسروں سے اکثر معاملات میں اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی نے یہ تجویز کیا ہے کہ سرکاری اثر رفتہ رفتہ کم کر دیا جائے لوگ اکثر یہ بھی شبہ کرتے ہیں کہ یہ انجمنیں دراصل مہاجن کو نقصان پہنچانے کے لئے قایم کی گئی ہیں۔ ہمارا ابتدا ہی سے یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں قرض دینے والی کوآپریٹو سوسائٹی کامیاب نہیں ہو سکتی یہاں کسان زمین کا مالک نہیں ہے۔ اکثر

بیل بھی اس کے پاس ذاتی نہیں ہوتے، اسلئے وہ کوئی معقول ضمانت نہیں دے سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انجمنوں کے رکن کچھ عرصہ بعد پھر مہاجن کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ درحقیقت کوآپریٹو سوسائیٹیوں سے قرضداری میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے بلکہ اور اضافہ ہوگیا ہے۔ ہندوستان بھر میں شاید ایک مثال بھی ایسی نہ ملے کہ کوآپریٹو سوسائیٹیوں سے کسی رکن کو اپنی رکنیت کے دوران میں قرضہ سے بالکل چھٹکارا مل گیا ہو۔ اس کا سبب بہت صاف ہے، شاہی زراعتی کمیشن نے بہت صحیح لکھا ہے کہ کسان کو روپیہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بلکہ مشکل یہ ہے کہ قرضہ ادا کرنیکی کوئی صورت اس کے پاس نہیں ہے۔ کسان کو قرضہ سے اسوقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک اس کی ادا کرنے کی اہلیت میں اضافہ نہ کیا جائے۔

دوسرے ملکوں میں جہاں کوآپریٹو سوسائٹیاں قرض دینے والی جماعتوں کی حیثیت سے کامیاب ہوئی ہیں وہاں کسان اپنی زمین کا خود مالک ہے اس لئے وہ قرض کی ادائی کے لئے اپنی زمین کی کفالت پر روپیہ حاصل کرسکتا ہے، اسکے علاوہ ان انجمنوں کے کارکنوں کی سرگرمیاں یہیں پر ختم نہیں ہوجاتیں کہ وہ صرف قرض دینے والی جماعتیں قائم کردیں بلکہ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسیطرح کسان کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوجائے، آمدنی میں اضافہ کرنیکی تدبیریں کرنے والی جماعت میں بیش بینی، ہوشیاری اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن سرکاری جماعتیں عموماً ان خوبیوں سے محروم ہوتی ہیں۔ اس قسم کا کام تو صرف قومی خدمت کرنے والے ہی کرسکتے ہیں، بدقسمتی سے ہندوستان میں قومی خدمت کرنیوالوں کو سرکاری افسر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سیاسی اختلاف رائے کی وجہ سے انہیں موقع نہیں

دیتے کہ وہ ان جماعتوں میں شریک ہو کر عملی کام کر سکیں۔ چونکہ غیر سرکاری تائید حاصل نہیں ہے اس لئے یہ جماعتیں عام طور پر مقبول نہیں ہوتیں اور جب تک موجودہ صورت قایم رہے گی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ایسے پر جوش قومی کام کرنے والے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیں جنہیں افسروں کی خوشنودی یا ناراضگی کا کوئی خیال نہو۔ اور افسروں کا صرف اتنا دخل ہو کہ وہ ان انجمنوں کی رجسٹری کر لیا کریں اور ان کا حساب جانچ لیا کریں تاکہ کوئی بد عنوانی نہونے پائے۔

موجودہ انجمنوں کے نقائص

کوآپریٹو سوسائٹی میں عموماً اچھے کاشتکار شریک نہیں ہوتے ہیں کیونکہ اس قسم کی مشترک اور محدود ذمہ داریوں میں طرح طرح کے خطرات لاحق ہوتے ہیں اسکے علاوہ انجمن کے مقابلہ میں دوسری جگہ سے انہیں کم شرح سود پر روپیہ مل سکتا ہے اور لین دین ظاہر بھی نہیں ہونے پاتا۔ انجمن کے ساتھ معاملہ کرنے سے ہر چیز تشت از بام ہو جاتی ہے۔ اس سے کسان سخت گھبراتا ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے، کہ اس کا تمام لین دین پوشیدہ رہے۔ انجمن کے معمولی ممبروں میں صحیح معنوں میں امداد باہمی کا تخیل نہیں ہوتا۔ انہوں نے اسکی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے اور نہ اس اصول کو جس پر یہ سارا نظام منحصر ہے۔ وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ قرض حاصل کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اس سے زیادہ انہیں اس ادارہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ممکن ہے بعض ممبر امداد باہمی کے اصولوں کو جانتے ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسکی حقیقت سے وہ بالکل

ناآشنا ہوتے ہیں۔ اگر اس کی اصلیت کو وہ سمجھ جائیں اور اس کے فائدے انہیں بتلائے جائیں تو یقین ہے کہ انکی اقتصادی اور ذہنی حالت بہتر ہو جائے گی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے سارے ہندوستان میں ایک گاؤں بھی ایسا نہ ملے گا جہاں امداد باہمی کا صحیح مفہوم لوگوں کے ذہن نشین ہو گیا ہو اور اس کی ترقی کے لئے مناسب فضا پیدا ہو گئی ہو۔ ہم یہ پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہندوستانی کسان زراعت سے دولت کمانے اور اس کے سلسلہ میں نفع نقصان کا حساب لگانے کا عادی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ زیادہ شرح سود کا بار بھی محسوس نہیں کرتا۔ نہ یہ سمجھتا ہے کہ کم شرح سود اس کے لئے بہت مفید ہو گی۔ جب تک اسے نفع اور نقصان کا توازن کرنا نہ سکھایا جائے گا وہ ان اداروں میں شریک ہونے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہو گا۔ زراعتی کاموں میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہوتی، اگر ٹھیک وقت پر روپیہ نہ مل سکے تو کسان تباہ ہو جاتا ہے ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اگر اس کی ضرورت کے لائق وقت پر کافی روپیہ موجود ہو تو وہ ان انجمنوں سے قرض لینے پر مائل بھی ہو گا۔ لیکن سرکاری افسروں کے لیت و لعل کی وجہ سے روپیہ نہ تو کافی ملتا ہے اور نہ ٹھیک وقت پر ملتا ہے انہی وجوہ سے وہ ان انجمنوں سے علیحدہ رہتا ہے اسے خوفزدہ کرنے کے لئے ایک دوسری چیز بھی ہے، یعنی روپیہ وصول کرنے میں بہت سختی برتی جاتی ہے۔ اس سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ تحفظ کا لحاظ کئے بغیر بے تکلف روپیہ تقسیم کیا جائے۔ نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ درخواستوں کی اچھی طرح چھان بین بھی نہ کیجائے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب تک امداد باہمی کا مفہوم اور مقصد اچھی طرح کسان کی سمجھ میں نہ آجائے۔ ایسی کوئی بات نہ ہونی چاہیئے جس سے وہ خواہ مخواہ بھڑک جائے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ابتدا ہی غلط طریقہ پر

کی ہے۔ یعنی اسکی آمدنی بڑھانے اور اس کے پس انداز روپیہ کو کسی موزوں کام میں لگانے کی بجائے ہم نے قرض دینا شروع کیا ہے اور وہ بھی سرکاری اثر و اختیار کے ماتحت۔ اگر کسان کی موجودہ آمدنی میں آپ تھوڑا سا بھی اضافہ کر سکیں تو وہ تحریک امداد باہمی کی قدر و قیمت زیادہ اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ اگر ہم ایسی انجمنیں قایم کریں۔ جو زراعت کے زیادہ ترقی یافتہ طریقے رایج کریں، ان کے مال کو اونچی قیمت پر فروخت کرائیں اور انکی ضروریات کی چیزیں سستے داموں مہیا کرنیکا انتظام کریں تو یقیناً ان کے دلوں میں ہماری طرف سے اعتماد پیدا ہو جائیگا۔ اور ہم امداد باہمی کا اصلی مقصد ان کے ذہن نشین کرا سکیں گے یہ چیزیں اسوقت تک ممکن نہیں ہیں جب تک کارکنوں کو خود دیہی اقتصادیات کا کافی علم نہو اور زراعت اور اس کے متعلقہ کاموں سے اچھی طرح واقفیت نہ رکھتے ہوں۔ ان اصولوں کے ماتحت اگر انجمنیں قایم کی جائیں تو کسان کی آمدنی میں ضرور اضافہ ہوگا۔ پھر اسے یہ بھی اطمینان ہو جائے گا کہ کوآپریٹو سوسائٹی سے کچھ روپیہ بھی ملتا ہے اس لئے یہ نفع بخش تحریک ہے۔ دراصل امداد باہمی کا وہ تخیل ہمارے پیش نظر ہے کہ یہ انجمنیں تمام زراعتی کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اور اپنے ممبروں کی پیداوار کو خود اپنی نگرانی میں بازار میں فروخت کریں ہم یہ چاہتے ہیں کہ سارا گاؤں ایک خاندان کیطرح ہو جسمیں ہر شخص اپنا فرض منصبی ادا کرے اور اس کی محنت کے مطابق اسکو معاوضہ ملجائے۔ ڈنمارک میں کوآپریٹو سوسائٹی اپنے ممبروں کو یہاں تک مشورہ دیتی ہے کہ اس کے لئے کونسی گائے خریدنا بہتر ہوگا اور وہ کہاں سے مل سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسکی جانب سے معاملہ بھی کرتی ہے۔ اور یہ بھی بتلاتی ہے، کہ سب سے اچھا سستا چارہ کون سا ہوگا۔ انجمن اس کا دودھ اچھے

سے اچھے داموں بیچنے کی کوشش کرتی ہے اور انکی تمام ضروریات مہیا کرنیکا انتظام کرتی ہے۔ ہندوستان میں بھی اسی قسم کی انجمنیں کامیاب ہوسکتی ہیں، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شخص اس قسم کی انجمن بنائے وہ اپنے کام میں ہوشیار اور اس کا پوری طرح اہل ہو۔ ساتھ ہی اسمیں اتنا جوش بھی موجود ہو۔ کہ مخالف حالات کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کرسکے اسوقت ہمیں خرید و فروخت کی انجمنوں۔ زراعتی ترقی کی انجمنوں اور بہتر کاشت کی انجمنوں کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن یہ سب غیر معمولی فراست اور انتہائی محنت پر منحصر ہے۔ اگر قوت عمل کو بہت بڑے رقبہ پر ضایع کرنے کی بجائے ابتدا میں انجمنوں کا دائرہ محدود کردیا جائے، اور ایک یا دو ضلعوں کے ایک چھوٹے سے رقبہ پر تمام کوششیں مرکوز کردیجائیں تو یہ جماعتیں ضرور کامیاب ہونگی اور کسانوں میں انہیں مقبول بنانے کا بہترین پروپگنڈا بھی ہوگا۔

قوم کا پس انداز سرمایہ

لین دین کا کام کرنے والے ہر ادارہ کی کامیابی (خواہ وہ کوئی تجارتی بنک ہو یا کوآپریٹیو بنک ہو) قوم کی پس انداز رقم پر منحصر ہے۔ اس کے بغیر کوئی ملک اقتصادی ترقی نہیں کرسکتا ہے۔ یہ تو بہرحال تسلیم ہوگا کہ بہت کم کسانوں کے پاس وقت بے وقت کے لئے کچھ روپیہ بچتا ہے، لیکن فصل کے موقع پر ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ زائد روپیہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر اس موقع پر کسی معتبر بنک میں یہ روپیہ لگانیکا انتظام کیا جائے تو بنک کا اچھا خاصا نظام بن سکتا ہے۔ اس سے کسان کو روپیہ بچانے کے فائدے بھی معلوم ہوں گے اور احتیاط سے خرچ کرنے کا موقع بھی ملیگا۔ یعنی وہ مضر اور غیر محتاط

لین دین یا خرید و فروخت سے بچ سکے گا۔ جب بنک میں اس کے پاس روپیہ ہوگا۔ تو اسمیں خود اعتمادی اور مستقبل کے متعلق امید کا ایک جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ مذہبی اور سماجی تقریبوں کے لئے روپیہ بچانا بھی سیکھے گا۔ اور قرض سے بھی بچ جائیگا اگر ان اصولوں پر کام کیا جائے تو کم شرح سود پر کسان کی ضروریات کے لئے کافی روپیہ بھی مہیا ہو جائے گا۔ چونکہ کسان کا روپیہ خود اسی کے کام آئیگا۔ اس لئے زیادہ شرح سود کا مسئلہ بھی ایک حد تک حل ہو جائیگا۔ اگر اس قسم کے بنک قایم ہو جائیں تو کساد بازاری کے زمانہ میں تجارتی بنکوں کے پاس جو زائد روپیہ ہوگا۔ وہ کسانوں کے بنک میں منتقل ہو سکتا ہے اور کسانوں کے کام آسکتا ہے۔ اگر تجارتی بنکوں اور کسانوں کے بنکوں میں آپس میں اس قسم کا سمجھوتہ ہو جائے تو ملک کی اقتصادی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔ اس لئے سب سے پہلے اسوقت کسانوں کے سیونگ بنک قایم کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکخانہ کے سیونگ بنک سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ان دونوں میں ایک تجارتی تعلق قایم کر دیا جائے۔ لیکن کسانوں کے بنک کو بہر حال ایک آزاد ادارہ ہونا چاہیئے۔

کوآپریٹو بیمہ

زراعت جیسے نازک اور پرخطر فن کیلئے کوآپریٹو بیمہ بڑی ضروری چیز ہے اس لئے کوآپریٹو بیمہ کمپنیاں قایم کرنا چاہیئے۔ تاکہ اگر کسان پر کوئی مصیبت آئے مثلاً اس کا بیل مرجائے یا خشک سالی۔ طوفان اور ٹڈی سے فصل تباہ ہو جائے تو اسکے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ بدقسمتی سے اس سلسلہ میں کوئی اعداد و شمار موجود نہیں

ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور اسے شروع کرنے سے پہلے کافی خرچ کر کے بہت کچھ ابتدائی کام کرنا ہوگا۔ حکومت کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرائی گئی۔ لیکن اس نے ذرا بھی پروانہ کی۔ زندگی کا بیمہ۔ شادی کا بیمہ وغیرہ بھی انہی اصولوں پر جاری کرنا چاہیئے بشرطیکہ اخراجات بہت زیادہ نہوں جیسے ہر سرکاری کام میں ہوتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی بیمہ کمپنیوں نے کسانوں کی بہت خدمت کی ہے۔ اب وقت ہے کہ ہمارے یہاں بھی یہ کمپنیاں جاری کیجائیں۔

دوسرے ملکوں میں حکومت مختلف طریقوں سے ان انجمنوں کی مدد کرتی ہے اور معقول مالی امداد دیتی ہے۔ فرانس نے جسطرح اپنے امداد باہمی نظام کو ترقی دی اس کا تذکرہ کرنا یہاں بے موقع نہوگا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت نے قرض دینے والی انجمنیں قایم کرنے کا قانون نافذ کیا تاکہ زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوسکے ۱۸۹۵ء میں ایک قانون کی رو سے سیونگ بنک کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے سرمایہ کا پانچواں حصہ اور اپنی ساری آمدنی کوآپریٹو بنک پر خرچ کرے ۱۸۹۷ء میں بنک آف فرانس کا چارٹر تبدیل کیا گیا۔ اور یہ قرار پایا کہ وہ زراعتی قرضہ کے سلسلہ میں ۴ کروڑ فرانک ادا کرے۔ اس کے علاوہ بنک کے نفع میں سے کچھ سالانہ حصہ بھی مقرر کر دیا گیا ۱۸۹۹ء میں کوآپریٹو بنک قایم کئے گئے ۱۹۱۰ء میں قانون میں ترمیم کر کے زرعی قرضہ میں اور توسیع کی گئی۔ تاکہ کسانوں کو زمین خریدنے اور اسکی اصلاح کرنے کے لئے طویل مدت کا قرضہ مل سکے۔ اس طرح فرانس میں زرعی قرضہ کا مکمل انتظام ہے اور اس میں بیشتر سرکاری سرمایہ لگتا ہے یہ گویا کسانوں کی امداد کا ایک بالواسطہ طریقہ ہے کیونکہ ان بنکوں کو ۲ فیصدی سالانہ پر حکومت ہی روپیہ دیتی ہے اور

ممبروں کو ۴ فیصدی سالانہ پر قرض ملتا ہے ذرا صوبہ ممالک متحدہ کے سود کا اس سے مقابلہ کیجئے جہاں وہ کاشتکار خوش قسمت ہیں جنکی درخواست پندرہ فیصدی قرضہ پر منظور ہو جاوے۔

عام کساد بازاری اور خسارہ کے بجٹ کے موجودہ دور میں یہ امید کرنا عبث ہے کہ ہندوستانی حکومت زرعی قرضہ کی ایسی انجمنیں قایم کرنے کے لئے روپیہ دیگی جو کم شرح سود پر قرض دے سکیں۔ لیکن فرانس کے نقش قدم پر تو بہرحال چل سکتی ہے یعنی بنکوں کے لئے لازم کر سکتی ہے کہ وہ اپنے منافع کا کچھ نہ کچھ حصہ ۲ فیصدی سالانہ پر قرضہ دینے والی انجمنوں کو ضرور دیا کریں۔ پھر یہ انجمنیں ۴ فیصدی پر کسانوں کو قرض دیں۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت خاص اس غرض کے لئے روپیہ قرض لیکر اسی شرح سود پر قرضہ دینے والی انجمنوں کو دیدیا کرے اور یہ انجمنیں سود میں تھوڑا سا اضافہ کر کے کسانوں کو قرض دیا کریں۔ سود میں صرف اتنا ہی اضافہ ہونا چاہیئے جس کے نفع سے معمولی اخراجات پورے ہو جائیں اور بس۔ یعنی اس سلسلہ میں کوئی نفع کمانا مقصود نہ ہونا چاہیئے۔



باب پنجم

ایسے اداروں کا قیام جو مویشیوں اور فصلوں کی اصلاح کرنے۔ پیداوار کا معیار قائم کرنے اور گھاس اور کیڑوں کا انسداد کرنے کی اسکیم تیار کریں

مویشیوں کی اصلاح

ہندوستان میں مویشیوں کی اصلاح کا افسانہ بھی عجیب ہے۔ سب سے پہلے یہ صورت کی گئی کہ ہندوستان کی بہترین گائیں منتخب کر کے بیرونی سانڈوں سے مخلوط نسل پیدا کی گئی۔ بہت عرصہ ہوا جب یہ تجربہ شروع کیا گیا تھا۔ اور اب بھی فوجی محکموں میں جاری ہے۔ ابتدا ہی سے نتائج کچھ اچھے حاصل نہ ہوئے یعنی پہلی نسل تو تندرست ہوئی اور دودھ میں بھی اضافہ ہوا لیکن بعد کی نسلیں اتنی کمزور ہو گئیں کہ مقامی وباؤں سے محفوظ نہ رہ سکیں اور اس طرح ان کی آئندہ نسل تباہ ہو گئی۔ یہ چیز مویشیوں کی نسل کے لحاظ سے بھی اور قومی صنعت کے نقطۂ نظر سے بھی سخت نقصان دہ ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض اسلئے جاری ہے کہ اس کے غلط ثابت ہونے کے باوجود بڑی تنخواہ پانے والے ماہرین کو اس خیال سے ہٹایا نہیں جا سکتا ہے۔ اس طرح بہترین گایوں کی نسل تباہ ہو جاتی ہے۔ اور ملک کا بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اگر حکومت کو ملک کے مفاد کا ذرا بھی خیال ہے تو اسے فوراً اس حرکت کو قطعی بند کر دینا چاہئے

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ہمارے یہاں اصلاح کا ہر کام بڑی بڑی تنخواہ والے بیرونی ماہرین کے سپرد کیا جاتا ہے۔ وہ ملک کی آب و ہوا اور دوسری خصوصیات کا علم حاصل کئے بغیر اپنے ملک کے طریقے یہاں بھی رائج کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور چاہے کوئی مفید

نتیجہ نکلے یا نہ نکلے برابر تجربے کرتے رہتے ہیں۔ تحقیقات کے سلسلہ میں یہاں کے لوگ جو امداد دے سکتے ہیں وہ بھی حاصل نہیں کی جاتی کیونکہ اول تو حاکمانہ وقار اور نسلی غرور کا جذبہ اسکی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے ان کا طرز زندگی بالکل مختلف ہے۔ تیسرے وہ عوام کی زبان نہیں سمجھتے نہ وہ اس ملک کی زبان سیکھنے کوشش کرتے ہیں جسکی خدمت کے لئے تنخواہ دیکر انہیں بلایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مویشی پالنے والوں کی تعریف میں شاہی زراعتی کمیشن نے لکھا ہے "اگر صوبہ متحدہ کی نیواز۔ پنجاب کی ہریانہ اور سہیوال۔ سندھ کی تھارپرکار اور سندھی (کراچی) متوسط ہند کی مالوی۔ گجرات کی کانکریج۔ کاٹھیاواڑ کی گیر۔ صوبہ جات متوسط کی گاؤ لاؤ۔ اور مدراس کی اونگول نسلوں کی تحقیق کی جائے تو یہ پتہ چلیگا کہ ان کی خوبی کا اصل سبب پیشہ ور چرواہوں کی غیر معمولی احتیاط ہے۔ یہ لوگ عموماً خانہ بدوش ہوتے تھے اور پہلے ہندوستان میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ لیکن اب زراعت کے پھیلنے کی وجہ سے انہوں نے مویشی چرانے کا پیشہ چھوڑ دیا ہے۔ گزیٹروں میں جہاں ہندوستان کے قدیم حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان چرواہوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسانوں کو مویشی بہم پہنچانے میں ان کا کتنا ہاتھ تھا۔ بعض مقامات پر وہ مویشی پالنے کے علاوہ کسانوں کی فصلیں بھی لوٹنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ لیکن جہاں وہ صرف اپنے جائز پیشے پر قناعت کرتے تھے ان کی عدم موجودگی کو بہت زیادہ محسوس کیا جاتا ہے۔ دیہاتی آبادی میں صرف یہی لوگ مویشی پالنے پر خاص توجہ کرتے تھے اور اس فن سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کو عموماً ناموافق حالات میں کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن مویشیوں کے انتخاب اور ان کی نگہداشت میں وہ اتنے ہوشیار تھے کہ اچھے سے اچھے گلّے تیار کر لیتے تھے۔"

ان لوگوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے تھا لیکن محکمہ زراعت کے قیام کے

۶۰ سال بعد اسوقت یہ چیز معلوم ہوئی جب بدقسمتی سے یہ تجربہ کارفرقہ فنا ہو چکا ہے۔ مویشیوں کی حالت میں اصلاح کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ماہرین کے ذہن میں کوئی خاص مقصد بھی ہو۔ حکومت یا رعایا کو جو انہیں ملازم رکھتی ہے اپنا مقصد اچھی طرح بتلا دینا چاہئے۔ بدقسمتی سے رعایا بے پڑھی ہے اور وہ اپنا مقصد خود نہیں جانتی۔ اور حکومت جدید نظریوں سے مرعوب ہے۔ اور ان غیر ملکی ماہرین پر بہت زیادہ اعتماد کرتی ہے۔ یہ لوگ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ قدیم ہندوستانی طریقوں میں بھی کوئی خوبی ہے۔ حکومت یہ بھی نہیں دیکھتی کہ ایک ماہر نے جو مقصد پیش نظر رکھا تھا اور جو طریقہ کار اختیار کیا تھا آیا اس کے قایم مقام نے اسے جاری بھی رکھا یا نہیں اور تحقیقات کا تسلسل قائم بھی رہا یا نہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں ایک افسر علیحدہ ہوا اور اس کی جگہ دوسرا آیا۔ فوراً وہ طریقہ کار تبدیل ہو گیا۔ اور بالکل نئے اصولوں پر پھر نئے سرے سے کام شروع کیا گیا اسی وجہ سے شاہی زراعتی کمیشن نے لکھا ہے کہ "ایک حد تک ناکامی کی وجہ تنظیم اور تسلسل کی کمی ہے"۔ اس صورت میں ایک اور نقصان بھی ہوتا ہے۔ یعنی کام کی اچھائی یا برائی کا کوئی ذمہ دار نہیں رہتا۔ عموماً ہر ماہر اپنے پیشرو کے طریقہ کار کی مذمت کرتا ہے۔ جسکا خمیازہ ملک کو اٹھانا پڑتا ہے۔ یعنی خواہ مخواہ کثیر نقصان ہوتا ہے۔

یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں جہاں ابھی کچھ عرصہ قبل دودھ گھی کی افراط تھی۔ مویشیوں کی نسل کیوں اتنی خراب ہوتی جا رہی ہے؟ کوئی گوشت نہ کھانے والا جسکی غذا بیشتر دودھ پر منحصر ہو اپنی زندگی کی اس ضروری چیز سے بے پروائی نہیں برت سکتا ہے۔ ہمارے یہاں اب دودھ کا خرچ دنیا میں سب سے کم ہے۔ اس لئے بچوں کی اموات سب سے زیادہ ہوتی ہیں شاہی زراعتی کمیشن نے اسے تسلیم کیا ہے کہ "تمام شہادتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ ڈنمارک۔ سویڈن اور سوئزرلینڈ وغیرہ کے مقابلہ میں یہاں تازہ دودھ کا استعمال بہت کم ہے"۔

اسکے یہ معنی ہیں کہ معقول غذا نہ ہونے کیوجہ سے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ موقع بہ موقع ہندوستانیوں کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی گایوں کو اچھی خوراک نہیں دیتے ۔ اور ان کی نسل کو خراب کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو سمجھنا چاہئے ۔ کہ ایک بھوکے مرنے والے شخص کی گائے بھی دبلی ہی رہیگی۔ ان غریبوں کا معیار زندگی ذرا بلند ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ ان کے مویشی بھی زیادہ اچھے اور تندرست ہوتے ہیں یا نہیں۔ ایسی سہولتیں پیدا کیجئے کہ دودھ سے آمدنی ہونے لگے۔ نسل خود بخود بہتر ہو جائے گی۔ اگر حکومت ایسی صورتیں اختیار کرے کہ کسان کے پاس کچھ روپیہ ہو جائے اور ایسی سہولتیں پیدا کرے کہ یہ کام کچھ نفع بخش ثابت ہو تو ہر چیز درست ہو جائے گی۔ ہم ابھی یہ بتلائیں گے کہ ملک کی موجودہ زبوں حالی کا غریب کسان ذمہ دار نہیں ہے۔ لیکن اس سے پیشتر ہم حکومت اور اسکے ماہرین سے جو مویشیوں کی اصلاح و ترقی کے ذمہ دار ہیں ایک برمحل سوال کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں محکمہ زراعت ۱۸۷۱ء میں قائم ہوا تھا کیا آج ۶۵۰ سال کے بعد بھی وہ یہ طے کر سکے ہیں۔ کہ ان کا آئندہ مسلک اور طریقہ کار کیا ہوگا؟ کیا ان کا مقصد یہ ہے کہ بہت زیادہ دودھ دینے والے مویشی پیدا کئے جائیں یا بہترین بارکش یا ان دونوں کا مجموعہ؟ اب تک انہوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اس سے کچھ صاف پتہ نہیں چلتا کبھی وہ ایک اصول اختیار کرتے ہیں اور کبھی دوسرا۔ کام کا یہ مذبذب طریقہ اور ٹیکس دہندے کے روپیہ کا یہ کھیل سخت افسوس ناک ہے۔ دراصل حکومت کا یہ فرض ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک مطمح نظر طے کرلے اور جبتک وہ حاصل نہ ہو جائے اسی کے لئے کوشش کئے جائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو اس کام سے ہاتھ اٹھالے۔ اور اس معاملہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے وقت خود بخود اصلاح کرلے گا

مذہبی جذبات

گائے کو مارنے کے متعلق ہندوؤں کے مذہبی جذبات پر بہت کچھ اعتراض کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ خرابیوں کا یہی سبب ہے کہ ناقص اور بیکار جانوروں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا اس لئے انکی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ الزام صحیح نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو جذبات سے خالی ہو۔ ہر قوم۔ ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے اپنے اپنے جذبات ہوتے ہیں اور ان جذبات کو بالکل مٹا دینا آسان کام نہیں ہے۔ اسلئے ماہرین کو موجودہ صورت حالات ہی میں کام کرنا چاہئے۔ انہیں اس سے مطلب نہیں کہ کسی قوم کے جذبات معقول ہیں یا غیر معقول۔ اچھے ہیں یا بُرے۔ مفید ہیں یا مضر۔ ان کا یہ کام نہیں ہے کہ ان قصوں میں پڑیں اور خواہ مخواہ اعتراض کریں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جبتک یہ خیالات رفع نہ ہو جائیں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو بہترین صورت یہ ہوگی کہ وہ دستکش ہو جائیں اور ان غیر معقول جذبات کا رفع کرنا قوم کے لیڈروں پر چھوڑ دیں۔

بیشک ہندو مذہبی حیثیت سے گائے کے تقدس کے قائل ہیں صرف دودھ دینے والے اور بارکش مویشیوں کا زندہ رکھنا اور بیکار اور بوڑھے جانوروں کو ہلاک کرنا عبث ہوگا۔ گائے کے متعلق ان جذبات کو آپ تعصب یا توہم جو چاہیں کہہ لیں۔ لیکن آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ وہ تعصب یا توہم ہے۔ جسکے لئے بیشمار ہندو اپنی جانوں تک سے دریغ نہ کریں گے۔ اس لئے بوڑھے اور بیکار گائے بیلوں کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور غیر ملکی ماہرین کے دو لفظی حکم "مار ڈالو" سے حل نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے کہ اگر ہم یہ طے کریں کہ گایوں کی دو قسم کی نسلیں پیدا کیجائیں۔ ایک نسل ایسی ہو جس سے دودھ زیادہ سے زیادہ پیدا ہو اور دوسری نسل ایسی پیدا کی جائے۔ جسکے بیل نہایت مضبوط اور طاقت ور ہوں۔ خواہ گائیں کم دودھ دینے

والی ہوں تو اس قسم کے تجربات کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ پہلی صورت میں بچھڑے بیکار ہوں گے۔ اور زیادہ دودھ دینے والی گایوں کے بچھڑے عمدہ بیل نہ بن سکیں گے۔ دوسری صورت میں بچھیا بے کار ہوگی اور اس کا دودھ کم ہونیسے کوئی اسے پالنا پسند نہ کرے گا۔ گویا اس قسم کی دو نسلیں پیدا کرنے سے ایک حالت میں بیل اور دوسری حالت میں گائیں ماڑ دانے کے قابل ہونگی۔ اور کاشتکاران کو یہ سمجھانا ہوگا۔ کہ وہ ناکارہ بیل اور گایوں کو ذبح کرنے کے لئے فروخت کریں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو سارے ملک میں بلوے اور خونریزیاں شروع ہو جائیں گی۔ یہ نہایت اہم مسئلہ ہے اور سرسری طور پر حل نہیں ہو سکتا پچھلے زمانہ میں اسی سوال پر کتنے بلوے اور کتنی باقاعدہ لڑائیاں ہوئیں۔ آج بھی جبکہ مذہبی جذبات میں وہ شدت نہیں رہی ہے۔ اکثر جھگڑوں اور بلووں کا یہی سبب ہوتا ہے اسلئے بوڑھے اور بیکار مویشیوں کو ہلاک کرنیکا خیال ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر ان جانوروں کو زندہ رہنے دیا جائے تو خوراک کا سامان جو پہلے ہی کم ہے اور زیادہ کم پڑ جائے گا۔ لیکن موجودہ حالت میں چارہ کا ہی کیا ہے۔ ہندوؤں کی نظر میں ہر جان مقدس ہے۔ ہلاک نہ کرنا ہی ان کا مذہب ہے۔ جو گائے دودھ دینے کے قابل نہ رہے اسے کھلانے پلانے میں وہ عذر نہیں کرتے۔ بوڑھے۔ معذور اور بیمار جانوروں کے لیے مخیر لوگوں نے گئو شالائیں قائم کر دی ہیں۔ غرضکہ یہ مسئلہ اسطرح حل نہیں ہو سکتا جیسے یہ غیر ملکی ماہرین تجویز کرتے ہیں۔ اسکا حل صرف یہی ہے کہ زیادہ چراگاہوں کا انتظام کیا جائے اور زیادہ چارہ پیدا کیا جائے۔ اچھے دودھ دینے والی گائیں اور مضبوط طاقتور بیل ایک ہی نسل سے پیدا کرنے کا مسئلہ بیرونی ماہرین کے لیے بہت پریشان کن ہے دراصل یہ انہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ پچھلے زمانے میں اسکا کوئی ذکر بھی نہ تھا۔ اسوقت پیشہ ور

مویشی پالنے والے موجود تھے - وہ ان تمام کاموں میں حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب ہوتے تھے جنمیں موجودہ ماہرین بالکل ناکام ہیں - ہم اس سے قبل ان کا تذکرہ کر چکے ہیں - گویا علاج ظاہر ہے - یعنی ان بیرونی ماہرین کو سبکدوش کر دیا جائے - اور ان ہندوستانیوں کی معلومات سے فائدہ اٹھایا جائے - جنکو جانور پالنے اور ان کی نگہداشت کرنے کا پورا تجربہ ہو - اس معاملہ میں شاہی زراعتی کمیشن کی رائے سے ہماری رائے کا تصادم ہوگا - کیونکہ انہوں نے مویشیوں کے سرکاری فارموں کی تعریف کی ہے - ان کی رائے کی ہم عزت کرتے ہیں لیکن یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ کمیشن مذکور نے جو لکھا ہے - حالات اس سے بہت کچھ مختلف ہیں - اگر چند اچھے دودھ دینے والے مویشی تیار بھی کر دیئے گئے - تو اس سے تمام مشکلات کا حل تھوڑی ہو سکتا ہے کوئی شخص بھی جسکے پاس کافی روپیہ اور معمولی سی سمجھ بوجھ ہو یہی کارنامے" کر کے دکھا سکتا ہے - ایک مرتبہ یو پی لیجسلیٹو کونسل میں ڈائرکٹر زراعت نے ایک سوال کے جواب میں سرکاری ماہر کے اس طرز عمل کی حمایت کی تھی کہ وہ گایوں کا دودھ نہیں نکلواتے اور دودھ کی مقدار کا رجسٹر نہیں رکھتے - اگر ایسا ذمہ دار سرکاری افسر اپنے ماتحت کی ایسی لغو حرکت کی حمایت کر سکتا ہے - تو نتیجہ ظاہر ہے - حصار کے فارم میں یہ دیکھکر ہمیں حیرت ہوئی کہ وہاں نہ تو دودھ کا کوئی حساب رکھا جاتا تھا نہ مختلف نسل کے جانوروں کے خاندانی حالات آسانی سے معلوم ہو سکتے تھے اور نہ مقررہ خوراک دی جاتی تھی - محفوظ کیا ہوا چارہ دینے کا رواج نہ تھا حالانکہ کمیشن مذکور نے اسکی بہت زیادہ تعریف اور خاص سفارش کی ہے - اور پکا مکان بھی محفوظ چارہ رکھنے کے لئے بنا ہوا تھا - ایسی صورت میں ان محکموں کے ذریعہ کامیابی کا کیا امکان ہو سکتا ہے ؟ ہمیں اسپر اعتراض نہیں ہے کہ بہترین مویشی تیار کرنے میں ماہرین اتنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں - البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کا اصول اور طریقہ کار سائنٹفک مسلسل و باقاعدہ

ہونا چاہئے۔ ملک کے طول و عرض میں ایک سرکاری فارم بھی ایسا نہیں ہے۔ جہاں سے پالنے کے لئے مویشی خرید کئے جا سکیں۔ اور مویشیوں کی نسل قابل اعتبار ہو۔ اگر ۶۰ سال کی مسلسل کوشش کے باوجود سرکاری محکمے نمونہ کے طور پر ایک بہترین جانور بھی تیار نہ کر سکے۔ تو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی کامیابی ہو سکے گی۔ شاہی زراعتی کمیشن نے اگرچہ ان فارموں کے کاموں کی بے ترتیبی اور روپیہ کی بربادی کا افسوس کیا ہے۔ لیکن پھر بھی مستقبل کی بڑی خوشگوار تصویر کھینچی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی اس امید افزا تخیل کی ہم تائید نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم تو ماضی سے مستقبل کا اندازہ لگاتے ہیں۔

دودھ گھی میں ملاوٹ

مویشیوں کی نسل کے خراب ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ حکومت دودھ گھی وغیرہ میں ملاوٹ کو روکنے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ مغربی ملکوں کی ہر حکومت اس بات کی خاص احتیاط رکھتی ہے کہ دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزوں میں ملاوٹ نہ ہونے پائے۔ اس کے انسداد کیلئے قانون بناتی ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دیتی ہے لیکن ہندوستان میں یہ صورت نہیں ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے تسلیم کیا ہے[1] کہ دودھ میں عام طور پر پانی ملایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ شہروں میں بہت خراب دودھ ملتا ہے اور دودھ دینے والے جانوروں کے ساتھ بے پروائی بھی برتی جاتی ہے ہندوستان پر گریشم کا یہ مشہور مقولہ صادق آتا ہے۔ کہ کھوٹا روپیہ کھرے روپیہ کو بازار سے نکالدیتا ہے۔ لیکن یہاں اس کا تعلق روپیہ سے نہیں۔ بلکہ دودھ سے ہے۔ دودھ پر بھی یہ اصول روپیہ کی طرح صادق آتا ہے۔ پانی ملا ہوا دودھ خالص دودھ کو شہروں سے خارج کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خالص

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۲

دودھ یہاں برطانیہ کے بڑے بڑے شہروں سے بھی زیادہ مہنگا ملتا ہے۔ حتی کہ چھ آنے سیر میں بھی کمیاب ہے۔" ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے[1]۔ "اگر دودھ کی ملاوٹ کا پوری طرح انسداد کر دیا جائے۔ اور ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ شہروں میں دودھ مہیا کرنے کا کام ایماندار آدمی کرنے لگیں تو اچھی گایوں کی مانگ بھی بڑھ جائیگی۔ ان اعلیٰ نسل کے مویشیوں سے عمدہ قسم کا دودھ حاصل کرنے کے سلسلہ میں ماہرین کے لیے بہت کافی کام ہے۔"

یوں تو دودھ گھی وغیرہ میں ملاوٹ ہر ملک میں ہوتی ہے۔ لیکن حکومتیں اسکا انسداد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ اور نہایت سختی سے تدارک کرتی ہیں۔ ایک مصنف نے اٹلی کیمتعلق لکھا ہے کہ "اٹلی میں قدیم زمانہ سے دودھ میں ملاوٹ ہوتی آئی تھی لیکن مسولینی نے قانون کی رو سے پانی ملا ہوا دودھ بیچنا جرم قرار دیدیا۔ جرمانہ۔ قید۔ اور کچھ عرصہ کے لیے دوکان بند کر دینا اس کی سزا مقرر کی۔ اور دوبارہ اس جرم کے ارتکاب پر دوکان کا لائسنس ہمیشہ کے لیے ضبط کرنا تجویز کیا۔ اطالوی لوگ اپنے دل کی کرنے کے اتنے عادی تھے کہ انہوں نے ابتدا میں اس نئے قانون کی کوئی پروانہ کی۔ بلکہ اس کی خلاف ورزی میں اور زیادہ پانی ملانا شروع کر دیا۔ لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب اٹلی میں ایک ایسا حکمران موجود ہے۔ جو قانون اس لیے بناتا ہے کہ اسکی پابندی کی جائے۔ ہر شہر میں دودھ کی بیسیوں دوکانیں بند کر دی گئیں۔ اور ان کے مالکوں کو جیل خانے میں بھر دیا گیا تاکہ آئندہ اس قانون سے بچنے کے لیے نئی ترکیبیں سوچنے کا انہیں کافی موقع ملجائے[2]۔"

ڈنمارک میں بھی جو کارخانہ دودھ میں پانی ملا کر فروخت کرتا ہے۔ اسے سرکاری مارکہ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۰

[2] ملاحظہ ہو صفحہ ۵۹ اسٹیچوٹری کمیشن۔

استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اور مجرم کو سزا بھی دیجاتی ہے۔ اس قسم کے قانون برطانیہ میں بھی ہیں۔ شاہی زراعتی کمیشن نے اس مسئلہ کے متعلق کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔" اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ شہروں میں اچھا دودھ مہیا کرنے کے خیال سے (جو گوشت کھانے والوں کی صحت کے لئے نہایت ضروری خوراک ہے اور جس سے وہ روز افزوں مشکلات کی وجہ سے محروم ہوگئے ہیں) میونسپلٹیوں کو ایسی صورتیں اختیار کرنا چاہئے۔ کہ خالص دودھ بہ افراط اور ستا مل سکے۔ ہم یہ بھی سفارش کرتے ہیں کہ میونسپلٹیوں کو قانوناً یہ اختیار ہونا چاہئے۔ کہ وہ اپنے حدود کے باہر بھی گئوشالے بنا سکیں تاکہ کثیر مقدار میں دودھ حاصل کرنے کی اسکیم میں امداد ملے۔ اس کے علاوہ دودھ جمع کرنے۔ اور دودھ کو گرم کر کے تمام مضر جراثیم مارنے کی غرض سے وہ ایسے مقامات میں ڈپو کھول سکیں۔ جہاں کوآپریٹو سوسائٹی یا دوسرے دودھ بیچنے والے کافی مقدار میں نہیں دودھ مہیا کر سکیں۔"

دودھ کی طرح گھی کی ملاوٹ کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ اور اس سے گھی تیار کرنے والوں کے مفاد پر اثر پڑتا ہے۔ گھی نکالنے کا کام نہ صرف وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے بلکہ دودھ کے کارخانہ کی کامیابی میں بھی اس سے بہت بڑی امداد ملتی ہے۔ گھی کی ملاوٹ کے متعلق ہم سے بہت زیادہ شکایتیں کی گئیں۔ اور گھی کے بجائے جو چیزیں کثرت سے فروخت ہو رہی ہیں۔ ان کی جانب بھی ہمیں توجہ دلائی گئی۔ اگر ان چیزوں کی پوری طرح تشریح کر دیجائے اور ان کے ایسے نام نہ رکھنے دیئے جائیں جن سے عوام کو یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ بھی گھی ہے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ تمام ملکوں میں یہ چیزیں سستی اور معقول غذا سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن اعتراض تو دراصل غلط بیانی اور دھوکہ دہی پر ہے۔ ہندوستان

میں اسوقت بالکل وہی صورت ہے جو نقلی مکھن کے رواج کے وقت برطانیہ کے مکھن کے بازار کی تھی۔ مکھن بنانے والوں کو ناجائز مقابلہ سے اور استعمال کرنے والوں کو دھوکہ سے بچانے کے لیئے مکھن کے نام سے ایسی چیزوں کا فروخت کرنا ممنوع قرار دیدیا گیا تھا۔ جن میں دودھ کے علاوہ دوسری چیزوں کا کچھ بھی جزو شامل ہو۔ اس خیال سے کہ بیچنے والے ایسے نام نہ رکھیں جن سے خریدنے والے کو یہ دھوکہ ہو کہ وہ مکھن لے رہا ہے۔ قانون کی رو سے یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ اس کے ناموں کی محکمہ زراعت سے منظوری حاصل کی جائے۔ اس لئے ہماری یہ رائے ہے کہ گھی نکالنے والوں کے تحفظ کیلئے اسی قسم کی کارروائی کی یہاں بھی ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب تک میونسپلٹیوں کو اس معاملہ میں پورا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ اور ان اختیارات کو وہ استعمال نہ کرینگی تو خالص گھی دستیاب نہ ہونے کی دقت بڑھتی جائے گی۔ کیونکہ بلا روک ٹوک ملاوٹ کئے جانے اور گھی کے بجائے دوسری چیزیں فروخت ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ خالص گھی بازار میں نایاب ہوجائے گا"

مذکورہ بالا سطور سے ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ انسدادی قانون منظور کئے جائیں اور نہایت سختی سے اسپر عمل کرایا جائے سیاسی تحریک کو کچلنے لیئے حکومت جتنی کوشش کرتی ہے اگر اس بدعنوانی کے تدارک کے لیئے اسکی نصف کوشش بھی کرے تو ہمیشہ کے لیئے اسکا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے بالکل صحیح لکھا ہے "جب تک ملاوٹ پر پابندیاں عاید نہ کیجائیں گی شہروں میں نہ صرف خراب دودھ ملیگا۔ بلکہ مہنگا بھی رہیگا" لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ

لہ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۴

کی روئیداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ممبروں نے حکومت کو بار بار اس جانب توجہ دلائی اور درخواست کی کہ باہر کے تیل کو گھی کے نام سے بیچنے کی ممانعت کر دی جائے۔ طرح طرح سے اس کی مختلف صورتیں بھی تجویز کیں لیکن حکومت نے اس کے انسداد کے لیئے کسی طرح کی کوئی کاروائی کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ آج بھی ہندوستان میں تیل بنا سپتی گھی کے نام سے دھڑا دھڑ فروخت ہوتا ہے یہ تیل درخت کی پتیوں اور گھاس سے نکالا جاتا ہے اور بالکل گھی کے مشابہ ہوتا ہے اس لیے جانوروں کے دودھ سے گھی نکالنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کسی ملک میں بنا سپتی گھی کے نام سے تیل کا فروخت ہونا حکومت پر ایک بدنما دھبا ہے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں اچھے مویشی کبھی تھے ہی نہیں۔ قدیم زمانہ سے یہاں کے لوگ مویشیوں کی نسل بہتر سے بہتر بنانے پر زور دیتے چلے آئے ہیں شاہی زراعتی کمیشن نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ تمام گرم ممالک کے مقابلہ میں ہندوستان میں بہترین مویشی ہوتے تھے پرانے زمانہ میں صرف نسل کی ترقی کے خیال سے اچھے سے اچھے سانڈ منتخب کر کے چھوڑ دیئے جاتے تھے اسیطرح بہترین گایوں کا دان بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے زمین پر بار بڑھ گیا ہے۔ اس لیئے چراگاہیں بھی کاشت کر لی گئی ہیں۔ اور جنگلوں میں مویشیوں کے چرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس لئے بہترین گائیں اور بھینسیں یا تو شہر میں بیچ دی جاتی ہیں۔ جہاں دودھ کے ایک دور کے بعد انہیں ذبح کر دیا جاتا ہے۔ یا فوجوں کے ہاتھ فروخت کر دیجاتی ہیں جہاں بیرونی سانڈوں سے جوڑ ملا کر ان کی نسل ہمیشہ کے لیئے تباہ کر دی جاتی ہے۔ یہ صورت عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ پھر بھی ہندوستان میں اتنے مویشی

موجود ہیں کہ اصلاح کا کام آسانی سے شروع کیا جا سکتا ہے۔

جانور پالنے کا مسئلہ مختلف حیثیتوں سے نہایت ہی اہم ہے۔ اگر معقول طریقہ سے اس کا انتظام کیا جائے تو بہت سے آدمی زور گار سے لگ سکتے ہیں۔ اور دودھ گھی وغیرہ کی صنعت کو بھی ترقی ہو سکتی ہے۔ زمین کی اوسط پیداوار کھاد کے بغیر نہیں بڑھ سکتی ہے۔ اور گوبر سب سے اچھی اور سب سے سستی کھاد ہے۔ اس کا کوئی نعم البدل بھی نہیں ہے۔ اور یہ مویشیوں ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

بیج کی ترقی

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ محکمہ زراعت نے بیج کی ترقی کے سلسلہ میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ نئے قسم کے بہتر بیج دریافت کئے گئے۔ لیکن گنے کے علاوہ باقی بیجوں کو مقبول بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ بازار کی حالت سنبھالنے کیطرف سے انتہائی لاپروائی برتی گئی ہے۔ اس لئے بازار ناموافق ہونے کی وجہ سے کسان نے بھی بہتر قسم کے بیج بونے کا خیال مجبوراً ترک کر دیا ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ قدامت پرستی کی وجہ سے کسان ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسان کو یہ اطمینان ہو جائے کہ نئے قسم کے بیجوں پر جو زائد خرچ اور محنت ہو گی اسی نسبت سے منافع میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ تو وہ بڑی خوشی سے انھیں استعمال کرنے لگے گا۔ بازار کی خراب حالت کے متعلق ہم ڈاکٹر کاسٹن ماہر فن کی رائے پیش کرتے ہیں آپ عرصہ تک زراعتی معاملات میں حکومت ہند کے مشیر رہے ہیں۔ شاہی زراعتی ریسرچ کونسل نے آپ کو انگلستان کی سب سے بڑی نمائش میں شرکت کے لئے بھیجا تھا۔ آپ نے وہاں یہ دیکھا کہ اس وقت ہندوستان کی نئی اقسام کو بیرونی

بازار میں مقبول بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ حالانکہ اسی مقصد کیلئے ہندوستان کی جانب سے انگلستان میں ایک ہائی کمشنر رہتا ہے۔ کسی چیز میں اصلاح و ترقی کرنے سے کیا فائدہ اگر اسے ملکی اور غیر ملکی بازاروں میں اچھے داموں فروخت کرنے کا انتظام نہ کیا جائے۔ فروخت کی معقول صورتیں پیدا کئے بغیر بہتر بیج تیار کرنے پر جو کچھ خرچ کیا جائے وہ ضائع کرنے کے برابر ہے۔ پیداوار کے مختلف معیار قائم کرنے کے متعلق کیا عرض کیا جائے ہندوستان کے بازار کی حالت بہت ردی ہے۔ اور اچھی اور بری چیزوں کی قیمتوں میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں پیداوار کا ایک معیار قائم کرنے اور اس کے مدارج مقرر کرنے پر بہت کافی خرچ کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوشش صرف اناج اور خشک پیداوار تک ہی محدود نہیں رکھی جاتی بلکہ ترکاریوں اور پھلوں کی پیداوار کے بھی مدارج قائم کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال بہت کافی زراعتی مال امریکہ سے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ زراعت میں اس وقت تک کوئی ترقی نہیں ہو سکتی جب تک پیداوار کے مناسب مدارج قائم نہ ہو جائیں۔

ٹڈی۔ کیڑے مکوڑے اور بیماریاں

اگرچہ ہر سال یہاں بہت کافی روپیہ کیڑوں وغیرہ کی تحقیقات پر خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن اب تک محکمہ زراعت کو اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ تمام پرانی بیماریاں اب بھی موجود ہیں۔ ان میں کچھ اضافہ ضرور ہو گیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس سلسلہ میں بہت کچھ عملی کام کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ماہرین جو طریقے تجویز کرتے ہیں وہ یا تو ناقابلِ عمل ہوتے ہیں یا اتنے گراں خرچ کہ ان پر عمل کرنا کسان کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ بڑی بڑی تنخواہوں پر ماہرین ملازم

رکھنے کے بجائے جنکی تحقیقات کا سلسلہ نہ کبھی ختم ہوتا ہے اور نہ عملی کام کرنے کی کبھی نوبت آتی ہے۔ بہتر یہ ہو کہ مختلف ملکوں سے طرح طرح کی بیماریوں اور کیڑوں وغیرہ کی معلومات فراہم کرکے کسانوں میں مشتہر کردی جائیں۔

ہمارے کہنے کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ بیرونی ماہرین نے ملک کے لیئے کوئی مفید کام نہیں کیا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ایسے ماہرین بھی۔ گذرے ہیں۔ اور اس وقت بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی ہونے کا امکان ہے۔ جنہوں نے اپنی وسیع معلومات اور زبردست تجربہ سے ملک کو بلاشبہ فائدہ پہنچایا۔ ہم ان کی خدمات کی قدر کرتے ہیں اور ان کے شکر گذار ہیں۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بیرونی ماہرین خواہ کتنے ہی قابل اور پرجوش کیوں نہ ہوں۔ لیکن قدرتاً ہندوستانی ماہرین کے برابر کام نہیں کرسکتے۔ بیرونی حضرات کو متعدد مشکلات کے ماتحت کام کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ دیسی زبانوں سے واقف نہیں ہوتے۔ عوام کے ساتھ مساویانہ تعلقات پیدا نہیں کرسکتے۔ اور ہندوستانی جذبات، تہذیب و رسم و رواج اور حالات کا کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان میں نہ تو ہندوستان کے ساتھ محبت ہوسکتی ہے۔ اور نہ عوام کی خدمت کا جذبہ

بیرونی ماہرین کو ایک معینہ مدت کے لئے اس غرض سے تو بلایا جاسکتا ہے کہ وہ کسی خاص موضوع میں ہندوستانیوں کو تعلیم دیں لیکن تعلیم۔ صنعت و حرفت اور زراعت جیسے تعمیری معاملات میں حکومت کی پالیسی میں انہیں کوئی دخل نہ ہونا چاہیئے۔

خودرو گھاس کا مسئلہ

ہندوستان میں کبھی اس امر کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی کہ خودرو گھاس کے مسئلہ کی تحقیقات کیجائے۔ خوش قسمتی سے پرانے زمانہ کے اوزار اور ہل کے ذریعہ سے کسان انہیں خود نکال پھینکتا ہے۔ لیکن دراصل اس مسئلہ پر بھی پوری طرح غور ہونا چاہئے۔ اور مکمل تحقیقات کرنا چاہئے۔ تاکہ ہندوستانی کسانوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

باب ششم

رسل ورسائل کا نظام۔ برقی قوت اور لاسکی کا انتظام
ثانوی دیہی صنعتوں کی امداد اور نئے جنگل لگانیکی کوشش

رسل ورسائل

مال کی نکاسی کی بہتر صورتیں اسی وقت پیدا ہوسکتی ہیں جب رسل ورسائل کی سہولتیں میسر ہوں۔ اچھا بازار اسوقت تک نہیں مل سکتا جب تک آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے اور مال بھیجنے کا انتظام نہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے کے مقابلہ میں اب یہ سہولتیں بہت زیادہ حاصل ہیں۔ مغل اور ہندو دور میں رسل و رسائل کے ذرایع اتنے وسیع نہ تھے، ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لئے بہت کم پختہ سڑکیں تھیں۔ اونٹ۔ گھوڑے اور بیلوں وغیرہ کے ذریعہ سے آمد و رفت اور باربرداری ہوتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں ندیاں بھی اس کام میں آتی تھیں۔ لیکن ملک کا بہت تھوڑا حصہ ان سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ گویا اس زمانہ میں آمد و رفت اور رسل و رسائل دوسرے ملکوں کی طرح بہت محدود تھے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ صورت پہلے کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ سہولتیں ہمارے لئے باعث رحمت ثابت ہوئی ہیں۔ یا ان سے ہمارے مصائب میں اور اضافہ ہوگیا ہے

مانا کہ اب ریلوں کے ذریعہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا اور مال بھیجنا بہت آسان اور آرام دہ ہو گیا ہے لیکن ان ریلوں سے کسان کی اقتصادی حالت پر جو اثر پڑتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

ریلیں سراسر رحمت کا سبب نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے ان سے ملک پر بہت زیادہ بار بھی پڑا ہے کیونکہ کمپنیوں کو بہت کافی روپیہ امداد کے طور پر دیا گیا۔ اس پر مفصل بحث کرنا ہمارے موضوع سے باہر ہے کہ کس طرح ہندوستان کو بڑی بڑی رقمیں بطور سود کے ان کمپنیوں کو دینی پڑیں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ہندوستان میں ریلیں بہت گراں پڑیں اور ان کے نظم و نسق پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے، اسی لئے ان کا کرایہ بھی بہت زیادہ ہے ورنہ جمع خرچ برابر کیسے ہو سکتا، تمام مشینیں حتیٰ کہ ان کے چھوٹے بڑے پرزے بھی انگلستان اور دیگر یورپین ممالک سے بڑی بڑی قیمتوں پر خریدے جاتے ہیں تاوقتیکہ موجودہ اخراجات میں کمی نہ کی جائے۔ بیرونی سرمایہ کی بجائے ہندوستانی سرمایہ نہ لگایا جائے۔ اور ہندوستان ہی میں مشینیں بھی تیار نہ کیجائیں۔ کرایہ کے کم ہونے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔ ہمارے یہاں افراط سے لوہا اور کوئلہ نکلتا ہے۔ اس لئے حکومت کے لئے یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے۔ کہ ریلوں کی مشنری باہر سے لائی جائے۔ اور ہندوستان ہی میں ان کے تیار کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا جائے۔

ریلوں کے تباہ کن اثرات

ریلوں کے اس گران نظام سے زراعتی پیداوار کی نقل و حرکت پر بھی بہت ہی

خراب اثر پڑا ہے۔ درآمد اور برآمد کے اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ کسی جنس کی معقول قیمت نہیں اٹھتی ریل کا محصول مقررہ ہے اور کوئی اسے گھٹا بڑھا نہیں سکتا، اس لئے باہر مال بھیجنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر پیداوار کو سستے سے سستا خریدیں اور جس جگہ بھیجیں وہاں مہنگے سے مہنگا فروخت کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکیں۔ اسطرح غریب کسان مجبور ہوتا ہے کہ اپنی پیداوار کم قیمت میں فروخت کر دے۔ اس کے علاوہ اسے دوسرے ملک کے مال سے مقابلہ بھی کرنا ہوتا ہے۔ اول تو وہاں فی ایکڑ پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے کرایہ اور محصول وغیرہ کم پڑتا ہے۔ اس لئے وہ ہمارے بازاروں میں ہمارے مال سے بھی کم قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں۔ بیرونی کاریگروں کو رسل و رسائل کی سہولتیں ملنے کا اثر ہندوستان کی اقتصادی حالت پر یہ ہوا کہ تمام صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ ہمارے کاریگر نئی ایجادوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، بخلاف اس کے دوسرے ملکوں میں مشینوں کے ذریعہ سے چیزیں بہت کافی تعداد میں تیار ہوتی ہیں اور ان پر بہت تھوڑا خرچ آتا ہے۔ اس لئے وہ ہمارے کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے مقابلہ میں بہت سستے داموں میں فروخت کر سکتے ہیں۔ آپ ہندوستان کے کسی بازار میں تشریف لیجائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ سارا بازار غیر ملکی چیزوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ اور یہ سب رسل و رسائل کی سہولتوں ہی کا نتیجہ ہے۔ آج ہندوستان ساری دنیا کی منڈی ہے۔ اور اس کے کاریگروں کو (بشرطیکہ کوئی باقی رہ بھی گئے ہوں) ساری دنیا سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع مہیا کرنے میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک میں یہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ساتھ

ہی اسکی صنعتوں کو ترقی بھی دیجائے تو بیشک یہ ایک نعمت ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن دوسری صورت میں یہی سہولتیں بربادی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ہندوستان کا بھی یہی حال ہوا۔ ریلوں کی وجہ سے بعض شہر اور قصبے تو ترقی کر گئے لیکن دیہاتی علاقوں کو اقتصادی طور پر سخت نقصان پہنچا۔ مانا کہ وہ چیزیں جو پہلے آسانی سے فروخت نہ ہو سکتی تھیں، اب ان کے لئے بازار کھلا ہوا ہے۔ لیکن کسانوں کو ان کی فروخت سے جو نفع ہوتا ہے اس کی کسر دوسری طرف نکل جاتی ہے۔ تمام صناعوں اور کاریگروں کو مجبوراً اب زراعت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کاشت کا رقبہ فی کس برابر گھٹ رہا ہے اور جیسا شاہی زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے غریب کسان کو سال میں چھ مہینے بیکار رہنا پڑتا ہے۔ ان ہندوستانی اخباروں کو جو انگلستان کے بے روزگاروں کی تعداد بڑی مسرت سے پیش کرتے ہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی تقریباً نصف آبادی ہمیشہ بے روزگار رہتی ہے۔

تجارت کی تاریخ پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ریلوں سے ہمیشہ ہندوستان ہی کو فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۹-۳۱ء میں کناڈا اور اسٹریلیا ہزاروں میل سے اپنا گیہوں لائے اور خود ہمارے بازاروں میں ہمارے گیہوں سے سستا کر کے بیچا۔ ان ملکوں سے ہندوستان کی بندرگاہوں تک صرف ۸ر من کا خرچ پڑتا ہے اس کے مقابلہ میں ذرا ملاحظہ کیجئے کہ لائل پور سے کلکتہ صرف ایک ہزار میل ہے۔ لیکن اتنے سے فاصلہ میں ڈیڑھ روپیہ من پڑ جاتا ہے۔ یعنی اُن لوگوں کو اسٹریلیا یا کنیڈا سے مال لانے پر جو خرچ پڑتا ہے۔ ہندوستانی کسان کو صرف اتنے سے فاصلہ پر اس کا سہ گنا دینا ہوتا ہے۔ اسٹرابرج کھانڈ کو لیجئے جاوا سے

ہندوستان کی بندرگاہوں تک آٹھ آنے من خرچ ہوتا ہے۔ لیکن بمبئی یا کلکتہ سے میرٹھ تک دو روپیہ من، یہ امر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بعض چیزوں کو ہندوستانی بندرگاہوں تک پہنچانے کے لئے ریلوے نے رعایتی محصول جاری کئے تھے پہلے جو اشیاء ہندوستان سے باہر روانہ کیجاتی تھیں۔ ان پر بہت کم ریلوے محصول بندرگاہ تک ادا کرنا پڑتا تھا۔ مگر وہی اشیاء جب ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ کو روانہ کیجاتی تھیں تو ان کو بہت زیادہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی صنعتیں اپنی خام پیداوار سے محروم ہوگئیں۔ ریلوں کے موجودہ طرزِ عمل سے کسانوں کو نفع ہوتا ہے یا نقصان۔ اس کا اندازہ شاہی زراعتی کمیشن کی رپورٹ کے بغور مطالعہ کرنے سے ہوسکیگا۔ اس معاملہ میں ہندوستانیوں کی شکایتوں اور تکلیفوں کا اظہار کرنے میں کمیشن مذکور نے بڑے تامل سے کام لیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان واقعات کا انکار کیسے کرسکتے تھے، جن سے بہرحال موجودہ نظام کی خرابیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ انہیں تسلیم ہے کہ ریلیں جنگل سے سوختنی لکڑی لاکر سستے داموں کسان کو مہیا نہیں کرتی ہیں۔ اسلئے وہ گوبر جلانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور اس سے فصل کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جو لوگ خواہ مخواہ چلاتے ہیں کہ کسان یہ قیمتی کھاد جلا ڈالتا ہے۔ اس بیان سے انکی آنکھیں کھل جانی چاہیئے۔ اور حقیقت حال اچھی روشن ہوجانی چاہیئے۔ کمیشن مذکور کو تسلیم ہے کہ جب تک سستا ایندھن مہیا نہ کیا جائے گا کسان برابر گوبر جلاتا رہے گا۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے۔ کہ پچاس میل کے فاصلہ سے بھی ریلوں کے ذریعہ ایندھن لانا سستا نہیں پڑتا ہے۔ یہی رائے ان کی چارہ کے متعلق ہے۔ حالانکہ جنگلوں میں بہت کافی چارہ موجود ہے

لیکن تھوڑے فاصلہ سے بھی ریلوں کے ذریعہ نہیں لایا جا سکتا۔ کسقدر افسوس کی بات ہے کہ ریلوں کے نظام کی خرابی کی وجہ سے ہر سال غریب کسان کو بے انتہا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ آخر دیہاتی علاقہ میں رسل و رسائل کا انتظام کیوں کیا گیا اور جنگلوں کو کیوں چھوڑ دیا گیا۔ حالانکہ ملک کو اس سے کافی آمدنی ہو سکتی ہے، ہمارا تخمینہ ہے کہ صوبہ جات متحدہ میں جنگلوں سے آٹھ آنے فی ایکڑ آمدنی ہوتی ہے اگر اخراجات اسمیں سے وضع کر دیئے جائیں تو قریب قریب کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ باوجودیکہ ہندوستان کی مختلف قسم کی آب و ہوا میں وسیع اور زرخیز جنگل موجود ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں کے لئے اسے باہر سے لکڑی اور لکڑی کا سامان منگانا پڑتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک ریلوں کے سلیپر بھی باہر ہی سے آتے تھے، پنسل اور دیاسلائی کی صنعت کے لئے بھی ہندوستان بیرونی لکڑی کا محتاج ہے۔ گویا ریلیں نہ صرف ملک کی صنعتوں کی امداد نہیں کرتیں بلکہ بڑی حد تک ہماری صنعتی ترقی کے درمیان میں حائل ہیں۔ یہاں ہم چند حیرت انگیز اعداد و شمار پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ آیا ہماری مذکورہ بالا رائے کہاں تک صحیح ہے۔ ریاست ستارا کے لالٹین کے ایک کارخانہ دار نے مجھ سے کہا کہ وہ چار روپیہ ٹن کے حساب سے کولیری پر کوئلہ خریدتے ہیں۔ لیکن کارخانہ تک پہنچتے پہنچتے ۲۶ روپیہ ٹن پڑ جاتا ہے۔ یعنی صرف محصول پر ۲۲ روپے ٹن خرچ آتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ اوگلو واڈی سے بمبئی صرف دو سو میل ہے اتنے فاصلہ پر لالٹینوں کے ایک صندوق پر جو خرچ آتا ہے وہ جرمنی سے بمبئی تک کے محصول سے چار آنہ زیادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ جرمنی کا فاصلہ ہزاروں

میل کا ہے، ایسی صورت میں ہندوستانی صناعوں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ کہ وہ بیرونی صناعوں کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔ ہندوستان کو تو اپنی خام پیداوار اور اپنے تیار شدہ مال دونوں پر بہت زیادہ محصول دینا پڑتا ہے۔ اسی ریاست میں ایک اور کارخانہ بھی ہے جو زراعتی اوزار تیار کرتا ہے، ریل کے محصول کی وجہ سے وہ بھی مال کو فروغ نہیں دے سکتا۔ اس نے اپنا معاملہ بار ہا ریلوے بورڈ کے سامنے پیش کیا لیکن ابتک اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی کو اپنی رپورٹ میں مجبوراً تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ہڈی اور شورہ اگرچہ نہایت اعلیٰ قسم کی دیسی کھاد ہیں۔ لیکن ان کے مقابلہ میں بیرونی مصنوعی کھاد پر محصول کی رعایت کیجاتی ہے ہندوستان کے جنگلوں میں کثرت سے سڑی ہوئی پتیاں ملتی ہیں جو کھاد کے طور پر استعمال ہوسکتی ہیں۔ لیکن محض ریلوں کے غیر معمولی محصول کی وجہ سے کسانوں کو مہیا نہیں کیجا سکتیں۔ بخلاف اس کے مصنوعی کھاد ہزاروں میل سے لاکر ان کے گھروں پر پہنچا دیجاتی ہیں۔ گرم آب ہوا کی وجہ سے یہاں دودھ اور پھل ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں بھیجے جا سکتے تاہم ریلوے نے برف میں رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ دوسرے تمام ملکوں میں ریلیں اس کا انتظام کرتی ہیں۔ نیویارک (امریکہ) میں تو ڈیڑھ سو میل تک سے دودھ آکر فروخت ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں پچاس میل سے بھی نہیں آسکتا زراعتی پیداوار کی نقل و حرکت کے لئے گاڑیوں کے وقت ایسے مقرر نہیں کئے جاتے جن سے زراعتی اشیاء ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں آسانی ہو حال ہی میں آم دوسرے ملکوں میں بھیجنا شروع ہوا ہے، لیکن ابھی دیکھنا ہے کہ آیا

اس سے ہندوستان کو کچھ نفع بھی پہنچے گا۔ یا اسکی وجہ سے اشیاء خوردنی کی درآمد میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ ریل کا محکمہ اس کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ کہ خراب ہونیوالی چیزوں کو جلد ہی پہنچا دے۔ نہ ریلوے یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ مقررہ وقت کے اندر مال اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ فرض کیجئے کسی تاجر کو تار سے اطلاع ملی کہ فلاں جنس فلاں مقام پر اونچے داموں فروخت ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ خیال کر کے اس چیز کو وہاں بھیجنے سے نفع ہوگا۔ وہ خرید لیتا ہے۔ اور وہاں روانہ کر دیتا ہے۔ لیکن مال کو وہاں پہنچتے پہنچتے اتنا عرصہ لگتا ہے کہ وہاں قیمتیں گر جاتی ہیں اور نفع کی بجائے اسے الٹا نقصان ہوتا ہے انہی مشکلات کی وجہ سے مال کی آزادانہ نقل و حرکت نہیں ہو سکتی۔ یہ موقع ریلوے کے خلاف شکایتوں کی تفصیل کا نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کی ریلیں کسان کی اتنی مدد نہیں کرتیں جتنی دراصل وہ کر سکتی ہیں۔ امریکہ کی ۱۹۲۱ء کے زراعتی مشکلات اور اس کے اسباب کی رپورٹ میں اس امداد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو ریلوں سے کسانوں کو مل سکتی ہے رپورٹ کے اختتام پر انہوں نے لکھا ہے کہ ہمیں یقین ہے زراعت کو بحال کرنے کیلئے پیداوار پر فوراً محصول کم کرنا قطعی ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ ریلوے بورڈ اور دوسری نمائندہ جماعتوں کو بہت جلد اس جانب توجہ کرنا چاہیئے۔" گویا اس کمیشن کی رائے میں تو محصول کم کرنا قطعی ضروری ہے۔ لیکن ہمارا ریلوے بورڈ عین کساد بازاری کے وقت محصول بڑھاتا ہے تاکہ بجٹ متوازن ہو سکے۔ یہ اختلاف عمل کسی شرح کا محتاج نہیں ہے۔ تاجروں کے زراعتی کمیشن کی یہ رائے ہے کہ "اگر مانگ کے ساتھ ساتھ اخراجات باربرداری میں بھی اضافہ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ اخراجات ہمیشہ کے لئے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اور لاگت اسطرح ہمیشہ بڑھتی چلی جاتی ہے" لیکن ہمارا ریلوے بورڈ اس کا قائل نہیں ہے۔ اس کا طرز عمل یہ ہے کہ پہلے تو اخراجات کو بہت بڑھا دیا جائے اور پھر یہ کہا جائے کہ اگر محصول گھٹایا جائے گا تو اتنی آمدنی بھی نہ ہوگی کہ اخراجات پورے ہو سکیں۔ اس طرح یہ لغو سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اور ملک کی تجارت تباہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ زراعتی تحقیقاتی ٹریبونل نے بھی اس مسئلہ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس سلسلہ میں خاص طور پر بلجم کی مثال دی ہے جہاں چھوٹی ریلوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے اور اس سے رسل و رسائل پر بے انتہا امداد ملتی ہے۔

ہمیں اقرار ہے کہ حال ہی میں ریلوں نے گنے کی نقل و حرکت اور شکر کی برآمد پر محصول میں کچھ رعایت کر دی ہے۔ اگرچہ یہ رعایت اب بھی کم ہے۔ لیکن اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ ریلوں کے ذریعہ سے صنعتوں کی امداد ہو سکتی ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر محصول کم کر دیا جائے تو ریلوے کو نفع نہیں ہو سکتا اس لئے ریلوے بورڈ نے تجارتی حلقوں کے اس مطالبہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ہر جنس کی قسم۔ مانگ اور رسد۔ اور تجارتی ضروریات کے لحاظ سے شرح محصول پر نظر ثانی ہونا چاہیئے۔ اگر وہ یہ گوارا کرتے تو انہیں اطمینان ہو جاتا کہ واقعی اس شرح میں فوری ترمیم کی ضرورت ہے۔ بعض چیزوں پر جو جسامت میں بڑی ہوتی ہیں لیکن بہت سستی فروخت ہوتی ہیں اتنا زیادہ محصول پڑتا ہے کہ وہ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتیں بخلاف اس کے بعض قیمتی چیزوں پر بہت کم محصول ہے اس کے علاوہ جن مقامات پر سامان تیار ہوتا ہے۔ وہاں خام پیداوار کھینچنے پر اور

تیار شدہ مال وہاں سے تقسیم کرنے پر بھی کم محصول ہونا چاہیئے۔ ایک انگریزی کارخانہ کے ساتھ اب تک یہی اصول برتا جاتا تھا یعنی خام پیداوار منگوانے اور تیار شدہ مال بھیجنے پر اس کارخانے سے کم محصول لیا جاتا تھا۔ یہ رعایت برسوں تک جاری رہی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ایک کارخانے کے ساتھ جو رعایت ہو سکتی ہے وہ دوسرے کارخانوں کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتی۔

ریل اور بحری وسائل کا مقابلہ

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ریلیں محصول میں جہازوں اور کشتیوں سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ جہازوں کی بہ نسبت ریلوں کے چلانے میں خرچہ زیادہ ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ ریلوں سے قبل ہندوستان میں جو بحری تجارت اتنی پھیلی ہوئی تھی اسکو کیوں رفتہ رفتہ برباد ہونے دیا؟ ہندوستان میں سینکڑوں ندیاں اور نہریں ہیں اگر رسل و رسائل کا یہ طریقہ زیادہ سستا پڑتا ہے تو نئی ایجادوں کے اضافہ کے ساتھ کیوں نہ اسے از سر نو زندہ کیا جائے۔ دراصل ہم حکومت پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگر واقعی وہ چاہتی ہے کہ تجارت ترقی کرے تو یہ اس کا فرض ہے کہ رسل و رسائل کے ذرایع کو خواہ وہ ریلیں ہوں یا کشتیاں سستا کر دے اگر سچ مچ وہ کسانوں کو اس مفلسی کے غار سے نکالنا چاہتی ہے تو زراعتی پیداوار کی نقل و حرکت کا خرچ بہت کم کر دے۔

دیہاتی علاقوں کے اندرونی رسل و رسائل کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ دیہاتوں میں نہ تو پکی سڑکیں ہیں اور نہ کچی۔ حتیٰ کہ قدیم راستے بھی کھیتوں میں شامل

کرلئے گئے ہیں۔

برقی قوت

ہندوستان میں قدرتی اور مصنوعی آبشار بے شمار ہیں۔ جن سے بہت کافی مقدار میں کم خرچ پر برقی قوت حاصل کیجا سکتی ہے۔ حکومت نے پانی سے بجلی حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک تحقیقات کی تھی تاکہ کم خرچ سے برقی قوت حاصل ہو سکے۔ لیکن ابتک اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں کوئی کارروائی نہیں کیگئی مختلف چیزیں ہندوستان میں سستی اسوقت تک نہیں بن سکتیں جب تک بجلی کی طاقت جس سے بڑے بڑے کارخانہ چلائے جائیں سستی نہو۔ کوئلہ ملک کے صرف ایک حصہ میں ہوتا ہے۔ اور اسے وہاں سے لانے کا خرچ بہت زیادہ پڑتا ہے۔ اسلئے کم خرچ کوئلہ سے بھاپ تیار کرکے کارخانے سے مہنگا پڑتا ہے البتہ مختلف آبشاروں سے برقی قوت بہت سستی حاصل ہو سکتی ہے ہندوستان میں جنگل بھی افراط سے ہیں لیکن بجلی کی ترقی کے لئے ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا ہے برما کے سوا ملک میں کہیں مٹی کا تیل نہیں نکلتا۔ مگر اسپر بھی ایک بیرونی کمپنی کا اجارہ ہے۔ یہ کمپنی بہت مہنگا تیل فروخت کرتی ہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔ البتہ جب کسی بیرونی کمپنی سے مقابلہ ہوتا ہے تو ضرور کچھ سستا کر دیتی ہے۔ لیکن عموماً پھر اس سے ملکر آپس میں ایک قیمت طے ہو جاتی ہے اور دونوں معقول نفع اٹھاتی ہیں۔ گویا مٹی کے تیل کی شرح قیمت ان کمپنیوں پر منحصر ہے جو باہر سے یہاں تیل لاتی ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ قوت پیدا کرنے کا ذریعہ ایک غیر ملکی کمپنی کا اجارہ ہو جس سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ وہ قومی مفاد کے مطابق عمل کرے گی۔ اسطرح بہ ظاہر ہوتا ہے کہ مٹی کے تیل سے

برقی قوت حاصل کرنا یہاں آسان نہیں ہے۔ دیہی صنعتوں کی اشاعت و ترقی کے لئے تو سستی سے سستی برقی قوت کی ضرورت ہے۔ ہم یہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ پانی کی قلت کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اور پانی چند فٹ سے لیکر سو فٹ تک کی گہرائی سے نکالنا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر پانی نکالنے کا کام برقی قوت سے لیا جاوے تو برقی قوت بہت کافی سستی ہونی چاہیئے۔ یہاں نہروں میں بڑے بڑے آبشار ہیں اور جھیلوں اور ندیوں کا پانی بھی اسطرح روکا جا سکتا ہے کہ اس سے کم خرچ پر برقی قوت حاصل ہو سکے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی کوئی معقول کارروائی نہیں کی گئی۔ صرف صوبہ جات متحدہ کی حکومت نے تو آبشاروں سے برقی قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور زراعت کے استعمال کیلئے اسے فروخت کیا لیکن کسان کو یہ بھی ایک آنہ فی یونٹ سے کم نہیں ملتی اور دیسی صنعتوں کے لئے تو ڈیڑھ آنہ فی یونٹ تک ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ گنے کی قیمتی فصل کے علاوہ اور کسی فصل کے لئے ٹیوب ویل سے پانی نکالنے میں نفع نہیں ہوتا۔ یہ اور بدقسمتی ہے کہ حکومت نے اس برقی قوت کا ٹھیکہ ۱ پائی فی یونٹ کے حساب سے دیدیا ہے۔ گویا کسان جو ایک آنہ دیتا ہے اس میں سے حکومت کو صرف ۱ پائی ملتا ہے باقی ۵ پائی یعنی ۳۱ فیصدی کا بلا وجہ ٹھیکیدار کو نفع ہوتا ہے۔ اگر یہ ٹھیکہ ایسے لوگوں کو دیا جاتا جنکا زراعت سے کچھ تعلق ہوتا تب بھی خیر کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن یہاں تو کسان کا روپیہ ٹھیکیدار کے کام آتا ہے۔ یعنی کسان کا مفاد ٹھیکیدار کے نفع پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ۲۰ فٹ کی گہرائی سے پانی نکالنے کے لئے ایک آنہ فی یونٹ

فصلوں کے لئے بہت گراں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان علاقوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں ہے پانی عموماً بیس فٹ سے زیادہ گہرائی پر ملتا ہے۔ اس طرح بہت بڑا رقبہ بغیر آبپاشی کے رہ جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت آخر اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہے۔ کہ روئی اور ٹنے۔ چادل نکالنے۔ آٹا پیسنے اور بالائی نکالنے وغیرہ کی سی چھوٹی چھوٹی دیسی صنعتوں کے لئے بھی کسانوں سے ایک آنہ یونٹ کے بجائے ڈیڑھ آنہ وصول کرتی ہے۔ ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ کسان بہت مفلس ہے اور اس کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ معمولی سے معمولی صنعت سے اگر اسکی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ بھی ہو جائے تو اسکے لئے بڑی بات ہے۔ اگر حکومت کو یہ خیال ہو کہ سرمایہ دار اس رعایت سے فائدہ اٹھانے لگیں گے تو مصدقہ کاشتکاروں تک اسے محدود کر دیا جائے۔ لیکن یہ تو کوئی معقول بات نہیں معلوم ہوتی کہ اتنی زیادہ شرح مقرر کر کے دیسی صنعتوں کو برقی قوت کے استعمال سے محروم کر دیا جائے۔

روس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ملک کی ترقی کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز کم خرچ پر برقی قوت پیدا کرنا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانہ میں کامیابی کا راز اسی میں ہے چاہے وہ زراعتی ترقی ہو یا صنعتی ترقی۔ اگرچہ ہمارے پاس روس کی برقی قوت کے اخراجات کے متعلق اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ تاہم اس نے جس زبردست مقدار میں یہ قوت پیدا کی اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ سستی نہ پڑتی تو اس مقدار میں فراہم نہیں کیجا سکتی تھی، ہمیں علم ہے کہ روس کے پاس ایسے علاقہ کی کمی نہیں ہے جہاں سے مٹی کا تیل نکل سکتا ہو لیکن پھر بھی ملک کی پیداوار کو ترقی دینے کے لئے اس نے برقی قوت کا انتظام کیا۔ ملک کی عام ترقی کے لئے برقی قوت نہایت

ضروری چیز ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ زراعت کے لئے ضروری ہے کیونکہ اسمیں توسب سے کم نفع ہوتا ہے زراعت کی ترقی خاص طور پر آبپاشی اور کھاد پر منحصر ہے۔ سستی طاقت کے بغیر کنوؤں سے آبپاشی نہیں ہوسکتی اور کھاد کا مسئلہ بھی اسوقت تک آسانی سے حل نہیں ہوسکتا جب تک ہوا سے مصنوعی طریقہ پر نائٹروجن حاصل نہ کیجائے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہاں کھاد میں نائٹروجن کی بہت قلت ہے۔

ہندوستان میں ابتک مصنوعی کھاد کا رواج نہیں ہوا ہے اور جب تک زراعتی پیداوار کی قیمتیں اتنی گری ہوئی رہیں گی امید نہیں ہے کہ آئندہ بھی اس کا رواج ہوسکے دوسرے ملکوں میں یہ طریقہ کامیاب ثابت ہوا ہے کہ زبردست طاقت کی برقی لہر فضا میں چھوڑی جاتی ہے اور اسطرح مصنوعی کھاد بنائی جاتی ہے۔ بہرحال سستی کھاد بھی اسوقت تک تیار نہیں ہوسکتی جب تک برقی قوت سستی نہو۔

ذرا غور تو کیجئے کہ جرمنی میں ۱۹۲۲ء میں برقی قوت کے استعمال کرنے کے لئے ۱۴ سو کمپنیاں تھیں۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ ڈنمارک کا ہے کیونکہ وہاں سستی برقی قوت پیدا کرنے کے لئے جرمنی۔ ناروے اور سویڈن کیطرح نہ تو کوئلہ موجود ہے اور نہ پانی۔ تاہم ان مشکلات کے باوجود برقی قوت پیدا کرنے اور مہیا کرنے کیلئے سارے ملک میں بے شمار کارخانہ قایم ہیں۔ آج تمام بڑے چھوٹے کاشتکاروں کو برقی قوت مہیا کی جارہی ہے۔ پچاس ایکڑ سے کم کے کھیت پر بھی عموماً بجلی سے کام ہوتا ہے ڈنمارک میں ٹیلیفون عام ہے۔ وہاں کے کسانوں کو برقی قوت۔ روشنی اور ٹیلیفون کی سہولتیں میسر ہیں۔ یہ چیزیں اس تجارت کے لئے بے انتہا مفید ہیں۔ ٹیلیفون وہاں

نہ صرف کم خرچ ہے بلکہ انتہائی درجہ پر مکمل بھی ہے۔ ہندوستان میں ٹیلیفون بہت ہی گراں ہے۔ بڑے شہروں میں عموماً دو سو روپیہ سال پڑتا ہے۔ لیکن دیہاتوں میں اس سے کہیں زیادہ پڑے گا۔ جو کسان اپنے کھیتوں میں برقی قوت استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے لئے بھی ٹیلیفون کا کوئی ایسا انتظام نہیں ہے کہ بوقت ضرورت وہ اس کے ذریعہ سے ٹھیکیدار کو فوراً مطلع کر سکیں۔

ممالک متحدہ امریکہ میں سارے ملک میں لاسلکی کا انتظام ہے اور اس کے ذریعہ سے موسمی حالات۔ بازار کی خبریں اور دوسری اطلاعات جن کی کاشتکار کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے مشتہر کی جاتی ہیں۔ ہم بھلا ہندوستان کے دیہاتوں میں لاسلکی کا خیال بھی کیسے کر سکتے ہیں۔ جبکہ ابھی ڈاکخانے بھی موجود نہ ہوں اور ڈاک بھی ہفتہ میں صرف دو بار تقسیم ہوتی ہو۔

دیہی صنعتیں

شاہی زراعتی کمیشن نے لکھا ہے کہ "جرمنی۔ اسٹریلیا اور یورپ کے بعض دوسرے چھوٹے چھوٹے ممالک میں دیہی صنعتوں کی امداد پر خاص توجہ کی گئی ہے ہندوستان میں اسوقت زمین پر جو بار بڑھ رہا ہے اگر اس میں کافی کمی کرنا مقصود ہے تو لوگوں کو صنعتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہیئے" کمیشن مذکور نے اپنی فہرست میں بہت سی صنعتوں کی فہرست بھی دی ہے اسلئے ان کی تفصیلات پر بحث کرنا فضول ہے لیکن ہم حکومت اور عوام کی توجہ اس جانب ضرور مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ سب سے اہم صنعتیں دودھ، اناج اور تیل سے متعلق ہیں اس لئے انہیں ہر گاؤں میں رائج کرنا

چاہیئے۔ خوردنی اشیاء کی درآمد کے اعداد و شمار پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ انکی درآمد آئے دن بڑھ رہی ہے۔ کیا ہندوستان جیسے ملک کے لئے جہاں جَو اور جئی ہر سال لاکھوں من پیدا ہوتا ہے۔ یہ شرمناک امر نہیں ہے کہ وہ کوئیکر اوٹس۔ پرل بارلی۔ اور اوٹ میل وغیرہ باہر سے منگوائے۔ ہندوستانی کپڑے کے کارخانوں کے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ انکا ملک تو سالانہ لاکھوں من آلو۔ چاول۔ مکا اور دوسرے اناج پیدا کرے۔ پھر بھی نشاستہ باہر سے منگا کر یہ کارخانے استعمال کریں۔ اب ادھر پھل اور ترکاریاں بھی باہر سے آنا شروع ہوگئی ہیں۔ یہ سب اسوجہ سے ہے کہ دیہی صنعتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ ملکی صنعتوں کی ترقی ہو۔ بلکہ اس لئے بھی کہ کسان کی آمدنی میں اضافہ کئے بغیر وہ خوشحال نہیں ہوسکتا۔ عام صنعتوں کی ترقی سے دیہی صنعتوں کی ترقی کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے کم سرمایہ لیکن بہتر نظام اور زیادہ تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ صنعتوں کے رواج سے نہ صرف کسان کی آمدنی میں اضافہ ہوجائے گا۔ بلکہ انکی ذہنی اور دماغی ترقی بھی ہوگی

نئے جنگل لگانا

زراعت کے نقطۂ نظر سے بنجر زمینوں پر جنگل لگانا بھی نہایت اہم چیز ہے اگر گھاٹیوں میں اور بنجر اور ریتلی زمینوں میں صحیح قسم کے درخت لگائے جائیں اور ان کی نگہداشت کی جائے تو سستا ایندھن اور چارہ کثرت سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اگرچہ قدرت نے اس سلسلہ میں ہمیں کافی وسائل عطا کئے ہیں۔ لیکن اُن سے

کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اتنک گھاٹیوں وغیرہ کو اس کام میں لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی یا اگر کی گئی تو نہایت ہی جزوی اور حقیر۔

ہمیں اسکے اعادے کی ضرورت نہیں ہے کہ گوبر کو کھاد کے لیئے محفوظ رکھنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ اس کی بجائے کوئی سستا ایندھن مہیا کیا جائے۔ کسان کو آپ کتنا ہی برا بھلا کہہ لیں۔ لیکن آپ جب تک اسے سستا ایندھن مہیا نہ کریں گے۔ وہ اپنا رویہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس مسئلہ کا حل درخت لگانا ہے۔ اسے اگر آپ اس نظر سے دیکھیں تو اس کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔



باب ہفتم

زراعتی پالیسی کو مرکزی اور مقامی طور پر عملی جامہ پہنانے کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری جماعتوں کا قیام

غیر سرکاری جماعتیں

موجودہ کساد بازاری کے زمانہ میں پبلک اور حکومت دونوں کو متفق ہو کر ملک کی بہبودی کے لئے کام کرنا چاہیئے تھا لیکن اگر پبلک کی جانب سے اس کی کوئی منظم کوشش ہوتی بھی ہے کہ اس زبوں حالی کے اسباب معلوم کئے جائیں اور ان کا معقول علاج تجویز کیا جائے تو حکومت اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہے اور ہر طرح اسے دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ بارہا حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی کہ اس نازک وقت میں اُس کا فرض ہے کہ ایسے اعداد و شمار فراہم کرے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ آیا زراعت سے آج کل کوئی نفع ہوتا ہے۔ اور آیا اس سے لگان اور آبپاشی بھی ادا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ لیکن کبھی اس قسم کی تحقیقات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ اکثر صوبوں میں شرح آبپاشی میں کوئی تخفیف نہیں کی گئی اور معافی لگان کے متعلق تو حکومت کا یہ کہنا ہے کہ حکومت اور کسان کے درمیان چونکہ لگان کا کوئی معاہدہ نہیں ہے اس لئے حکومت کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالگذاری اور لگان بہت تھوڑا

معاف کیا جاتا ہے اور معافی کے باوجود کسان استحقاقاً اس کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ گویا غریب کسان بڑی مشکل میں ہے اپنی نازک حالت حکومت کے روبرو پیش کرنے کے لئے نہ تو وہ خود اپنی تنظیم کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت ہے اور تنظیم کے بغیر اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر کوئی انجمن قایم بھی کی جائے تو چاہے اس کا نام اور کام کچھ ہی کیوں نہو یہی خیال کیا جاتا ہے کہ لگان ادا نہ کرنے کی ترغیب دینے کے لئے یہ انجمن قایم کی گئی ہے۔

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ یہاں کسانوں کی خدمت کرنے والے قومی کارکنوں کو خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ جب کبھی کوئی زراعتی انجمن کسی ایسے معاملہ کے متعلق کوئی کارروائی کرتی ہے جس کا حکومت سے ذرا سا بھی تعلق ہو تو فوراً اس انجمن اور اس کے کارکنوں کو باغی قرار دیدیا جاتا ہے اور انھیں جیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ غیر سرکاری جماعتیں جو دوسرے ملکوں میں بہت کچھ کام کرتی ہیں اس ملک میں نشو و نما نہیں پا سکتیں زراعت کی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ایک مرکزی غیر سرکاری انجمن بنائی جائے اور ہر ایک گاؤں میں اس کی شاخیں قایم کی جائیں۔ وہ کارکن جنھیں نہ تو حکومت کی خوشنودی کی ضرورت ہے نہ خطاب کی خواہش ہے اور نہ اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ ہے اس قسم کی مفید انجمنیں قایم کرنے میں تامل کرتے ہیں کیونکہ جبتک وہ مقامی افسروں کی خفگی مول لینے کو اور حکومت کے ہاتھوں ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کو تیار نہوں وہ اس کام میں ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ یہ صورت بڑی افسوسناک ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام ملک میں اس قسم کی کوئی معقول انجمن نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر کتنی حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں تین چوتھائی آبادی زراعت پر گذر کرتی ہے

کوئی چیمبر آف ایگریکلچر نہیں ہے نہ کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے کوئی ملکی جماعت ہی۔ معاونینِ حکومت میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں قومی خادم کہے جا سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس قسم کے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے ذرا ان سے دریافت کیجئے۔ وہ آپ کو بتلائیں گے کہ کتنی مرتبہ انھیں مقامی افسروں کی رائے سے اختلاف کرنا پڑا اور پھر کتنی مرتبہ اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسانوں کو زندگی کی کشمکش میں امداد دینے والی غیر سرکاری انجمنیں ہمارے یہاں مفقود ہیں۔ اگر واقعی ہندوستان کی ترقی ہمیں مدنظر ہے تو ان مشکلوں کے باوجود ہمیں بددل نہ ہونا چاہیئے۔ اور کارکنوں کی ایک جماعت کو سرکاری خفگی اور سزا کی پروا نہ کرتے ہوئے کسانوں میں کام کرنے کے لئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ قربانی کامیابی کی کنجی ہے اس لئے اگر ہم اپنے کسانوں کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور اپنے بہترین آدمیوں کی قربانی دینا ہوگی قوم کے لیڈروں کی امداد کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ پھر ہندوستان میں تو یہ اور بھی ناممکن ہے کیونکہ ہمارے حکمراں ہمارے حالات اور ہماری ضروریات سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ کارکنوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو قومی خدمت کو اپنا فرض سمجھے اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی قربانی کرنے سے دریغ نہ کرے۔ ممکن ہے ان پر مقدمے چلائے جائیں اور انھیں سزائیں دی جائیں لیکن یہ قیمت تو ہندوستان کو بہرحال ادا کرنا ہوگی۔ غیر سرکاری جماعتوں پر ہم اس لئے زور دیتے ہیں کہ حکومت کے محتاج رہنے سے قومی معیار کبھی بلند نہیں ہو سکتا یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ڈنمارک کا تمام تعلیمی اور امداد باہمی نظام نجی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ حکومت نے بھی ان کی امداد کی لیکن ابتدا خود عوام ہی نے کی اسی طرح جرمنی میں بھی کوآپریٹو تحریک

ایک غیر سرکاری شخص نے شروع کی تھی اور عرصہ تک نجی کوششوں سے چلتی رہی۔

سرکاری تنظیم

ہم سرکاری تنظیم کے مقابلہ میں غیر سرکاری تنظیم پر زیادہ زور دیتے ہیں اس لئے ہم نے پہلے غیر سرکاری جماعتوں کے مسئلہ پر بحث کی دوسری ملکوں میں کوئی کونسلیں اور زراعتی کمیٹیاں ہوتی ہیں جو مرکزی نظام سے کسان کو وابستہ کرتی ہیں۔ ہر ملک کی ضروریات کے لحاظ سے ان جماعتوں کا اصولِ کار مختلف ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں حکومت ہند یا صوبجاتی حکومتوں کا زراعت کے متعلق کوئی اصول ہی نہیں ہے جس پر محکمہ زراعت عمل کر سکے۔ کبھی تو کام کی تمام ذمہ داری ایک جگہ مرکوز کر دی جاتی ہے اور کبھی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ مختلف محکموں میں بھی آپس میں اشتراک عمل نہیں ہے اور نہ کوئی خاص منزل مقصود پیش نظر رہتی ہے ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں زراعت پر تمام ملکوں سے کم خرچ کیا جاتا ہے اور وہ بھی مختلف محکموں میں اشتراک عمل نہ ہونے کی وجہ سے اور کوئی مطمح نظر مقرر نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر برباد جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کا کیا مطلب ہے کہ زراعت کا محکمہ تو ہندوستانی وزیر کے سپرد کر دیا جائے اور آبپاشی اور جنگل کا محکمہ سرکاری ممبر کے اختیار میں ہو۔ تمام گرم ملکوں میں آبپاشی پر زراعتی ترقی منحصر ہے اور جنگل سے مویشیوں کو چارہ ملتا ہے۔ پھر جب یہ محکمے بھی ہندوستانی وزیر کے سپرد نہ کئے جائیں (جو بہر حال کسان کی ضرورتوں اور مشکلوں سے زیادہ واقف ہوتا ہے) تو پھر کسان کی بدنصیبی کے ازالہ کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان تینوں محکموں کا ایک دوسرے سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ تعجب ہے کیوں یہ مختلف عہدہ داروں کی نگرانی میں

رکھے جاتے ہیں اور کوئی ایسا طریقہ کیوں نہیں نکالا جاتا جس سے ایک محکمہ دوسرے محکمہ کا معاون و مددگار ہو سکے۔

ہم کسی جگہ یہ لکھ چکے ہیں کہ نہر کا پانی بہت گراں پڑتا ہے اور کسان کے لئے یہ بار ناقابل برداشت ہے۔ نہروں پر جو کثیر رقم لگی ہوئی ہے اس کا سود بھی اسے ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہی ٹیوب ویل بھی کافی تعداد میں بنا دئے جاتے تو بہت بڑے رقبہ میں آبپاشی کا انتظام ہو جاتا اور کسان کو اس سلسلہ میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی۔ اس کے علاوہ دیہاتوں میں بجلی کے ذریعہ سے کاشت کرنا بھی جاری ہو سکتا تھا۔ نہروں سے کسانوں کو جو فائدہ پہنچتا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس صرف کثیر پر اعتراض نہ کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محکمہ آبپاشی کسانوں کو امداد پہنچانے کے مقابلہ میں آمدنی کا زیادہ خیال کرتا ہے۔ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتا ہے کہ چاہے فصل کو نقصان پہنچ جائے لیکن پانی میں کفایت ہو جائے۔ شروع شروع میں جب نہریں تیار ہوئیں تو کسانوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں اور انھیں ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ نہر سے آبپاشی کریں۔ لیکن جب لوگ اس کے عادی ہو گئے تو محکمہ نے ہر سال نئی نئی شاخیں بنانا شروع کر دیں تاکہ زیادہ رقبہ میں پانی پہنچا کر زیادہ رقم وصول کی جا سکے۔ لیکن اس رویہ کے مضر اثرات کا انھوں نے لحاظ نہیں کیا۔ ندیوں میں پانی محدود مقدار میں ہوتا ہے اور اس میں اضافہ کرنا افسروں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر آبپاشی کے رقبہ میں اضافہ ہو جائے تو پانی کی مقدار میں اسی تناسب سے کمی ہو جائے گی۔ کیا کوئی اس کی ذمہ داری لے سکتا ہے کہ پانی کی مقدار میں بہر صورت کوئی کمی نہ ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ندیوں میں کافی پانی نہیں ہوتا تو سارے کے سارے رقبے کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر جدید رقبہ کو محض زائد پانی دیا جاتا

تو اس توسیع پر کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن چونکہ یہ رقبہ بھی سارے نظام کا ایک مستقل جزو بن گیا ہے اس لئے پانی کی قلت کے زمانہ میں کسانوں کو اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے حکومت کے ماہرین کا قول ہے کہ نہروں کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر بارش نہ ہو تو فصلیں تباہ ہونے سے بچ جائیں اس لئے جتنے زیادہ سے زیادہ رقبہ کو پانی پہنچ سکے وہ بہتر ہے۔ لیکن وہ اس کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیتے کہ آیا فصل تیار کرنے کیلئے پانی کافی بھی ہے یا نہیں۔ اگر حکومت کا یہی نصب العین ہے تو گویا نہروں کا سارا نظام قحط کی مدافعت کا ایک بیمہ ہے اور اس سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں نہروں سے پانی لینے والی زمینوں پر حکومت کو مال گذاری بڑھا دینی چاہیئے لیکن آبپاشی وصول نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ حکومت آبپاشی کے علاوہ نہری علاقہ پر زاید مالگذاری بھی وصول کرتی ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد مالگذاری میں مستقل طور پر اضافہ کر دیتی ہے۔ اس طرح گویا کسان کو آبپاشی اور زاید مالگذاری دونوں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ حکومت کو آخر یہ دوہرا دوہرا مطالبہ وصول کرنے کا کیا حق ہے؟ ۔ اگر نہریں آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ہیں تو پھر یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ٹھیک وقت پر کافی پانی مہیا کرے۔ ایسی حالت میں اگر پانی کی قلت کی وجہ سے فصلیں خراب ہو جائیں تو انصافاً حکومت کو اس کا ہرجانہ ادا کرنا چاہیئے۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ چاہے فصل بالکل ہی تباہ ہو گئی ہو لیکن آبپاشی پھر بھی معاف نہیں کی جاتی اور نہ کسان ہی کو اتنی ہمت ہوتی ہے کہ افسروں سے اس قسم کی درخواست کر سکے۔ قانون کی رو سے نقصان کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لغو طریقہ کی وجہ سے کسان کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ بعض اوقات مہینہ میں صرف ایک بار پانی ملتا ہے گنے جیسی قیمتی فصل کو جب بعض دفعہ

مہینہ میں ایک بار بھی پانی نہیں ملتا تو وہ بالکل سوکھ جاتی ہے۔ اکثر گیہوں اور دوسری فصلوں کو صرف ایک مرتبہ پانی ملتا ہے لیکن ہر صورت میں مطالبہ وہی قایم رہتا ہے۔ سارے ملک میں ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں کسان کو عین وقت پر پانی نہ ملنے کی وجہ سے کسی نہ کسی صورت میں تکلیف نہ ہوتی ہو۔ بمبئی کے افسران چند قدم اور آگے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ کسان کو یہ طے کرنے کا حق ہی نہیں ہے کہ کھیت میں کس وقت پانی دینا چاہیئے۔ وہ فیصلہ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں کہ کس کھیت کو کس وقت پانی ملنا چاہیئے۔ کسان کے جائز حقوق میں یہ صریح دست اندازی ہے اس لئے نہایت لغو اور سخت قابل اعتراض حرکت ہے۔ البتہ حکومت کو اس وقت یہ حق ہو سکتا ہے جب وہ یہ ذمہ داری لے کہ اگر پیداوار ایک مقررہ معیار سے کم ہوگی تو وہ کسان کو ہرجانہ ادا کرے گی۔ لیکن جب تک کسان کو نقصان کے تمام نتائج خود برداشت کرنا ہوتے ہیں گورنمنٹ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نہر کے افسر زراعت کے ماہر نہیں ہوتے اور وہ تھوڑا بہت تجربہ اور معلومات حاصل کرنا بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں نہری علاقہ میں کسان بالکل بے بس ہوتا ہے۔ شرح آبپاشی مقرر کرنے کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ نہ اس معاملہ میں کسان کو کوئی دخل ہے محکمہ آبپاشی کا یہ بخل دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ پانی کی مقدار نصف کر دینے کے باوجود آبپاشی کے مطالبہ میں کمی نہیں کی جاتی۔ لیجسلیٹو کونسلوں میں بارہا یہ سوال اٹھایا گیا۔ لیکن لوگوں کی چیخ پکار کی کبھی پروانہ کی گئی۔ اور چونکہ یہ منتقلہ محکمہ نہیں ہے اس لئے حکومت کو اس سلسلہ میں مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پانی کے نکاس کا انتظام

اس سب کے علاوہ ریلوں اور نہروں کی وجہ سے ملک کے قدرتی پانی کے نکاس کو بہت نقصان پہونچا ہے ۱۹۲۲ء میں شمالی بنگال کا مشہور و معروف قحط ریل کی سڑک کے ذریعہ پانی رُک جانے ہی واقعہ ہوا تھا۔ اکثر دیہاتوں میں پانی رک جاتا ہے جس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگ کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ ہم نے ضلع میرٹھ کے مختلف مقامات میں جہاں لوگوں کو پانی کے رکنے کی وجہ سے سخت نقصان ہوتا ہے معلومات فراہم کیں تو ہمیں ریلوں اور نہروں سے نقصانات کا اندازہ کرکے سخت حیرت ہوئی۔ ملک کی قدرتی پانی کی نکاسی کا تعلق نہروں کے نظام سے ہے لیکن افسروں کو بار بار لکھنے کے باوجود ان نالیوں کو بھی درست رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ جو خود محکمہ انہار نے بنوائی تھیں۔ پھر بھلا پانی کے نکاس میں اصلاح کا تو ذکر ہی کیا۔؟ بعض دیہاتوں میں پانی کی سطح بھی بہت نیچی ہو گئی ہے اور اس سے بھی لوگوں کی صحت پر بہت خراب اثر پڑا ہے بعض دوسرے صوبوں۔ خصوصاً بمبئی میں تو نہروں کی وجہ سے بہت سے بڑے بڑے رقبے ناقابل کاشت ہو گئے ہیں۔

زرعی نصب العین

حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں کا ایک مستقل زرعی نصب العین ہونا چاہیئے اور تمام قوانین میں کسان کی بہبودی مدنظر ہونا چاہیئے۔ حکومت کی تمام کارگذاریاں آئندہ اس معیار سے جانچی جائیں گی کہ آیا ان سے کسان کی خوشحالی اور بہبودی میں مدد ملتی ہے یا نہیں اس لئے حکومت کو پبلک کے اعتراضات سننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور موجودہ رویہ قطعاً ترک کر دینا چاہیئے کہ چند بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ طرح طرح سے

مراعات کر کے ان سے موقع بے موقع بہ کاری افسروں کی حمایت کرائی جاتی ہے۔ یہ لوگ تو حکومت کی امداد اور مراعات کے مستحق نہیں ہیں کیوں کہ ان کے پاس تو کافی موجود ہے۔ البتہ غریب کسان کو اس کی ضرورت ہے جس پر شاذ ہی نظر کرم پڑتی ہے۔ دراصل سارے نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ افسروں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ کسان ان کی تنخواہ ادا کرتا ہے اس لئے اپنی قابلیت بھر اس کی خدمت کرنے کی کوشش کرنا چاہئے مانا کہ وہ سرکاری افسر ہیں لیکن بہرحال قوم کی خدمت کے لئے ملازم رکھے گئے ہیں۔ انھیں محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ نکتہ چینی سے بالاتر نہیں ہیں اس لئے معترض کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس کے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہیئے اور اس کے مشورے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

باب شتم

زراعت کی خصوصیات

عموماً لوگ زراعت کو بھی صنعت و حرفت کے عام اقتصادی اصولوں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جیسا تاجروں کے کمیشن نے بھی لکھا ہے یہ زبردست غلطی ہے۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں[۵۱] کہ "یہ ایک سخت مغالطہ ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو بالکل غلط مبحث ہو جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ زراعت میں بھی ایک تجارتی نوعیت ہے اور تجارتی اصول کو برتنا چاہیے لیکن بعض عجیب اور مخصوص حالات ایسے بھی ہیں کہ اگر انھیں نظر انداز کر دیا جائے تو کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے"۔ اسی خیال کا ایک دوسری جگہ بھی انھوں نے اظہار[۵۲] کیا ہے کہ "اگر زراعت کو بھی صنعت و حرفت کے مطابق بنایا جائے اور کامیابی و ناکامی کا اندازہ محض مادی نفع سے کیا جائے تو موجودہ نقطۂ نظر سے کسان بالکل تباہ ہو جائے گا"۔

ہم زراعت کی وہ خصوصیات بیان کرنا چاہتے ہیں جو صنعت و تجارت سے اس میں مختلف ہیں تاکہ ناظرین اس اہم مسئلہ کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکیں ذیل میں ہم نے جن خصوصیات

---

۵۱ ملاحظہ ہو صـ۶

۵۲ ملاحظہ ہو صـ۱۷

کا تذکرہ کیا ہے وہ بیشتر تاجروں کے کمیشن یا زرعی قرضہ کی رپورٹ سے بجنسہ نقل کی گئی ہیں۔ یہ اس خوبی اور صفائی سے سچ طور پر بیان کی گئی ہیں کہ ہم بلا تامل ان کے مفصل اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

(۱) کسان مالک اور مزدور دونوں ہے

کسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جو ایک ہی وقت میں مالک اور مزدور دونوں ہے مشترک مفاد کا یہ ایک ایسا معمہ[۱] ہے جس کے حل کرنے میں اقتصادیات کے ماہر اور قانون ساز مدبر دونوں ہمیشہ چکر میں رہتے ہیں۔

(۲) زراعت آفات کی تختہ مشق رہتی ہے

زراعت پر موسم۔ پالا۔ نباتاتی امراض۔ ٹڈی۔ کیڑے مکوڑے طوفان اور آگ وغیرہ کی عجیب وغریب اور زبردست ارضی وسماوی آفات آتی رہتی ہیں ممکن ہے سائنس کی آئندہ ترقیاں ان میں کچھ کمی کردیں اور منظم کوشش سے ان کے مضر ترین اثرات کم ہوجائیں لیکن یہ یقینی ہے کہ زراعت کو انسانی اختیار سے باہر اور نامعلوم قدرتی حوادث سے چھٹکارہ نہیں مل سکتا کیونکہ یہ تو اس کی نشوونما کی بنیاد ہیں۔

اس سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ قیمتوں کی تبدیلیوں سے بھی بنیادی طور پر زراعت کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ یہ زبردست قوت کے ساتھ اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ منظم

---

[۱] ملاحظہ ہو تاجروں کے کمیشن کی رپورٹ صـ۶

کوشش سے ان میں بھی کچھ کمی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ تمام کوششوں کے باوجود قدرتی حوادث بہرحال زراعت پر حاوی رہیں گے اس لئے ہمیشہ اسے غیر معمولی خطرے لاحق ہوتے رہا کریں گے [۵۱]۔

(۳) زراعت میں اجتماعی کاروبار نہیں ہو سکتا

اجتماعی کاروبار میں پیداوار وسیع پیمانہ پر ہوتی ہے۔ ایک ہی مقصد کیلئے بہت سے لوگ مشترک ہو جاتے ہیں اور اس مقصد کی تکمیل اور بہتری کے لئے اپنے ذاتی وسائل مجتمع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ نقصان میں جو ہر کاروبار کے ساتھ لازم ملزوم ہے سب شریک ہوتے ہیں۔ ان چیزوں سے کاروبار میں ایک اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی نامعلوم ملک میں کوئی مسافر جائے تو تنہا سفر کرنے کے بجائے کسی کے ساتھ چلنے میں اسے کامیابی کا زیادہ یقین ہوتا ہے [۵۲]

لیکن کسان کا دار مدار تنہا اپنے ذرائع اور اپنی کوششوں پر ہے اس لئے وہ ان برکتوں سے محروم رہتا ہے جو دوسرے تاجروں اور کاریگروں کو اجتماعی کاروبار سے حاصل ہوا کرتی ہیں۔ گویا زراعت ساری قوم کے سرمایہ سے متمتع نہیں ہو سکتی [۵۳]۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو صـ۱۴۵

۵۲ ملاحظہ ہو زراعتی قرضہ کی رپورٹ صـ۶

۵۳ ملاحظہ ہو زراعتی قرضہ کی رپورٹ صـ۷

(۴) کسان مستقبل کے سرمایہ کا اندازہ نہیں کرسکتا

اجتماعی صنعتوں کی طرح زراعت میں کسان نہ تو مستقبل کے سرمایہ کا اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ متوقع آمدنی پر قرض لے سکتا ہے۔ زراعت میں ان چیزوں کا تجارتی معیار مقرر نہیں ہے جس پر کوئی روپیہ لگانے والا اعتماد کرسکے اس لئے اہل حرفہ اور تاجر تو مشترک سرمایہ جمع کر لیتے ہیں لیکن کسان کو صرف قرض پر اکتفا کرنی پڑتی ہے [۵۱]۔

(۵) کسان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا خرچ کرتا ہے کیا کماتا ہے

قرض کا روپیہ لگانے کی حالت میں کسان کو دو چیزیں انتہائی صحت کے ساتھ معلوم ہونا چاہیئے۔ اول یہ کہ کیا خرچ ہوتا ہے دوسرے کیا حاصل ہوتا ہے۔

زراعت دنیا میں سب سے مشکل فن ہے۔ یہ ان آفات ارضی و سماوی کا شکار رہتی ہے جن سے اور دوسری صنعتیں آزاد ہیں۔ ان خطروں کی وجہ سے کسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ پہلے سے آمدنی کا کوئی اندازہ کرسکے۔ اس کے بجائے کسان کا تخمینہ سابقہ تجربہ پر منحصر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ تجربہ بھی اتنا طویل ہو کہ کمی بیشی کے امکانات باقی نہ رہیں یا بہت ہی کم ہو جائیں۔ پھر بھی اہل حرفہ یا دوسرے کاریگروں اور تاجروں کی طرح اس کا اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ البتہ کئی برسوں کے اخراجات سے قرض کا روپیہ لگانے کے نفع نقصان کا ایک اندازہ ضرور ہو جاتا ہے [۵۲]

---

۵۱ ملاحظہ ہو زراعتی قرضہ کی رپورٹ ص۸

۵۲ ملاحظہ ہو قرضہ کمیٹی کی رپورٹ ص۱۴

(۶) کسان ناموزوں وقت پر فروخت کرنے پر مجبور ہوتا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ مالی مشکلات کی وجہ سے اور لگان اور دوسری وقتی اخراجات کے لئے روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کسان مجبور ہوتا ہے کہ جلد از جلد اپنی پیداوار فروخت کر ڈالے۔ اس سلسلہ میں کافی شہادتیں موجود ہیں۔ بارہا کہا جا چکا ہے کہ کسان کے پاس چونکہ نقد روپیہ نہیں ہوتا اس لئے اپنی پیداوار سے اُسے جو کچھ بھی مل سکتا ہے وہ فوراً حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فروخت کرنے کے معاملہ میں وہ کچھ غور و تامل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنی ضرورت سے مجبور ہوتا ہے اور ان مجبوریوں کی وجہ سے اکثر و بیشتر اسے سخت نقصان اُٹھانا پڑتا ہے [۵۱]۔

بازار میں کسان کی آزادی عمل سلب ہو جاتی ہے۔ عموماً جس وقت خریدار چاہتا ہے اس وقت وہ بیچنے پر مجبور ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ خریدار ایسے ہی موقع کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اور کسان کے لئے کم سے کم موزوں ہو۔ زرعی مال کی قیمتوں کے غیر معمولی اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے اس سے منافع میں بہت کمی ہو جاتی ہے [۵۲]

(۷) کاشتکاری قومی خدمت ہے

زراعت محض روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں ہے یہ کوئی صنعت یا تجارت بھی نہیں ہے،

---

۵۱ ملاحظہ ہو قرضہ کمیٹی کی رپورٹ صہ ۱۴

۵۲ " " " صہ ۳۴

بلکہ ایک قومی خدمت ہے جو قومی مفاد کے ماتحت زمین کی نگرانی اور اس کے استعمال کے سلسلہ میں افراد انجام دیتے ہیں اس لئے کسان اپنے ذاتی منافع اور کسب معاش کے ساتھ ساتھ قومی اساس حیات کا امین بھی ہے۔ زراعت میں بلاشک و شبہہ قومی مفاد مضمر ہے اور یہ قومی حکمت عملی کا معاملہ ہے اس لئے نہ صرف اس کے قدرتی اور انسانی سرمایہ کا تحفظ کرنا چاہیئے بلکہ قومی تحفظ کا انتظام کرنا چاہیئے۔ عام خوشحالی میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ اور سماجی اور سیاسی استحکام کی تدبیریں کرنا چاہیئے[۵۱]

یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ اگر قومی مفاد کی خاطر کسان کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ اپنے کام میں انتہائی ترقی کی کوشش کرے تو پھر قوم کا بھی فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی حکومت کی معرفت یا دیگر ذرائع سے اس کے تحفظ کی صورتیں پیدا کرے[۵۲]۔

(۸) جب قیمتیں گھٹتی ہیں تو کسان کو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے اور جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو بہت تھوڑا نفع ہوتا ہے

کھیت کی قیمتوں اور بازار کی قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ دراصل مزدوری کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ قیمتوں کے عام اتار چڑھاؤ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح زراعتی پیداوار سے مختلف چیزیں تیار کرنے اور اسے ایک جگہ سے

---

۵۱ ملاحظہ ہو تاجروں کے کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۲۰

۵۲ " " " " صفحہ ۱۵

دوسری جگہ منتقل کرنے کے اخراجات بھی مستقل ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسان کو جو قیمت ملتی ہے اس کو آخری خریدار کی ادا کی ہوئی قیمت سے کوئی نسبت نہیں ہوتی بالفاظ دیگر قیمتوں کی بحالی کے زمانہ میں کسان کو درمیانی لوگوں کے مقابلہ میں نفع ہوتا ہے اور قیمتیں گرنے کے زمانہ میں درمیانی لوگوں کو کسان کے مقابلہ میں نفع ہوتا ہے۔

(۹) کسان کساد بازاری کی مدافعت نہیں کرسکتا

جب سکہ کی مقدار گھٹتی ہے تو زراعت کساد بازاری کی مدافعت نہیں کرسکتی کسانوں میں نسبتاً کوئی تنظیم نہیں ہوتی۔ پیداوار منتشر علاقوں سے جمع کی جاتی ہے اور کسان سے بہت دور منڈیوں میں جس قیمت پر بھی اٹھتی ہے تھوک فروخت کردی جاتی ہے۔ کسان کو عارضی طور پر بھی ان قیمتوں کے نامنظور کرنے کا موقع نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ زراعتی پیداوار کی قیمت اگر گر جائے تو پھر اسے بحال کرنے میں سخت جدوجہد کرنا پڑتی ہے [۵]۔

(۱۰) اصلاح کسان کے مزید نقصان کا باعث ہوتی ہے اور نااہلوں کو زراعت سے خارج نہیں کیا جاسکتا

یہ صحیح ہے کہ اخراجات میں تخفیف کرنے کی غرض سے زراعت میں اصلاح کرنا

---

[۵] ملاحظہ ہو تاجروں کے کمیشن کی رپورٹ صـ۔

قوم کے لئے مفید ہوتا ہے لیکن جب تک کاشتکاروں کی تعداد میں کچھ کمی نہ کی جائے یا بازار میں وسعت نہ پیدا کی جائے اصلاح سے زراعت کی حالت بدتر ہو جاتی ہے۔

اہل صنعت مانگ کی نسبت سے کاریگروں کی تعداد میں بڑی آسانی سے کمی کر سکتے ہیں اس لئے جہاں انھوں نے دیکھا کہ قیمتیں گر رہی ہیں فوراً وہ اپنے اخراجات کم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اسی میں ان کی نجات ہے۔ کسان ایسا نہیں کر سکتا اس کے انفرادی اخراجات میں کوئی معقول کمی نہیں ہو سکتی اس لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ پیداوار میں اضافہ کرے۔ البتہ وہ عمل زراعت میں غیر ضروری بربادی کو روک سکتا ہے۔ مثلاً بے احتیاطی سے مشینوں اور اوزاروں کو خراب ہونے دے یا مویشیوں کی خوراک میں بے ترتیبی کی روک تھام کرے۔ لیکن پھر بھی زراعت کوئی مشین کا عمل تو ہے نہیں بلکہ بنیادی طور پر ذی حیات اجسام کے نشوونما پر منحصر ہے اور اس میں ایک مقررہ وقت بہرصورت درکار ہوتا ہے۔ اس لئے اخراجات میں تخفیف صرف پیداوار میں اضافہ کر کے ہو سکتی ہے نہ کہ وقت میں تخفیف کر کے۔ اب اگر کسان اوسط پیداوار فی ایکڑ میں اضافہ کرے تو غالباً قیمتیں اور گر جائیں گی۔ اور اگر وہ اوسط پیداوار فی شخص میں اضافہ کرے تو ممکن ہے کہ قیمتیں اتنی نہ گریں لیکن بہت سے کاشتکار بیکار ہو جائیں گے پھر اگر مانگ نہ بڑھے تو جب تک ان کسانوں کو خارج نہ کیا جائے خوشحالی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی صورت اوسط پیداوار فی ایکڑ کے اضافہ کرنے میں بھی ہے بلکہ اس وقت تو رقبہ بھی کم کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں جب تک مانگ میں اضافہ نہ ہو کام کرنے والوں کی تعداد میں کمی کرنا لازمی ہے۔ زراعت میں اتنی آہستہ آہستہ ترمیم ہو سکتی ہے کہ اگر پیداوار میں اضافہ کر کے اخراجات میں کمی کی جائے تو حالت

بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔

گویا پیداوار کی مقدار میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ۔ مانگ میں اضافہ کرنا چاہیئے یا نااہل کاشتکاروں کو خارج کرنا چاہیئے ورنہ اس کا امکان ہے کہ یہ اصلاحی کوششیں کسان کے لئے اور زیادہ تباہ کن ثابت ہوں۔

زراعت میں نااہل کاشتکار ہمیشہ ہمیشہ رہ سکتا ہے کیونکہ اس میں بڑی صنعتوں کے مقابلہ میں نقد لاگت کم اور مجموعی آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ قیمتوں کے معاملہ میں مزدوری کو بہت بڑا دخل ہے لیکن زراعت میں کوئی مزدوری مقررہ نہیں ہوتی انہی وجوہ کی بنا پر زراعت میں نااہل لوگ بھر جاتے ہیں۔ ان کی کارگذاری بھی اچھی نہیں ہوتی اور انھیں معاوضہ بھی کم ملتا ہے گویا ان کی موجودگی کی وجہ سے قیمتیں کم رہتی ہیں اور اہل لوگوں کے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی اہلیت کے مطابق معاوضہ حاصل کر سکیں۔

علاوہ ازیں زراعت کے جدید ترقی یافتہ ذرائع کے مقابلہ سے بھی کسان تباہ ہو سکتے ہیں لیکن تجارت کے عام اصول کے برعکس کسان ابتک فنا نہیں ہوئے ہیں بلکہ کسی نہ کسی طرح کشمکش حیات جاری رکھے ہوئے ہیں[۵۱]۔

(۱۱) زراعت میں ترمیم آہستہ آہستہ ہو سکتی ہے

کاشتکاری میں تمام مشکلات کی جڑ یہ ہے کہ اقتصادی حالات سے مطابقت نہایت آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ تمام دوسری صنعت۔ تجارت اور ملی مسائل کے

---

۵۱ ملاحظہ ہو تاجروں کے کمیشن کی رپورٹ صہ ۸

مقابلہ میں اپنے آپ کو نئے اقتصادی حالات کے مطابق بنانے میں یہ نہایت سست رو ہے اور اس میں لچک بہت کم ہے۔ خواہ نئی قیمتوں کا اتباع کرنا ہو یا قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا معاملہ ہو۔ یا بازار کی مانگ کی تبدیلیاں ہوں۔ یا پیداوار کے نئے طریقوں کا اختیار کرنا ہو یا نئے قسم کی تنظیم کرنا ہو۔ ہر صورت میں زراعت کو نسبتاً طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔

اس خصوصیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ زراعت قدرتی اسباب پر منحصر ہے جس میں کافی وقت لگتا ہے اور یہ عرصہ کسی طرح کم بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ صنعتی اشیاء مسلسل کام کر کے چند گھنٹے یا چند دن اور شاذ و نادر چند ہفتوں میں تیار ہو سکتی ہیں اور اگر تیاری کے ذرائع میں مزید اصلاح کر لی جائے تو بیشتر صنعتوں میں بڑی حد تک وقت کم بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن زرعی اشیاء کم و بیش مقررہ اور نسبتاً طویل عرصہ میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً گیہوں خزاں میں بویا جاتا ہے اور جون سے پہلے تیار نہیں ہوتا۔ یہی حال دوسری فصلوں کا بھی ہے۔ اسی طرح مویشیوں کو بھی بیشتر اس سے کہ وہ فروخت کئے جانے کے قابل ہو سکیں یا ان سے کوئی آمدنی ہو سکے کافی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زراعت میں جو سرمایہ لگایا جاتا ہے اس کا معاوضہ بہت عرصہ میں یعنی تقریباً سات سال میں ایک مرتبہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری صنعتوں اور تجارتوں کے مقابلہ میں زراعت ہر تبدیلی کو بہت آہستہ آہستہ قبول کرتی ہے۔ کیونکہ تمام دوسری صنعتوں اور تجارتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد آسانی سے کم و بیش کی جا سکتی ہے۔ ان کا سرمایہ ایک جگہ رکا نہیں رہتا ہے اور معاوضہ جلد ملتا ہے۔

(۱۲) زراعت کے کافی بالذات ہونے کی وجہ سے نااہل لوگ اسمیں موجود رہتے ہیں

اتنی ہی اہم یہ چیز ہے کہ زراعت میں مختلف تبدیلیوں کے مقابلہ کرنیکی خاص قوت ہے خواہ یہ تبدیلیاں عام اقتصادی حالات ہی سے کیوں نہ پیدا ہوئی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کسان اپنی جگہ پر کافی بالذات ہوتا ہے اور زراعت کو تجارتی اصول پر چلانے کے باوجود اس کی یہ خصوصیت قایم رہتی ہے کسان کو ہمیشہ یہ اطمینان رہتا ہے کہ کم از کم اس کی اور اس کے خاندان کی ضروریات کے لائق ضرور پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اقتصادی حالات سے بے نیاز رہتا ہے اور عرصہ تک ان کی پروا نہیں کرتا۔ اس معاملہ میں کسان اور اہل حرفہ میں بنیادی فرق ہے۔ اگر کسی صنعت میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ بڑھ گئی ہے اور قیمتیں گر گئی ہیں یا مزدوری اور بازار کے نئے حالات کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرنے کی ضرورت ہے تو اس میں فوراً ترمیم و تنسیخ ہو سکتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ بڑھ جانے کی صورت میں مزدوروں کا کم کر دینا یا مشین کا بالکل بند کر دینا آسانی سے ممکن ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر جو لوگ مقابلہ میں کمزور پڑتے ہیں خود بخود مستقلاً خارج ہو جاتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ خام پیداوار کی قیمتوں اور مزدوری وغیرہ پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اگر ان کے مال کی اتنی قیمت بھی نہ اٹھے کہ اخراجات نکل سکیں تو انھیں خود بخود کاروبار بند کرنا پڑتا ہے اور اگر وہ اس میں تامل کریں تو فوراً دیوالہ نکل جاتا ہے اور وہ کام بند کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر ان خارج شدہ مزدوروں کی اس صنعت میں جس میں وہ اب تک لگے ہوئے تھے گنجائش نہیں نکلتی اور مجبوراً انھیں وہ صنعتیں اختیار کرنا پڑتی ہیں جن میں مانگ بڑھ

گئی ہو یا جو نسبتاً کم ترقی یافتہ ہوں۔ لیکن اگر انھیں کوئی روزگار نہ بھی ملے پھر بھی کم از کم یہ تو نہیں ہوتا کہ ان کی وجہ سے مال کی قیمت اور گرتی چلی جائے۔ جن صنعتی کارخانوں کے پاس روپیہ کافی ہوتا ہے وہ بعض اوقات نقصان پر بھی کچھ عرصہ تک مال تیار کرتے رہتے ہیں۔ اس امید میں کہ بازار کی حالت شاید سنبھل جائے اور اس وقت انکو اپنا سارا نظام مکمل مل جائے۔ لیکن یہ حالت عرصہ تک جاری نہیں رہ سکتی۔

لیکن زراعت ہی ایک ایسا کاروبار ہے جو ایک فرد یا ایک خاندان پر چلتا ہے اس لئے اس میں ترمیم و تنسیخ بڑی مشکل سے ہو سکتی ہے۔ کسان کے پاس عموماً مزدور تو ہوتے نہیں جنھیں وہ علیحدہ کر دے۔ گویا مزدوری پر اس کا نقد سرمایہ بہت کم لگتا ہے اسی طرح خام چیزوں پر بھی اسے زیادہ خرچ کرنا نہیں پڑتا ہے۔ اس لئے قیمتیں گر جانے پر بھی وہ نسبتاً زیادہ عرصہ تک اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے اور قیمتوں کی کمی کی تلافی کرنے کے لئے وہ اکثر پیداوار میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی خوراک خود پیدا کرتا ہے اس لئے ہمیشہ اپنی ضروریات کی طرف سے مطمئن رہتا ہے۔ لیکن وہ اپنا مکان اور اپنا گاؤں چھوڑے بغیر زراعت ترک نہیں کر سکتا ہے۔ حالانکہ ایک کاریگر کو اپنا پیشہ تبدیل کرنے میں ترک سکونت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں گاؤں کے رہنے والے کسان کو دوسری چیزوں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے شہر کا مزدور آج کل اکثر ایک پیشہ چھوڑ کر دوسرا اختیار کرتا رہتا ہے جن کی نوعیت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ اگر کساد بازاری کے زمانہ میں کسان زراعت ترک کرے تو اسے اپنی لگائی ہوئی رقم میں بھی سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ اس کساد بازاری سے زمین کی قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔

(۱۳) مانگ اور رسد کا عدم توازن

زراعت کی سب سے زیادہ اہم مشکلات یہ ہیں کہ مانگ اور رسد میں توازن نہیں ہوتا۔ معاوضہ بہت کم ملتا ہے اور تنظیم کے معاملہ میں محتاجی بڑھتی جارہی ہے گذشتہ نصف صدی میں تنظیم اور اجتماعی عمل کے معاملہ میں غیر زرعی صنعتوں نے بہت ترقی کی ہے لیکن زراعت پر نسبتاً اس کا بہت کم اثر ہوا ہے۔ سکہ کی کمی کے زمانہ میں زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں قوت مقابلہ بہت کم ہوتی ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ کسان پیداوار بند کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور دوسری جانب منظم مزدور اپنی مزدوری کی کمی کا مقابلہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ خاص اجناس پیدا کرنے والا کسان انفرادی طور پر خرید و فروخت کرتا ہے۔ دوسری طرف اجتماعی کاروبار ہے۔ اگرچہ مقابلہ اتنا کافی ہے کہ ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا لیکن پھر بھی اجتماعی کاروبار میں جو فائدے ہیں وہ انفرادی کاروبار میں نہیں ہوسکتے۔

(۱۴) کسان چھوٹے پیمانہ پر کاروبار کرتا ہے

چھوٹے پیمانہ کے کاروبار میں کسان کو بہت سی وہ چیزیں حاصل نہیں ہوسکتیں جو بڑے پیمانے کے کاروبار میں حاصل ہوسکتی ہیں۔ مثلاً جو شخص اپنے دست و بازو سے محنت کرتا ہے وہ اس کا معمولی سے معمولی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ واقعی کیا لاگت آئی۔ اور لاگت نہ معلوم ہونا مقابلہ کی حالت میں تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کسان کافی تجربے نہیں کرسکتا۔ چھوٹے سے چھوٹے رقبے میں بھی زمینیں اتنی

مختلف قسم کی ہوتی ہیں کہ جو صورت ایک کھیت میں مفید ہو وہ دوسرے میں بالکل بے کار ہو سکتی ہے۔

(۱۵) زراعت میں اشتراک عمل کی کمی ہے

اب تک تجارت کی طرح زراعت میں کوئی اشتراک عمل نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسان کے مقابلہ میں خریدار بازار کی حالت سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ مانگ اور رسد کے توازن کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے بجز قیمتوں کے آہستہ آہستہ بدلنے کے۔ انفرادی طور پر بیشمار چھوٹے چھوٹے کسان ملک کے طول و عرض میں اپنا اپنا کاروبار کرتے ہیں اسلئے ان کا اشتراک عمل سخت مشکل ہے اور مختلف قسم کے کاشتکاروں کا مختلف اور اکثر متضاد مفاد ہوتا ہے۔

(۱۶) کسان کی مختلف حیثیتیں

کسان مختلف حیثیتوں میں کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صورت کسی دوسری تجارت میں نہیں ہے۔ وہی جنس پیدا بھی کرتا ہے اور وہی فروخت بھی کرتا ہے وہی روپیہ بھی لگاتا ہے اور وہی محنت بھی کرتا ہے۔ دوسرے تمام کاروبار میں ان مختلف حیثیتوں میں امتیاز کیا جاتا ہے معقول پیداوار کے لئے اعلیٰ درجہ کی ہوشیاری اور معلومات کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ توقع کرنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ ایک کسان اچھا دلال۔ بازار کی حالت کا واقف کار اور مالیات کا ماہر بھی ہوگا۔ کسان کی مشکلات کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ یہ تمام کام بہ یک وقت انجام نہیں دے سکتا۔

زراعت کے وہ شعبے جن میں منڈی کے انتظام پر موزوں اشخاص اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہیں نسبتاً زیادہ خوش حال ہیں۔ لیکن کسان عام طور پر ہر فن مولا ہے اور یہ چیز اس کے لئے سخت مضر ہے [۵۱]۔

(۱۷) ترقی کی رغبت نہیں ہے

اہل حرفہ میں ایک دوسرے سے مقابلہ رہتا ہے اور کمزور کو میدان سے ہٹنا پڑتا ہے اس وجہ سے ہر ایک اپنی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن کسان کو ہمیشہ یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ جتنی ہی اصلاح کرے حالت اتنی ہی بدتر ہوتی جاتی ہے۔ زراعت میں بہتر پیداوار کے ذریعہ سے قیمتوں میں کمی کرنا زیادہ تر طریقہ اصلاح پر منحصر ہے۔ مثلاً اصلاح کرنے والوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی نفع کم ہو جائے گا تاوقتکہ پیداوار کے اضافہ کے ساتھ ساتھ مانگ میں بھی اضافہ نہو یا کسانوں کی تعداد میں کمی نہ کی جائے۔ اگر وسیع پیمانہ پر زراعت میں اصلاح کی جائے تو کسان کو مزید نفع ہونے کے بجائے اصلاح سے پہلے جو منافع ہوتا تھا وہ بھی جاتا رہے گا اور اس اصلاح کا سارا فائدہ خریدار کو پہنچے گا۔ مانا کہ اصلاح و ترقی ہر فرد پر فرض ہے اور جو لوگ اس میں پیش قدمی کریں گے وہ ایک حد تک خوشحال بھی ہو جائیں گے لیکن وسیع پیمانہ پر اصلاح کرنے سے ایک عرصہ تک نفع کے بجائے نقصان ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ زراعت میں وسیع اور منظم طریقہ پر اصلاح بہت کم ہوتی ہے [۵۲]۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو تاجروں کے کمیشن کی رپورٹ صـ۱۷

۵۲ " " " " صـ۱۲۱

(۱۸) جتنا زیادہ پیدا ہوتا ہے اتنی ہی کم آمدنی ہوتی ہے

جب قیمتیں گرتی ہیں تو کسان پیداوار محدود کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کرتا ہے تاکہ زیادہ مقدار میں فروخت کرکے اس کی تلافی کرسکے لیکن حالت اور خراب ہوجاتی ہے۔

سکہ کی کمی کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ کسان پر بالائی اخراجات کا بار غیر تناسب طور پر بڑھ جاتا ہے۔ زراعت میں جو سرمایہ لگایا جاتا ہے اس کا معاوضہ سات برس میں ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں ملتا لیکن مقررہ اخراجات بدستور رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب سرد بازاری ہوتی ہے تو ان کا بار ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ ان بالائی اخراجات کو پورا کرنے کیلئے اسے اتنے ہی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے جتنی پہلے ہوتی تھی لیکن قیمتوں کے گرجانے کی وجہ سے اس کی آمدنی میں کمی ہوجاتی ہے۔

(۱۹) اہل حرفہ اور کسان کا مقابلہ

اہل حرفہ نسبتاً زیادہ آسانی سے اپنے کاریگروں میں تخفیف کرسکتے ہیں۔ نئی مشنری رائج کرسکتے ہیں۔ ایک چیز کے بجائے دوسری چیز تیار کرسکتے ہیں اور قیمتوں میں کمی کرسکتے ہیں۔ صنعت وحرفت میں اجتماعی نظام ہے۔ تجارتی اشتراک عمل ہے پیشہ ورانہ انتظام ہے۔ علاوہ ازیں جاری سرمایہ کی افراط ہے اور قیمتیں عموماً اس مدت کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہیں۔ جو تیاری اور فروختگی میں صرف ہوتی ہے۔ ان تمام

باتوں کی وجہ سے صنعت و حرفت آسانی سے اپنے آپ کو تبدیل شدہ حالات کے مطابق بنا سکتی ہے زاید کارگیروں کو جلد خارج کر سکتی ہے اور نئی کوششوں کو فوراً ترک کر سکتی ہے بخلاف اس کے زراعت میں بیشمار کھیت دور دور منتشر ہوتے ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس میں اجرت پانے والے مزدور بہت کم ہوتے ہیں اور بیشتر مالک خود کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ اس میں بہت زیادہ سرمایہ رُکا رہتا ہے اور بہت دیر میں اس کا معاوضہ ملتا ہے۔ اس میں تجارت اور صنعت ایک خانگی حیثیت اور طرز زندگی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ (اجتماعی نظام مفقود ہوتا ہے۔ پیداوار جلد خراب ہو سکتی ہے۔ قدرتی اثرات اس پر حاوی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مقررہ مدت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے اس میں ترمیم و تنسیخ مشکل اور دیر طلب ہوتی ہے۔
صنعت و حرفت میں آسانی سے جو ترمیم ہو سکتی ہے اس کا سبب محض یہ نہیں ہے کہ اہل حرفہ کچھ زیادہ قابل ہوتے ہیں یا ان کا نظام بہتر ہوتا ہے بلکہ ان دونوں پیشوں پر جو حالات اثر انداز ہوتے ہیں ان میں بنیادی فرق ہے جن کی وجہ سے دونوں کی حیثیتیں بالکل مختلف ہو جاتی ہیں۔ یہ حالات گویا قانون قدرت کے مترادف ہوتے ہیں کیونکہ نہ تو کسان کا اور نہ اہل حرفہ کا ان پر کوئی قابو چلتا ہے۔

(۲۰) زراعت اب کافی بالذات پیشہ نہیں رہا

چونکہ اب کسان اپنی پیداوار کے تبادلہ کا زیادہ محتاج ہے اور اس کی کافی بالذات حیثیت میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے مانگ اور رسد کے عدم توازن۔ زمین کی قوت نمو کے زوال اور زراعت کے منافع کی کمی کا زیادہ خراب اثر پڑتا ہے۔ پہلے

کسان اپنی پیداوار بیشتر خود ہی استعمال کرتا تھا لیکن اب دوسری صنعتوں کی طرح زراعت میں بھی بازار کی تلاش رہتی ہے۔ امریکہ میں ۱۸۲۰ء میں برسرکار لوگوں میں ۷۶ فیصدی کاشتکار تھے۔ پہلے زیادہ تر کھیت کافی بالذات اصول پر کاشت کئے جاتے تھے۔ کسان اپنا زیادہ وقت کھیتوں کو صاف کرنے اور کھاد وغیرہ دے کر انھیں تیار کرنے میں صرف کرتا تھا۔ باقی وقت میں وہ کاشت کرتا تھا اور اپنے خانگی استعمال کے لئے اناج پیدا کرتا تھا اسے بیرونی عدم توازن سے کوئی واسطہ نہ تھا جو آج بیشمار چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن گذشتہ صدی میں رفتہ رفتہ کھیتوں کی کافی بالذات حیثیت فنا ہوگئی۔ بہت سی چیزیں جو پہلے دیہاتوں میں تیار ہوتی تھیں اب شہر کے کارخانوں میں بننے لگیں اور کسان کے پاس صرف زرعی کام رہ گیا۔ اس کے علاوہ زمین کی صفائی اور ترقی کا کام قریب قریب ختم ہوگیا اس لئے کسان کو اور موقع ملا کہ وہ بازار کے لئے فصلیں تیار کرنے پر زیادہ توجہ دے۔ پھر جانوروں کے بجائے مشینوں کے استعمال سے کھیت کی کافی بالذات حیثیت میں اور کمی ہوگئی اور وہ نقد روپیہ کے لئے فصلیں پیدا کرنے پر مجبور ہوگیا۔

زراعت کی موجودہ مشکلات کا خاص سبب یہی ہے کہ اس نے کافی بالذات کے بجائے تجارتی حیثیت اختیار کرلی۔ اور اسی کی وجہ سے طلب اور رسد کے حالات میں بنیادی تبدیلی ہوگئی۔ جبتک ملک کی بیشتر آبادی کسانوں پر مشتمل تھی جو اپنے کھیتوں کی پیداوار کی وجہ سے خوراک سے مستغنی تھے تو اس کا بازار میں فروخت کرنا۔ اس کی قیمتیں اور دوسری جنس کی مناسبت سے اس کی قوت خرید کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ لیکن اب تجارتی حیثیت اختیار کرلینے سے رقبہ زیر کاشت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

قیمتوں میں قیام نہیں رہا ہے اور ان کے اتار چڑھاؤ کا بڑا خراب اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اب اور بھی ضرورت ہے کہ رقبہ زیر کاشت کم کیا جائے طرح طرح کی چیزیں کاشت کرکے زمین کی قوت نمو کو محفوظ کیا جائے۔ کسانوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ منافع فی کسان میں اضافہ کیا جائے قیمتوں میں زیادہ استقلال پیدا کیا جائے اور بہتر نظام قایم کیا جائے۔

(۲۱) کافی بالذات زراعت کا اثر قیمتوں پر بہت کم ہوتا ہے

کافی بالذات حیثیت میں قیمتوں میں بہت اتار چڑھاؤ نہ ہوتا تھا کیونکہ طلب رسد کا توازن آسانی سے ہوسکتا تھا۔ پہلے اگر کبھی فصل اچھی ہونے کی وجہ سے پیداوار زیادہ ہوجاتی تھی تو کسان اپنے خرچ میں اسی حساب سے اضافہ کرلیتا تھا اور اپنے کام میں زیادہ لے آتا تھا اس وجہ سے بازار کی قیمت گرنے نہیں پاتی تھی۔ اسی طرح جب فصلیں خراب ہوجاتی تھیں اور پیداوار کم ہوجانے کی وجہ سے قیمتیں کچھ بڑھ جاتی تھیں تو کسان اپنے خرچ میں اتنی ہی کمی کرلیتا تھا اور قیمتوں کو زیادہ بڑھنے نہ دیتا تھا دونوں صورتوں میں آج کل کی طرح کسان پر قیمتوں کی تبدیلی کا اثر نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ بہت کم پیداوار فروخت کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ موسمی حالات جو خصوصیت سے کسی فصل کے لئے موزوں اور کسی کے لئے ناموزوں ہوتے ہیں آج کل پورے کے پورے علاقوں کے لئے زبردست اہمیت رکھتے ہیں لیکن جب مختلف قسم کی چیزیں کاشت کی جاتی تھیں تو ان کی خاص اہمیت نہ تھی۔ ایسے علاقوں میں بھی اب کاشت شروع کردی گئی ہے جہاں بارش کم ہوتی ہے یا آبپاشی کا معقول انتظام نہیں ہے۔

اس وجہ سے بھی پیداوار میں کمی بیشی اور قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ قیمتوں میں زبردست مدوجزر ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کبھی خوب نفع ہوتا ہے تو کبھی بھاری نقصان [1]۔

(۲۲) زراعت میں بیمہ ممکن نہیں ہے

علاوہ ازیں زراعت میں دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں خطرات وحوادث کا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا اس لئے دوسری مستحکم صنعتوں کے مقابلہ میں زراعت نقصان میں رہتی ہے۔

موسمی حوادث کے لئے بیمہ بھی مشکل ہوتا ہے چونکہ زراعت میں ہر وقت خطرے لاحق رہتے ہیں اس لئے بیمہ کی فیس اتنی زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے کہ ناقابل برداشت ہوتی ہے [2]۔

(۲۳) زراعت میں قابل لوگوں کیلئے کوئی کشش نہیں ہے

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ وہی قوم یا طبقہ ترقی کر سکتا ہے جس میں بہترین دماغ موجود ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے نہ صرف اس ملک میں بلکہ دنیا کے تمام ممالک میں زراعت کے لئے قابل شخصوں کی خدمات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ وہ کاروبار جس میں عیش وعشرت

---

[1] ملاحظہ ہو تاجروں کے کمیشن کی رپورٹ صـ۱۱۰

[2] ملاحظہ ہو زراعتی قرضہ کی رپورٹ صـ۳۶

کی زندگی بسر کرنے کا کوئی امکان نہو۔ جس میں تعلیم یافتہ لوگوں کی کوئی صحبت میسر نہو اور جس میں اگرچہ پہلے کبھی آزاد زندگی بسر کرنے کا موقع تھا لیکن اب اس کی کامیابی اور ناکامی بیرونی اثرات پر منحصر ہو۔ بھلا کیا امید ہو سکتی ہے کہ اس میں قابل آدمی شامل ہوں گے نتیجہ یہ ہے کہ ہر ملک میں قابل لوگ اس فن کو چھوڑ چھوڑ کر دوسرے پیشے اختیار کرتے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں روزگار کے تمام دوسرے دروازے بند ہو جانے کی وجہ سے اگرچہ زرعی آبادی برابر بڑھ رہی ہے لیکن ہر تعلیم یافتہ اور ہوشیار شخص دیہات سے ترک سکونت کر کے شہر میں جا بستا ہے اور زراعت کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز بروز یہ فن ناقابل سے ناقابل شخصوں کے ہاتھ میں منتقل ہو رہا ہے۔

حصّہ چہارم

علاج

باب اوّل

بالواسطہ علاج

زراعت فصل پیدا کر کے روپیہ کمانے کا نام نہیں ہے نہ یہ محض صنعت یا تجارت ہے بلکہ یہ ایک فرض اور خدمت ہے جو افراد کے ہاتھوں قوم کے فائدے کے لئے زمین کی نگہداشت کی شکل میں سرانجام پاتی ہے۔ کسان جب ضروریات زندگی کو پورا کرنیکی یا ذاتی منافع حاصل کرنیکی غرض سے کھیتی کرتا ہے تو اس کی حیثیت قومی زندگی کے بنیادی سرمایہ کے محافظ کی ہوتی ہے چنانچہ زراعت صاف اور بے لوث قومی مفاد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے اور اسکی حیثیت اتنی ہی اہم ہے جتنی دوسرے امور عامّہ کی اور اس کے لئے بھی سوچی سمجھی اور دُور رس قومی حکمت عملی کی ضرورت ہے نہ صرف اس لئے کہ اس سے جو انسانی اور فطری وسائل وابستہ ہیں ان کی حفاظت ہو بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے ذریعے سے قومی طمانیت حاصل ہو، مجموعی خوشحالی میں اضافہ ہو اور معاشرتی

اور سیاسی قابلیت پیدا ہو"

(تاجروں کا کمیشن صفحہ ۲۰)

رُوس کی پنج سالہ سکیم

ممالک متحدہ امریکہ کے ایک مشہور و معروف کمیشن کے یہ نہایت وقیع الفاظ ہیں اور دنیا کے ہر ملک پر صادق آتے ہیں یعنی ہر قوم اور ہر حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ کاشتکار کے بقا اور تحفظ کی کوشش کرے محض تھپکیوں یا شاندار الفاظ اور شیریں کلامی سے بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ تقریر یا پروپیگنڈے سے کسی خاص مقصد کے لئے ایک نیا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عوام کی حقیقی شکایت جو انکی روزانہ زندگی سے متعلق ہو آسانی سے دبائی نہیں جا سکتی۔ مذکورہ بالا کمیٹی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "شکر لپٹی ہوئی سیاسی گولیاں اس کہنہ مرض کا صحیح علاج نہیں ہیں" ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے اکثر مصنفین نے کسان کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسا پروگرام پیش کریں جس سے کسان کی حالت بہتر ہو سکے۔ لہٰذا ان دو ابواب میں ہم چند خاص خاص علاج تجویز کریں گے۔ امید ہے کہ ان سے موجودہ تباہ حالی کا انسداد ہو سکے گا۔

سوویٹ روس نے اپنی قوم کی بہبودی کے لئے ایک پروگرام تجویز کیا تھا ہم اس کی تائید یا تردید میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس کسی نے

روس کے گذشتہ چند سال کے حالات کا مطالعہ کیا۔ ایک چیز سے وہ ضرور متاثر ہوا ہے روسی قوم کا بس ایک مرتبہ یہ طے کرنا تھا کہ پنج سالہ اسکیم شروع کی جائے۔ کہ ہر مرد و زن اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے حکومت کے دوش بدوش کھڑا ہو گیا۔ ساری قوم نے اپنی پوری قوت اس طرف لگا دی اور ہر فرد نے اس کی کامیابی کے لئے اپنی استعداد و حیثیت کے مطابق کوشش کی جس سے حیرت انگیز نتائج رونما ہوئے۔ دنیا کے بڑے بڑے مدبر ابتدا میں اس کا مضحکہ اڑاتے تھے اور پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ اس عظیم الشان پروگرام کی تکمیل میں روسیوں کو پورے پانچ سال بھی نہ لگے بلکہ صرف چار سال کے اندر ہی اندر انھوں نے اسے پورا کر لیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ساری قوم کے پیش نظر بس ایک ہی مقصد تھا۔ اور اس کے حصول کے لئے انھوں نے انتہائی خلوص اور عقیدت سے کوشش کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے کے لئے سب سے ضروری چیز خود اس قوم کا پختہ ارادہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر قوم ترقی کے کسی مقررہ پروگرام پر عمل شروع کر دے تو کمزوریوں رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود خوشحالی کا دور ایک نہ ایک دن ضرور شروع ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ روس کی حکومت نے بھی لوگوں کا ساتھ دیا اور منزل مقصود تک پہنچنے کی مخلصانہ پوری کوشش کی لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں صورت حالات بالکل مختلف ہے یہاں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ حکومت ایسی کسی اسکیم میں نہ صرف امداد کرنے سے گریز کرے گی بلکہ روڑے اٹکائے گی۔ لیکن اس احساس کے باوجود ہمیں کامل یقین ہے کہ اگر قوم پوری سرگرمی سے کام شروع کر دے تو حکومت

کو اشتراک عمل کرنا پڑے گا۔ اگر ابتدا میں وہ اس کے لئے تیار نہ بھی ہو تب بھی ۳۵ کروڑ افراد کا تہیہ بالآخر اسے رائے عامہ کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیگا ترقی کی بڑھتی ہوئی موجوں کو حکومت کا بخل اور رجعت پسندی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں روک سکتی۔ لیکن اس اقتصادی بدحالی کی اصلاح کے لئے جس میں عرصہ دراز سے لوگ مبتلا ہیں اجتماعی طور پر ساری قوم کی مستقل اور مسلسل کوشش کی ضرورت پڑے گی اور ملک کے نوجوانوں کو پورے جوش اور قربانیوں سے کام لے کر عوام میں مقررہ پروگرام پر عمل کرنے کی روح پھونکنا پڑے گی۔

تقدیر پرستی کا انسداد

"تاجروں کے کمیشن نے ایک جگہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ "کسان عموماً ہوشیار اور محتاط ہوتے ہیں لیکن چونکہ انکی ترقی اور خوشحالی زیادہ تر ایسے اسباب پر منحصر ہے جو اُن کے اختیار سے باہر ہیں اس لئے ان کی ہوشیاری اور احتیاط میں تقدیر پرستی کا شائبہ شامل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض صورتوں میں وہ لاپروائی پر اتر آتے ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں اعلیٰ تجارت کے سخت منافی ہیں"[1]

ہندوستان پر یہ چیز اور زیادہ صادق آتی ہے۔ اس لئے کسانوں میں کام کرنے والوں کا یہ فرض ہے کہ تقدیر پرستی سے جو کاہلی اور جمود پیدا ہو جاتا ہے سب سے پہلے اسے رفع کیا جائے۔ یہ عقیدہ کہ ہماری زبوں حالی قسمت

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۱۱

کی خرابی کے باعث ہے شاہراہ ترقی پر قدم نہیں بڑھانے دیتا۔ اگر کسی قوم یا جماعت میں سے خود اعتمادی جاتی رہے تو پھر ترقی کا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوتا طویل اور مسلسل تباہی کی وجہ سے لوگ قسمت کے چکر میں پڑ گئے ہیں اسلئے اگر انہیں ترقی کی صورت معلوم بھی ہو جائے تب بھی وہ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے لہذا سب سے پہلے ان میں حوصلہ مندی کا تخیل پیدا کرنا چاہیئے اور انھیں یقین دلانا چاہیئے کہ آسودگی اور خوشحالی کے لئے جس مستعدی ذہانت، اور جن وسائل کی ضرورت ہے قدرت نے انھیں وہ سب کچھ عطا کئے ہیں اگر انہیں تعلیم یافتہ بھائیوں کی ہمدردی اور امداد کا مزید اطمینان دلایا جائے تو انکی زندگی کا سارا منظر ہی بدل جائے اور درخشاں اور امید افزا نظر آنے لگے۔
بس یقین کیجئے کہ اُس وقت نصف جنگ فتح ہوگئی ہمیں یہ بات اُن کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے کہ اپنے مستقبل کو تم خود بنا اور بگاڑ سکتے ہو اور تمہاری قسمت خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر دوسرے ملکوں میں غریب گھرانے کے بچے ترقی کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستانی کاشتکار ترقی نہ کر سکیں ہمارے سامنے میدان اتنا وسیع ہے۔ کام اتنا وقیع ہے۔ اور مشکلات اتنی زبردست ہیں کہ بظاہر وہ مہیب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ہم صحیح طریقہ پر عمل شروع کریں تو کامیابی یقینی ہے۔ عوام میں اسی قسم کے پروپگنڈے سے ابتدا کرنا چاہیئے اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ماضی سے مستقبل کا اندازہ لگاتا ہے۔
لیکن عزم بالجزم کے سامنے مشکلات کیا چیز ہیں۔ ہندوستانیوں کا عقیدہ ہے کہ دماغی یک سوئی قلبی اطمینان اشتراک عمل

سے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مشہور اور آزمودہ مقولہ ہے کہ خدا بھی انھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ناکامی کا خوف اور خود اعتمادی کا فقدان ہمارے قومی گناہ ہیں۔ حوصلوں کی پستی اور تقدیر پرستی نے ہمارے سینوں میں امیدوں کو فنا کر دیا ہے اور ہماری روحوں کو کچل ڈالا ہے۔ اس لئے ہمیں پژمردہ دلوں میں امید اور ہمت کی برقی رو دوڑانا چاہیئے خود اعتمادی کا سبق سکھانا چاہیئے۔ مستقبل کی امیدوں کو بیدار کرنا چاہیئے۔ گویا ایک شاعر کے الفاظ میں اُن سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ "اٹھو اور میدان عمل کی طرف قدم بڑھاؤ۔ قسمت کے مقابلہ کے لئے شیر کا سا دل بناؤ محنت کرنا سیکھو اور نتیجہ کا صبر کے ساتھ انتظار کرو"۔ اگر ہم واقعی اس پر عمل شروع کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے کسان زیادہ عرصہ تک قسمت کا کھلونا بنے رہیں سستی۔ کاہلی اور نا امیدی کے دیو کا شکار ہوں اور مستقبل پر اعتماد پیدا نہ ہو سکے۔

امید کی یہ فضا پیدا کرنے کے لئے منظم کوشش اور عزم بالجزم کی ضرورت ہوگی۔ سارے ملک میں اس پروپیگنڈے کو کامیاب بنانے کے لئے ایک مضبوط جماعت ترتیب دینا ہوگی اور کام کرنے والوں کو زبردست مشکلات اور ہمت شکن مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ممکن ہے ان صفحات کے مطالعہ سے ناظرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ ہم اس قدیم سماج کو نئے سرے سے زندہ کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر گاؤں مستغنی بالذات تھا اور اپنی ضروریات کے لئے بیرونی دنیا کا محتاج نہ تھا

ہم قدیم دیہاتی تمدن کی اچھائیوں یا برائیوں پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ نہ موجودہ مغربی تمدن سے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بلا تامل یہ ضرور کہیں گے کہ چاہے قدیم نظام ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا یا نہ تھا۔ لیکن اب ۱۹۳۵ء میں یہ ممکن نہیں ہے کہ پچھلا زمانہ واپس لوٹ آئے۔ اب لوگوں کو قدیم اور ابتدائی طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرنا ایک مہمل سی بات ہوگی۔ اعلیٰ معیار زندگی اختیار کرنے کے لئے آجکل قدم قدم پر جو ترغیبیں موجود ہیں اُن کا آسانی سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کون شخص یہ توقع کر سکتا ہے کہ دنیا کے موجودہ رویہ کے خلاف کامیابی سے جنگ کر سکے گا موجودہ اور آئندہ نسلوں کو قدیم طرز زندگی پسند نہیں ہو سکتی۔ اس میں چاہے کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں لیکن پچھلا زمانہ اب واپس نہیں آسکتا۔ تاوقتیکہ ہندوستان کو اتنی قوت حاصل نہ ہو کہ ساری دنیا پر اثر ڈال کر رائے عامہ کو بدل سکے۔ لیکن بظاہر یہ ممکن نہیں۔ اس لئے قدیم صورت حالات کی واپسی کا خیال کرنا بھی عبث ہے اور ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم اس نام نہاد مہذب دنیا کے موجودہ اصولوں کی پیروی کریں۔

تنظیم کامیابی کی کنجی ہے

عوام کو تنظیم کی برکتیں بتانے کی ضرورت ہے۔ جدید تہذیب میں بھی یہ کامیابی کی پہلی سیڑھی سمجھی جاتی ہے۔ ہندوشاستر بھی کہتے ہیں کہ کلیگ میں سنگھٹن ہی میں شکتی ہوگی۔ لہٰذا یہی سبق ہمیں ہندوستانیوں کو بھی سکھانا ہے کارخانوں

میں۔ تجارت میں۔ سیاست میں۔ غرضکہ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں جدید تہذیب کا مسلک "تنظیم اور سنگٹھن" ہے۔ آپ چاہے کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں لیکن اگر آپ غیر منظم ہیں تو منظم دنیا کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکتے۔ اس لئے ہندوستانیوں کو آئندہ ہر شعبۂ زندگی میں یہی نعرہ لگانا چاہیئے کہ "تنظیم کرو۔ سنگٹھن کرو"۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ پچھلے زمانہ میں دیہی جماعتوں میں بہت بہتر سنگٹھن تھا لیکن وہ بالکل مقامی حیثیت کا تھا یعنی ضلع۔ صوبہ یا ملک میں وسیع پیمانہ پر کوئی سنگٹھن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باہر سے جب کوئی حملہ ہوتا تھا تو ہم متحد ہو کر اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ لڑائیاں مجموعی طور پر ملک کی جانب سے نہیں بلکہ انفرادی طور پر راجوں مہاراجوں کی طرف سے ہوتی تھیں اور شکست و فتح سے انہی کو سروکار ہوتا تھا۔ ہمارے ملک کے سیاسی تنزل کی تمام تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تنظیم نہ ہونے ہی سے ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ ہماری صنعتوں کی تباہی کا بھی یہی سبب ہے۔ ہمارے دستکاروں اور کاریگروں نے کبھی تنظیم کرنے کی کوشش نہ کی۔ اور ان تلخ تجربوں سے بھی ہمارے کان نہ ہوئے۔ آج بھی بدترین قسم کا انتشار ہر جگہ موجود ہے تنظیم کے لئے خاص طور پر تعلیم کی نہیں بلکہ مستقل تربیت اور مکمل ڈسپلن (نظم) کی ضرورت ہے۔ دنیا کی اقوام میں سرفراز ہونے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ تربیت اور ڈسپلن حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر پہلے کی طرح اب بھی ہم انفرادیت پر بھروسہ کرتے رہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا مستقبل بھی برباد ہو چکا۔

دیسی مال خریدو

ہم ایک بار اور یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ دوسرے ملکوں نے سائنس میں جو ترقی اور ایجادیں کی ہیں انکی موجودگی میں یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہندوستانی محض زمین کی پیداوار پر بسر کرسکیں۔ زمین پر اتنا بار بڑھ گیا ہے کہ اب اس پر گذارہ مشکل ہوگیا ہے۔ اس سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم اپنی آبادی کے لئے کافی خوراک بھی پیدا نہیں کرسکتے اور نہ یہ کہ زندگی کو برقرار رکھنے کی معمولی سے معمولی ضروریات بھی زمین کے ذریعہ پوری نہیں کی جاسکتیں۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ ہماری موجودہ آبادی سے دوگنی آبادی بھی ہماری زمین کی پیداوار پر آسانی سے بسر کرسکتی ہے۔ بشرطیکہ تمام خوردنی اشیا، خود ہمارے کام آئیں اور انکی برآمد قطعی روک دی جائے۔ لیکن بین الاقوامی رسل و رسائل کے موجودہ دور میں یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہم اپنے دروازے بند کرلیں اور دوسرے ملکوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ اگر ہم ایسا کر بھی سکیں تو موجودہ حکومت ہمارے ہی مفاد کے عذر پر فوراً ہمیں روک دیگی جس طرح قدرت کی رحمتیں مثلاً ہوا اور سورج کی روشنی وغیرہ کسی خاص علاقہ کے لئے محدود نہیں کی جاسکتیں اسی طرح کوئی ملک اپنی پیداوار دوسرے ملکوں کو بھیجنے سے انکار نہیں کرسکتا۔ اور نہ کامل عزلت گزینی کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ ہماری کمزوری کا اظہار ہوگا لیکن ساتھ ہی ہمیں غیر ملکوں کی دستبرد سے اپنا تحفظ ضرور کرنا چاہئے۔ موجودہ حالات میں اگر ہم زیادہ اناج

پیدا کریں تو ہم زیادہ نقصان میں رہیں گے۔ اگرچہ یہ بڑا بھاری دعویٰ ہے۔ جو شاید خلاف عقل بھی کہا جائے۔ مگر یہ دعویٰ واقعات پر مبنی ہے۔ جب کسی ملک کے دروازے دنیا کے تمام دوسرے ملکوں کے لئے کھلے ہوں تو اس کے بازار کی رفتار بھی دنیا کے بازاروں کے ماتحت ہوتی ہے۔ بیچنے والا کبھی اس کی پروا نہیں کرتا کہ آیا ایک بھوکا شخص بھی اس شرح سے اپنی خوراک خرید سکے گا یا نہیں۔ اناج کا بیوپاری تو اپنا مال ہمیشہ اسی شخص کے ہاتھ فروخت کریگا جو سب سے بڑھکر قیمت لگائے۔ چاہے اس کا پڑوسی فاقوں مر رہا ہو لیکن اس کی قابل رحم حالت کی وجہ سے وہ اپنی شرح میں ہرگز تخفیف نہ کریگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اسے تھوڑا سا خیرات کے طور پر دیدے لیکن اتنی کم قیمت پر بیچنے کو تیار نہ ہوگا جو وہ غریب ادا کرسکتا ہو۔ عام شرح کسی خاص جنس کی قیمت یا صرف اپنے ملک کے گاہکوں کی قوتِ خرید کے مطابق قرار نہیں پاتی مثلاً اگر انگلستان میں زیادہ قیمت اٹھ رہی ہو تو گیہوں ضرور وہاں بھیجدیا جائے گا اور اس کا لحاظ نہ کیا جائیگا کہ اپنے ملک والوں کے کھانے کو بھی کچھ بچا یا نہیں۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ پچھلے چند سالوں میں اربوں روپیہ ہندوستان سے صرف اس لئے باہر چلا گیا کہ دوسرے ملکوں نے اسکی زیادہ قیمت ادا کی۔ ہمارے ہندوستانی تاجروں نے سونا سستا خرید کر اور ملک سے باہر بھیجکر لاکھوں روپیہ منافع کمایا اگرچہ وہ خود اپنی انجمنوں میں اس بات پر زور دیتے رہے کہ سونے کی برآمد سرکار کو حکماً روک دینا چاہیئے۔ اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں

کہ دوسرے ملکوں کی قوت خرید ہماری قوت خرید سے بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اناج اور دیگر اشیاء خوردنی باہر بھیجی جاتی ہیں اور یہاں ہزاروں آدمی فاقوں مرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اگر پیداوار ہماری ضرورت سے زیادہ بھی ہو تو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ یہ زائد پیداوار یہاں کے بھوکوں کے پیٹ بھرنے کے کام آئے گی۔ کسی جگہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے۔ کہ کسان بھی اپنے کھانے کے لئے کافی ذخیرہ نہیں رکھتا اور اکثر سب کچھ بیچ ڈالنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پھر بھلا جو لوگ کاشت نہیں کرتے اُن کی حالت تو اور بھی ردی ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کہ پیداوار کی زیادتی سے کسان کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ شاید وہ اس اہم چیز کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ پیداوار کی زیادتی کی وجہ سے قیمتیں گر جائیں گی جس سے لازمی طور پر کسان کی قوت خرید پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ اور اس کی حالت اور بھی بدتر ہو جائے گی۔

جب تک ہندوستان تیار شدہ سامان کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج ہے لازمی طور پر وہ اپنی زراعتی پیداوار اس کے بدلے میں باہر بھیجتا رہے گا۔ اناج اور دیگر خوردنی اشیاء کی برآمد اس وقت تک بند نہیں ہو سکتی جب تک تیار شدہ سامان کی درآمد جاری ہے۔ چنانچہ جب تک صنعت و حرفت کو رواج نہ دیا جائے موجودہ حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ گویا اس مرض کا صرف یہی علاج ہے کہ جو کثیر آبادی آج زراعت پر بسر کر رہی ہے اس میں سے کچھ لوگوں کو

کسی دوسرے کام پر لگایا جائے۔ تاجروں کے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بالکل صحیح لکھا ہے[1] کہ زراعت میں وسیع پیمانہ پر اصلاحات کرنے سے کسان کو کوئی نفع نہیں ہو سکتا بلکہ الٹا نقصان ہوگا۔ اور ان اصلاحات کا سارا فائدہ خریدار کو پہنچے گا۔ اگر موجودہ حوادث کا مقابلہ کرنا ہے تو یقیناً انفرادی کارکردگی میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ اور جو لوگ اس قسم کی اصلاح کریں گے اور موجودہ حالات سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کریں گے وہ بہت بڑی حد تک خوشحال بھی ہو جائیں گے۔ لیکن زراعت میں وسیع پیمانہ پر اصلاحات کرنے سے ایک عرصہ تک خوشحالی بڑھنے کے بجائے گھٹتی ہی جائے گی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ زراعت وسیع اور منظم طریقہ کی اصلاحات کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہے۔" یہی کمیشن اس نتیجہ پر بھی پہنچا ہے کہ کسان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ یہ اس ملک کی مسلم الثبوت جماعت کی رائے ہے جہاں صرف ۲۵ فیصدی لوگ زراعت پر بسر کرتے ہیں یہ اصول ہمارے یہاں تو اور زیادہ صادق آتا ہے جہاں تین چوتھائی آبادی کی گزر بسر کا ذریعہ صرف زراعت ہے۔ اس لئے ہمیں تو بہت بڑی تعداد کو زراعت سے ہٹا کر دوسرے کاموں پر لگانا ہے۔ بیکاری کا مسئلہ بھی اس سے حل ہو جائے گا۔ اور فارغ البالی بھی ہو جائے گی۔ آج نہیں بلکہ

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۲۱

۱۸۸۰ء میں قحط کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس نظریہ کو بڑے زور کے ساتھ لکھا ہے[1]۔ وہ کہتے ہیں "ہندوستان میں قحط عموماً تباہ کن ثابت ہوتا ہے اور موثر طریقہ پر امداد بھی نہیں پہنچائی جا سکتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں بہت بڑی آبادی کا انحصار صرف زراعت پر ہے اور کوئی دستکاری ایسی نہیں ہے جس پر کچھ لوگ بھی گذر کر سکتے ہوں۔ چنانچہ اگر کبھی بارش نہ ہو تو نہ صرف مزدور پیشہ طبقہ کو روزمرہ کی کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی سستے داموں پر نہیں مل سکتیں بلکہ وہ روزگار اور کمائی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا مکمل علاج یہی ہے کہ زراعت کے علاوہ ایسی صنعتیں رائج کی جائیں جن کی قیمتوں میں وقتی اتار چڑھاؤ نہ ہو۔

ہندوستان کی گھنی آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ چیزیں اور زیادہ اہم معلوم ہوتی ہیں لیکن جب یہ پتہ چلتا ہے کہ زمین کو بہتر سے بہتر طریقہ پر کاشت کرنے کے لئے بھی جس قدر افراد کی ضرورت ہو سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ محض زراعت پر بسر کر رہے ہیں تو حالات کی نزاکت کا پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ جب تک یہ صورت رہے گی تو زائد از ضرورت تعداد زراعت کے نفع کو ہضم کرتی رہے گی۔ پھر کیا تعجب ہے اگر ایسے ملک میں ترقی کی رفتار بہت ہی سست ہو۔" یہ تحریر ۵۰ سال پہلے کی ہے۔ اسوقت زراعت پر گذر کرنے والوں کی تعداد صرف ۵۸ فیصدی تھی مگر اب بدقسمتی سے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۳ پیرا ۳۴

یہ تعداد ۵ فیصدی سے بڑھ کر ۳، فیصدی ہو گئی ہے ۱۸۸۰ء میں جو حالات قحط کمیشن کے ممبران کے نزدیک تشویشناک تھے آج نصف صدی گذرنے کے بعد اور بھی بدتر ہو گئے ہیں۔ اس لئے مستقبل کا امید افزا تخیل پیدا کرنے کے علاوہ سب سے پہلا علاج یہی ہے۔ کہ لوگوں کو زراعت سے ہٹا کر صنعت و حرفت میں لگایا جائے۔

علاج تجویز کر دینا تو بہت آسان ہے۔ لیکن اُن کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایسے غریب ملک میں جہاں سرمایہ کی قلت ہو تعلیم کی کمی ہو۔ کافی ذہانت اور ہنر مفقود ہو۔ بڑی بڑی منظم صنعتوں کا تجربہ نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں دوسرے ملک والوں کی حکومت ہو۔ جنہیں اہل ملک سے کوئی ہمدردی نہ ہو اور جو ملک کے صنعتی مفاد کی ذرا بھی پروا نہ کرتے ہوں۔ اس لئے یہاں نئی صنعتوں کا شروع کرنا سخت دشوار ہے۔

سنٹرل بکنگ انکوائری کمیٹی کے سامنے جو شہادتیں پیش ہوئی تھیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارا ملک اگرچہ بہت غریب ہے۔ لیکن پھر بھی تھوڑا بہت سرمایہ صنعتی کاروبار میں لگانے پر آمادہ ہے۔ ایسے حوصلہ مند لوگ بھی موجود ہیں جو مقابلہ میں قیمتیں اور شرح کم کئے جانے کے باوجود سندھیا نیویگیشن کمپنی جیسے کاروبار جاری رکھنے کو تیار ہیں لیکن ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ حکومت کافی ہمت افزائی نہیں کرتی۔ اور تحفظ کے بغیر اس قسم کی پیش قدمی میں کامیابی ناممکن ہے۔ یہ بالکل واقعہ

ہے کہ صنعتوں کے ابتدائی دور میں بڑی ہمدردی اور خاص نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حکومت کی سرپرستی اور امداد سے دوسرے ملکوں میں صنعتوں نے بہت تھوڑے ہی عرصہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے اور پوری طرح کامیاب ہوئی ہیں۔ جاپان ہی کی مثال لیجئے تھوڑے ہی زمانہ میں حکومت کی امداد سے اس نے حیرت انگیز باتیں کر دکھائیں اور ہندوستان ہی میں تمام ملکوں کے مقابلہ میں سستا مال بیچا۔ ماضی سے قطع نظر ہمیں امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہماری گورنمنٹ بھی ہماری قومی صنعتوں کی امداد کے لئے اپنا ہاتھ بڑھائے گی۔ لیکن اس عرصہ میں ہمیں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہ چاہیئے۔ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ حکومت کی امداد کے بغیر بھی بعض صنعتوں کا انتظام کرنا ہمارے امکان میں ہے۔ اگر باقاعدہ کوشش کیجائے تو ہر ضلع میں صنعتی کاموں پر لگانے کے لئے کافی روپیہ جمع ہوسکتا ہے اس کے علاوہ ملک کا بہت کافی روپیہ بنکوں اور سرکاری تمسکوں وغیرہ میں پھنسا ہوا ہے۔ اسے بھی صنعتی کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ملک میں بہت سے لکھ پتی موجود ہیں۔ اُن کو بھی اپنی جمع کی ہوئی دولت اس کام میں لگانے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ملک میں ولایتی مال کے مقابلہ میں دیسی مال کی سرپرستی کی عام فضا پیدا ہو جائے۔ سرمایہ دار تو عوام سے صرف اتنا اطمینان چاہتے ہیں کہ ان کے تیار کردہ مال کی سرپرستی کی جائے گی۔ اور جہاں انہیں یہ اطمینان ہوگیا تو وہ بلا پس و پیش صنعتی کاروبار میں روپیہ لگانے اور ہر قسم کے خطرات کا

مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ کیا یہ صرف تین سال کی بات نہیں کہ جون ہی حکومت نے کھانڈ پر ڈیوٹی لگائی بہت سے شکر کے کارخانے ملک میں قایم ہو گئے اور کروڑوں روپیہ آناً فاناً اس صنعت میں لگ گیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں روپیہ کی کمی نہیں ہے صرف صنعت کی سرپرستی ہونے کی وجہ سے یہ روپیہ کارخانوں میں نہیں لگتا۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں تین ارب روپیہ کا مال باہر سے آتا ہے۔ خیال تو کیجئے اگر یہی سامان ہندوستان میں تیار ہونے لگے تو کتنے آدمی برسرروزگار ہو جائیں۔ ہماری اندرونی تجارت بیرونی تجارت سے گیارہ گنی بتلائی جاتی ہے۔ گویا ۶۶ ارب روپیہ سالانہ کی تجارت ہوئی۔ اس میں بیرونی تجارت بھی اگر جوڑ دی جائے تو ۷۰ ارب روپیہ تک پہنچتی ہے۔ جس ملک کا خرید و فروخت کا بازار اتنا وسیع ہو اسے بھلا حکومت یا دوسرے ملکوں کی امداد کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں مگر ایک چیز کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندوستان کا بچہ بچہ تم کھالے کہ اپنے ہی ملک کا بنا ہوا مال خریدے گا۔ چاہے کچھ قربانی ہی کرنی پڑے اور چاہے وہ مال کچھ بھدا اور بھنگا ہو یا دیرپا نہ ہو۔ مال سستا اور خوشنما ہونا تو تجربہ پر منحصر ہے اس لئے جو قوم صرف اپنا تحفظ کرنا چاہتی ہے شروع میں اسے ان چیزوں کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ "ہندوستانی مال خریدو" یہی ہمارا نعرہ ہونا چاہیئے اور ہر ہندوستانی کے قلب میں دیسی مال خریدنے کا جذبہ موجزن ہونا چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہم اس عقیدہ کی اہمیت اور قوت کے قائل نہیں ہیں اور اس حقیقت کو ہم نے

محسوس نہیں کیا کہ حکومت کی سرپرستی کے مقابلہ میں عوام کی سرپرستی کامیابی کے لئے زیادہ ضروری ہے۔ صدیوں سے ہم غلام رہے ہیں اس لئے خود اعتمادی اور خود اختیاری کی قوتوں کو شاید ہم بھول گئے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی قوم کے عہد اور فیصلے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر بھلا ۳۵ کروڑ افراد کی قوم کے اس تہیہ کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ ابھی مہاتما گاندھی کی کھادی پرچار کی اقتصادی تحریک کے زمانہ میں ہم نے دیکھا کہ لاکھوں آدمی روزگار سے لگ گئے اور اس صنعت کی بدولت ہزاروں بھوکوں کو روزانہ روٹی ملنے لگی حالانکہ شروع شروع میں نہ صرف باہر والے بلکہ خود ہمارے ملک کے بعض تعلیم یافتہ حضرات اس کا مضحکہ اڑاتے اور ہنستے تھے۔ بدیشی مال کے سستے اور خوبصورت ہونے کے باوجود ہندوستانی ملوں کو اس عرصہ میں اتنا نفع ہوا کہ اپنے حصہ داروں کو انہوں نے کافی منافع تقسیم کیا۔ بات صرف یہ ہے کہ بعض شہروں میں دیسی مال کی سرپرستی کا خیال عام طور پر پیدا ہو گیا ہے۔ اگر ہماری سرپرستی سے کپڑے کے کارخانہ کامیاب ہو سکتے ہیں تو اسی طرح دوسری صنعتیں بھی کامیاب ہو سکتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جاپان میں ایک ٹائر بنانے والی ولایتی کمپنی تھی۔ جب جاپانیوں نے ٹائر بنانے کی خود اپنی ایک کمپنی کھولی تو اس نے قیمت گھٹانا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاپانی کمپنی کو سخت نقصان ہوا۔ اس پر جاپان والے اس ولایتی کمپنی کے مالکوں کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ اس حرکت سے باز رہیں۔ لیکن انہوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور برابر ایسی ترکیبیں کرتے رہے۔ جس سے جاپان کی یہ نئی صنعت تباہ ہو جائے۔ بالآخر

ناج ۔، کروڑ کراؤں کی خوردنی اشیا اور ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ کراؤں کی کھاد وغیرہ دوسرے ملکوں سے خرید کیں۔ یعنی جن اشیاء کو پہلے فروخت کر کے گذارہ کرتا تھا اب ان کو دوسرے ممالک سے منگاتا ہے۔ بخلاف اس کے اس نے خاص طور پر دودھ کی بنی ہوئی چیزیں۔ مثلاً مکھن وغیرہ باہر بھیجا۔ ممکن ہے دو ایک سال کے لئے بعض چیزوں کا بازار خراب ہو جائے۔ لیکن آخر کار کسان فروخوشحال ہو جائیں گے۔ جو لوگ بازار کی اس خرابی سے ڈرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس معاملہ میں کسان کی حالت آج بھی قابل رحم ہے قریب قریب اسے ہر چیز لاگت سے بھی کم قیمت پر بیچنا پڑتی ہے۔ مدراس میں اکثر مقامات پر مونگ پھلی کی فصل کھودی ہی نہیں گئی بلکہ اس پر دوبارہ ہل چلا دیا گیا کیونکہ ان کی اتنی قیمت بھی نہ اٹھتی تھی کہ کھدائی وغیرہ کا خرچ نکل آئے یہی حال بنگال میں سن کا ہوا۔ ممالک متحدہ میں گڑ ایک روپیہ ۱۲ آنہ من میں بھی فروخت نہ ہو سکا حالانکہ ایخ کی قیمت سے قطع نظر صرف تیاری پر ایک روپیہ من کے قریب خرچ آیا تھا۔ چنانچہ گنے کے بہت سے کھیت کاٹے ہی نہیں گئے اور یونہی چھوڑ دیئے گئے۔ پنجاب میں بھی گیہوں اور روئی پیدا کرنے والے کسانوں کی یہی حالت ہوئی۔ اگر آجکل معمولی حالت میں یہ صورت ہو سکتی ہے تو بتایئے غیر معمولی حالات میں اس سے اور کیا بدتر ہو گی دوسرے ملکوں کے بازار سے اخراج کی تمام دھمکیاں بالکل بے معنی ہیں۔ دیسی مال خریدنے کا عہد کرنے سے کسان کو اپنی حیثیت سے زیادہ قربانی کرنا ہو گی لیکن بہر حال اسے اس قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اسی میں اسکی

نجات ہے اور اگر وہ سرتاسر سودیشی کا پابند نہ ہوگا تو اس کی تباہی یقینی ہے
اگر یہ ممکن اور قابل عمل ہوتا تو ہم کسانوں کو یہی مشورہ دیتے کہ مستغنی
بالذات موضع کا پرانا اصول اختیار کریں اور شہروں کے بازاروں میں جو چیزیں
انہیں اپنی طرف کھینچتی ہیں ان پر نظر بھی نہ ڈالیں۔ دوسروں کی بنائی اور فروخت
کی ہوئی چیزوں کے جتنے کم وہ محتاج ہوں گے اتنا ہی کم قیمتوں کا اتار چڑھاؤ
ان پر اثر انداز ہو سکے گا۔ مستغنی بالذات موضع کا حسن یہی تھا۔ کہ کسان تجارتی
حیثیت سے کاشتکاری نہ کرتا تھا۔ اس لئے قیمتوں کے مدوجزر کا اس
کی خوشحالی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ موجودہ نظام کا خاص نقص یہی ہے کہ کسان
پر اپنی پیداوار کی قیمتوں کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور وہ انہیں فروخت کرنے کے
لئے مجبور ہوتا ہے تاکہ وہ چیزیں خرید سکے جو نہ اب پیداوار کے تبادلہ میں
اسے مل سکتی ہیں۔ اور نہ وہ خود تیار کر سکتا ہے۔ ہر چیز خریدنے کیلئے اور ہر قسم
کی ادائیگی کے لئے اسے نقدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنا مال
بیچنے پر مجبور ہوتا ہے اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے لازمی طور پر نقصان اٹھاتا
ہے۔ لہٰذا اسے یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ جتنی کم چیزیں وہ بازار
سے خریدے گا۔ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا اتنا ہی کم اثر اس پر پڑے گا۔ بظاہر
کوئی توقع نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت ہند قیمتوں کے استحکام کے لئے کوئی
صورت اختیار کرے۔ اس لئے اسی میں نجات ہے کہ دوسروں کی بنائی ہوئی
چیزوں کا استعمال کم کر دیا جائے۔ اگر کسان اپنی ضروریات کو اس وقت تک
کے لئے کم کر دے جب تک وہ فارغ البال نہ ہو جائے۔ تو اس کی معمولی

ضروریات زندگی تو اس کے اپنے کھیت سے چاہے وہ کتنا ہی جھوٹا کیوں نہ ہو پوری ہو سکتی ہیں اگر وہ مذکورہ بالا اصول کی پابندی نہیں کر سکتا ہے تو پھر اسے خاص طور پر وہی چیزیں خریدنا چاہیئے جو اپنے ملک کی بنی ہوئی ہوں تاکہ زمین کی پیداوار پر گذر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے پائے اور اس کے روزگار میں نئے حصہ دار پیدا ہو جائیں۔ صنعت و حرفت کی ترقی ہی میں صرف اس کی نجات کا راز پوشیدہ ہے اور یہ ترقی اسوقت تک ہرگز نہیں ہو سکتی جب تک خود کسان دیسی مال خریدنے کا عہد نہ کرلے۔

تعلیم

بین الاقوامی ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کے موجودہ دور میں کوئی شخص بھی بیرونی دنیا سے اپنے آپ کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا جیسے حملہ آور فوج اندھے کے ساتھ محض اس بنا پر کوئی رعایت نہیں کرتی ہے کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا اسی طرح اگر ہم دنیا کے حالات سے واقف نہ ہوں تو کیا وہم پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ چاہے ہمیں قدرت کی مختلف قوتوں کا علم ہو یا نہ ہو۔ لیکن وہ ہم پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ قومی ترقی میں سب سے پہلی اور اہم چیز یہی ہے کہ عوام کو (جن میں کسان بھی شامل ہیں) لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ ترکی کسی زمانہ میں بہت پس ماندہ ملک تھا۔ لیکن اب اس نے اپنی اصلاح کی طرف توجہ کی ہے۔ پہلا کام

اس نے یہی کیا کہ ملک کے ہر بچہ۔ جوان اور بوڑھے کو تعلیم دینا شروع کی حتیٰ کہ اپنی زبان کا رسم الخط بھی بدل دیا تاکہ تعلیم جلد از جلد پھیل سکے اس کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ ملک کا ایک آدمی بھی غیر تعلیم یافتہ نہ رہ جائے۔ روس نے بھی یہی کیا۔ پس ماندہ ملکوں کے عروج کی یہ دو جدید ترین مثالیں ہیں۔ اگر ہم انگلستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ تہذیب کی ابتدا تعلیم ہی سے ہوئی ہے۔ یورپ کے کسی ملک کے حالات کا مطالعہ کیجئے۔ آپ پر روشن ہو جائے گا۔ کہ ملک کی ترقی میں لازمی ابتدائی تعلیم کو بہت بڑا دخل ہے۔ قدرت نے انسان کو حافظہ اور ذہن عطا کیا ہے۔ اگر ملک کا ایک بچہ بھی اس تجربہ اور معلومات سے محروم رکھا جائے جو اس کے آبا و اجداد نے مسلسل اور طویل محنت اور کوشش سے حاصل کی تھیں تو یقیناً یہ انسانیت کے خلاف سخت جرم ہوگا۔ رعایا کو تعلیم دینا دنیا کی ہر حکومت کا اولین فرض ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اس سے محروم ہیں۔ شاہی زراعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں[1] حسب ذیل الفاظ میں تعلیم کی اہمیت تسلیم کی ہے" عام تعلیم اور تعلیم نسوان کے اعداد سے نمایاں طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کے کمزور ترین پہلو کیا ہیں۔ تعلیم کا سب سے ضروری مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کم از کم معمولی طور پر لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ اس کے بغیر دیہاتوں میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی ہے"

ابتدائی تعلیم کی اہمیت کو مسٹر گوکھلے اور دوسرے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۵۱۹

ہندوستانی مدبروں نے پوری طرح محسوس کیا تھا اور انہوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ ملک میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دیدی جائے۔ لیکن ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آج بھی ابتدائی لازمی تعلیم محض ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مسئلہ پر بارہا کونسلوں میں بحث ہوئی لیکن درحقیقت ، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل وطن نے ابتک یہ محسوس ہی نہیں کیا ہے کہ تعلیم غذا سے بھی زیادہ ضروری اور قابل قدر چیز ہے۔ اگر کہیں وہ یہ محسوس کر لیتے تو ابتک جتنا روپیہ کالجوں۔ ہائی سکولوں اور دوسرے گراں خرچ مدارس پر صرف کیا گیا ہے وہ سب ابتدائی تعلیم پر خرچ کیا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ لازمی تعلیم آئین ساز جماعتوں کی امداد کے بغیر رائج نہیں ہو سکتی لیکن جیسا کہ ہم نے اکثر لکھا ہے رائے عامہ کی طاقت حکومت کی طاقت سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اگر اہل ملک ایک مرتبہ یہ طے کر لیں کہ انہیں اس بیش قیمت چیز یعنی انسانی سرمایہ سے کام لینا ہے تو پھر فوراً وہ اپنی پوری توجہ اسی اہم مسئلہ کی طرف لگا دیں گے۔ اسکول اور کالج کے وہ نوجوان جو بے روزگار ہیں اور بے کار اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں اگر اس کام پر لگ جائیں تو حکومت اور اس کے افسروں کی سرد مہری اور بے پروائی کے باوجود عوام میں علم کی سچی طلب پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ پیاس ایک دفعہ پیدا ہونے کے بعد پھر آسانی سے نہیں بجھتی ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے بھی سب سے پہلے عوام میں تعلیم کا پھیلانا ضروری

ہے تاکہ لیڈر صاحبان جن خیالات کی اشاعت کرنا چاہیں وہ تحریر کے ذریعہ سے آسانی سے پھیل سکیں اس لئے ہم ہر طبقہ کے سیاسی رہنماؤں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ عوام میں تعلیم پھیلانا اپنا پہلا مقصد قرار دیں۔

حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی ہم یہ عرض کریں گے کہ افسروں کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر کوئی غلط خیال عوام میں پھیل جاتا ہے تو پھر بڑی مشکل سے اس کا استیصال ہو سکتا ہے۔ دیہاتوں میں ہر قسم کی غلط فہمیاں بڑی آسانی سے پھیل جاتی ہیں اور بظاہر انکو رفع کرنیکی کوئی امکانی تدبیر نہیں ہے۔ اگر لوگ تعلیم یافتہ ہوتے تو اسے رفع کرنے کے لئے ایک سرکاری کمیونک کافی ہوتا۔ سیاسی جد وجہد کے زمانہ میں غلط فہمیاں اور افواہیں اتنی ہی خطرناک ہوتی ہیں جتنی حقیقی شکایات۔ اگر کوئی شخص حکومت سے برگشتگی کے نقوش لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دے تو مختلف مقامات پر حامیان حکومت کی چند تقریروں سے یہ نہیں مٹ سکتے۔ تاوقتیکہ لوگ پڑھے لکھے نہ ہوں کوئی نئی ایجاد بھی آسانی سے انہیں معلوم نہیں ہو سکتی۔ عوام کی افسوسناک جہالت حکومت کے خلاف زبردست الزام ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم کسانوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کریں۔ قومی بیداری کی اختیاری تحریک میں عوام کو خود بہت بڑا حصہ لینا چاہیئے۔ اگر وہ طے کر لیں کہ ہمیں تعلیم حاصل کرنا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں تعلیم سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ کاش گاؤں کا ہر اسکول طالب علموں سے بھر جائے اور کاش ہر بالغ مرد اور عورت

اپنے قریب ترین پنڈت کے پاس جا کر ان سے تعلیم حاصل کرنے کی فرمائش کرے۔ اگر ہر مندر۔ مسجد۔ گرجا۔ دھرم شالہ۔ اور چوپال کچھ عرصہ کے لئے مدرسہ بن جائے تو بہت تھوڑے عرصہ میں ہم لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔ اگر بے روزگار تعلیم یافتہ لوگ بچے دل سے اس کام پر لگ جائیں تو انہیں کم از کم کھانے پینے کو بھی کافی مل جائے گا اور آئندہ نسلیں بھی اُن کی احسان مند ہوں گی۔ اس کوشش میں ہر فرد و بشر کو ہاتھ بٹانا چاہیئے ہمارا دعویٰ ہے کہ تمام اصلاحات سے پہلے قوم کے چہرہ سے جہالت کا یہ داغ مٹانے کی ضرورت ہے۔

اکثر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں سینکڑوں زبانیں ہیں اور ہر ایک کا رسم الخط جدا ہے۔ اس لئے حکومت کے لئے ان سب کی تعلیم کا انتظام کرنا ناممکن ہے۔ جو لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں وہ اس قسم کے اعتراضات کرنے کی بجائے کسی ایک زبان کو عام طور پر رائج کر سکتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بے توجہی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ دلیلیں تراشی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ تو معلوم ہوگا کہ روس کے علاوہ باقی تمام یورپ سے ہندوستان بڑا ہے۔ پھر اگر یورپ میں مختلف سلطنتیں اور مختلف زبانیں ہوتے ہوئے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی جا سکی ہے تو پھر ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ تعمیری کام کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ کرنا تو ممکن ہے لیکن اگر حکومت یا پبلک کسی خاص مقصد کے حاصل کرنے کا عہد کر لے تو تمام مشکلات اس طرح رفع ہو جائیں گی

جیسے گرمی سے برف پگھل جاتا ہے۔ لازمی ابتدائی تعلیم لوگوں کی اہم ترین اور شدید ترین فوری ضرورت ہے اور اسے پورا کرنے کے لئے سچے دل سے حقیقی کوشش کرنا چاہیئے۔ یہی ہر اصلاح اور ترقی کی بنیاد ہے۔

باب دوم

بلا واسطہ علاج

مشترک اور اجتماعی کاشت۔ کسان کا مالکانہ حق

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے افلاس کا سوال دراصل پیٹ کا سوال ہے۔ ہندوستان کے غربا کو پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں ملتا لیکن یورپ والے اچھی غذا کھاتے ہیں اس لئے ان کے قویٰ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی اپنے یورپین ہم پیشہ لوگوں کی طرح طاقت و استعدی۔ اور خوش اسلوبی سے کام نہیں کر سکتے اس مسئلہ پر فوراً توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاخیر کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ حکومت محبان وطن اور مصلحین غرضکہ ہر شخص کو جو سوچنے کے لئے دماغ متاثر ہونے کے لئے دل اور کام کرنے کے لئے ہاتھ رکھتا ہے اپنی تمام تر کوششیں اسی کام کے لئے وقف کر دینا چاہیئے اگر ہم انسانی سرمایہ کا تحفظ بھی نہ کر سکیں تو ہماری پند و نصیحت۔ نشر و اشاعت تحقیق و تفتیش نظریئے اور اسکیمیں یہ سب آخر کس کام کی ہیں اس لئے ہمیں اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے اور قوت عمل سے کام لینا چاہیئے ہمیں کوشش کرنا چاہیئے کہ ان آدھے پیٹ کھانے والوں کو بھر پیٹ کھانا ملے اور اچھا ملے۔ لیکن سب سے بڑا سوال تو یہی ہے کہ آخر یہ ہو تو کیسے ہو۔ خیرات اور دان سے کام نہیں چل سکتا کیونکہ خیرات کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو لامحدود مدت تک لاکھوں آدمیوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ اس لئے بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ

ہم کسان سے صحیح قسم کی خوراک کافی مقدار میں پیدا کرائیں اور اس کا انتظام کریں کہ انھیں کھانے کے لئے بھی کافی ملجائے اور بازار بھی اور زیادہ خراب نہونے پائے۔

ہم پہلے بھی یہ بنیادی مشکل عرض کر چکے ہیں کہ پچھلے زمانہ میں زراعت کو کسان ازاد زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ سمجھتا تھا لیکن اب حالات سے مجبور ہو کر وہ اسے تجارت کے طور پر کرتا ہے۔ کسی پیشہ کو تجارتی نقطۂ نظر سے کامیاب بنانے کے لئے مختلف ذہنیت اور مختلف ذکاوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی ایسی صورت نکالنا چاہیئے کہ محتاط اور حساب لگانے والا تاجرانہ دماغ کھیتوں میں محنت و مشقت کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسان پیدا کرنے والا اور بیچنے والا۔ مزدوری کرنے والا اور سرمایہ لگانے والا سب کچھ خود ہی ہوتا ہے۔ ایک بے پڑھے کسان سے جو تجارتی اصولوں سے بالکل ناواقف ہو ان تمام اہلیتوں کی توقع کرنا گویا محالات کی توقع کرنا ہے۔ ایسی صورت میں اس امر کی ضرورت ہے کہ کسان اور تاجر کو مشترک کر دیا جائے۔ ان دونوں کو باہمی رضامندی سے ایک دوسرے سے منسلک کر دینا چاہیئے تاکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی کمی کو پورا کر سکے۔ جب کبھی کسان اپنا مال کسی دلال کے ذریعہ سے بیچتا ہے تو وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسان محض مزدور رہ جاتا ہے تو سرمایہ دار اس پر بے جا تصرف کرتا ہے۔ غرضکہ تصرف بیجا کے یہ دونوں طریقے بند ہونا چاہئیں۔

روس نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا ہے کہ تمام زمین حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لی ہے۔ ہر شخص سے کام لیتی ہے اور اسے کھانے اور پہننے کو مہیا کرتی ہے ہمارے بہت سے ہم وطن یہ طریقہ بہت پسند کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح علاج نہیں

ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اس غریب سے جس کی آپ اصلاح اور ترقی کرنا چاہتے ہیں اس کا پیشہ چھین لیتے ہیں اور اسے عمال حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں یہی نظام کا بنیادی اصول بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند اعلیٰ افسر ساری قوم کے عوض میں کام کرتے ہیں اور سوچتے ہیں گویا اس نظام میں انفرادی طور پر عمل کی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے ایک انسان کو دوسرے کا آلہ کار بنا دیا جائے۔

ہندوستان میں کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوگا کہ افسروں کو اتنے وسیع اختیارات دیدیئے جائیں لیکن فرض کیجئے اگر لوگ اس پر راضی بھی ہو جائیں اور خزانہ خالی ہو جائے یا متوقع لگان وصول نہ ہو تو کیا صورت ہوگی۔ ایسی حالت میں تباہی و بربادی کے سوا اور کیا نتیجہ ہوگا۔ علاوہ ازیں انسان کو ایک مشین تصور کرنے یعنی دوسرے کی مرضی کے مطابق کام کرنے کا تخیل ہی ہندوستانیوں کے نزدیک نہایت مکروہ ہے۔ ہندوستانی عقیدہ تو یہ ہے کہ خدا نے ہر شخص کو اپنے اعمال و افعال کا مختار کل بنایا ہے۔ اس لئے اس قسم کی کوئی اسکیم یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ مقبول ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم روس کی تاریخ پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خود اسے بھی یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ اور مجبور ہو کر کسانوں کو ان کی حالت پر چھوڑنا پڑا کہ وہ خود اپنی زمین کاشت کریں اور اپنی مرضی کے مطابق خود اپنا ہی بیج بوئیں۔ البتہ حکومت کی عام نگرانی اور اختیار ضرور رہا۔

ہمیں اس سے قطعی اتفاق نہیں ہے کہ کسان کو اپنے آزاد پیشے کی وجہ سے سماج میں جو عزت کسی وقت حاصل تھی اس سے وہ محروم کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اسے فاقوں مرتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ خود دنی اشیاء آج کل کے مقابلہ میں زیادہ پیدا کی جائیں اور یہ زاید پیداوار کسان کے ذاتی استعمال کے لئے چھوڑ دی

جائے تاکہ بازار کا نرخ نہ گرنے پائے۔

اس مقصد کے پیش نظر ہماری تجویز یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہوشیار اور مخلص لوگ مشترکہ اور اجتماعی کاشت کی تنظیم کریں اور کسانوں میں اسکو رواج دیں۔

اجتماعی کاشت سے ہماری یہ مراد ہے کہ گاؤں کے تمام کسانوں کو چند گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے اور وہ لوگ سارا کام مشترکہ کریں۔ جن کسانوں کے کھیت قریب قریب ہوں انھیں اس خیال سے کہ بہتر طریقہ پر کاشت ہو سکے ملا دینا چاہیئے اور تمام وسائل کو ایک جگہ جمع کر دینا چاہیئے تاکہ کافی بڑا کھیت نکل آئے اور موجودہ چھوٹی چھوٹی جوتوں کو جن پر اب بعض وجوہ سے کافی توجہ صرف نہیں کی جا سکتی زیادہ اچھی طرح کاشت کیا جا سکے۔ ہر کاشتکار کو محنت اور سرمایہ کے تناسب سے جنس کی صورت میں معاوضہ ملنا چاہیئے۔ اس طرح پھر کھیتوں کو یکجا کرنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی۔ زرعی سہولتیں یعنی بہتر قسم کے اوزار۔ بیج۔ اور آبپاشی وغیرہ بھی آسانی سے مہیا کی جا سکیں گی۔ روپیہ بھی جو آج کمیاب ہے بہتر ضمانت کی وجہ سے کم شرح سود پر مل سکے گا اور مختلف لوگوں کی ذہانت اور تجربہ سے اجتماعی فایدہ اٹھایا جا سکے گا۔

یہی نہیں کہ صرف مذکورہ بالا اقتصادی فائدے حاصل ہوں بلکہ اس طریقہ سے بہت سے بالواسطہ فائدے بھی پہنچیں گے۔ کاشتکار کو تنظیم کی قوت کا احساس ہو جائے گا۔ منڈی اُن کے موافق ہوگی وہ بہتر قسم کی فصل مہیا کر سکیں گے۔ اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں گے۔ مقدمہ بازی کی لعنت بڑی حد تک دور ہو جائے گی اور ان کا مستقبل زیادہ درخشاں اور امید افزا ہو جائے گا۔ مذکورہ بالا طریق کار کے

ماتحت ان زمینوں میں بھی جن میں آج مناسب انتظام نہونے کی وجہ سے یا تو کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے پیداوار بہت زیادہ بڑھ جائے گی (" کسان " سے یہاں وہ تمام زمیندار اور ان کے آسامی مراد ہیں جو خود کاشت کرتے ہیں)

مشترکہ کاشت کرنے سے ہمارا مقصد زراعت کے ساتھ ساتھ دودھ گھی کے کام سے بھی ہے۔ حسب ذیل وجوہ کی بنا پر ہم تجویز کرتے ہیں کہ کسان اب نہ صرف معمولی فصل پیدا کرنے کا کام کرے بلکہ وہ کھیتی کے ساتھ ساتھ دودھ کے مویشی بھی کافی تعداد میں پالے۔ اس کی وجہ سے دودھ دہی اس کے کھانے میں آسکیگا۔ اگر خالص دودھ اور مکھن نہ بھی استعمال کرسکیگا تو کم از کم مکھن نکلا ہوا دودھ تو اسے ملے گا جو بہر حال موجودہ خوراک سے تو بہتر ہی ہوگا۔ بہترین قسم کا کھاد کثرت سے مل سکے گا۔ عرصہ تک زمین سے بیش از بیش پیداوار حاصل نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ کھاد کی شکل میں زمین کو خوراک نہ پہنچائی جائے۔ اس کے علاوہ کسان اور اسکے خاندان کو کافی کام بھی مل جائے گا۔

فی الحال ہمیں یہ تشریح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس اسکیم کے ماتحت کسان کی محنت کی کس طرح اجرت دی جائے یا بیلوں کے کام اور زمین کا کیسے معاوضہ ادا کیا جائے۔ یہ سب تفصیلات تو مقامی حالات کے مطابق طے کی جاسکتی ہیں۔

اس اسکیم کے متعلق دو اعتراض کئے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ مختلف کھیت یا کسان کس طرح ملائے جائیں؟ اس کے مختلف طریقے ہوسکتے ہیں۔ بہترین صورت تو یہ ہوگی کہ اس غرض سے کوآپریٹو سوسائٹیاں قایم کی جائیں بشرطیکہ سرکاری اثر سے وہ پاک ہوں۔ اس ساری اسکیم کی کامیابی دراصل اس پر منحصر ہوگی کہ لوگ خوشی سے خود

اس میں شریک ہوں کیونکہ رائے عامہ کے وہی تو مظہر ہیں۔ یہ طریقہ حصول مقصد کا سب سے کم خرچ طریقہ ہے آج بھی زراعت کی بہبودی کے لئے سوسائٹیاں موجود ہیں لیکن اب تک انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ان میں سرکاری اثر زیادہ ہے اور ان کے منیجروں اور ممبروں میں نہ تو جوش عمل ہے نہ جدت کا جذبہ۔ دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ لوگ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں بنائیں۔ اس صورت میں حکومت ایک معمولی سی فیس رجسٹری مقرر کر دے۔ رجسٹرار صرف اس کی نگرانی رکھے کہ حسابات وغیرہ باقاعدہ رکھے جائیں اور کوئی بے عنوانی نہونے پائے۔

دوسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ کھیتوں کو ملا دینے سے بہت سے لوگ بے کار ہو جائیں گے اور اس طرح سارا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اولاً اگر موجودہ پیداوار موجودہ تعداد پر تقسیم ہو جائے اور محنت کم ہو جائے تو یہ طریقہ نعمت غیر مترقبہ ہوگا لیکن اس اعتراض کو رفع کرنے کے لئے ہم نے پہلے ہی اجتماعی کاشت کے ساتھ ساتھ مشترک کاشت کا طریقہ تجویز کیا ہے۔ ہمارے نزدیک ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا نہ ایک کے بغیر دوسری کامیاب ہوسکتی ہے۔ نئے وسائل اور نئی سہولتوں کی وجہ سے کاشت بھی وسیع پیمانہ پر ہونے لگے گی۔ اس طرح جو لوگ بیکار ہو جائیں گے وہ اس میں لگ جائیں گے۔ اس کے علاوہ دودھ مکھن وغیرہ کے کام میں بھی بہت سے لوگ لگ جائیں گے۔ فصل پیدا کرنے کا طریقہ بھی بدل جائے گا زیادہ تر جڑوں والی فصلیں پیدا کرنی ہوں گی جو زمین کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً آلو۔ گاجر۔ پیاز وغیرہ ان کے بونے سے کسان اور اس کے مویشی کو بہتر غذا مل سکے گی۔ بہرحال یہ سب تفصیلات ہیں اور مقامی حالات کے مطابق طے کی جا سکتی ہیں۔ ہر کسان کو اس کی ذاتی محنت یا اس کے بیل

کے کام کے عوض میں جہاں تک ممکن ہوگا جنس ہی دی جائے گی۔ نقد نہ دیا جائے گا۔ اس کے دو وجوہ ہیں پہلے تو ادائی میں آسانی ہوگی دوسرے یہ کہ ہر شخص کو زیادہ خوراک اور زیادہ چیزیں استعمال کرنے کو ملیں گی۔ اس اسکیم کے شروع کرنے کا یہی مقصد ہے ہمیں کامل یقین ہے کہ اگر بے غرض اور ایماندار لوگ سچے دل سے اس اسکیم پر عمل کرنا شروع کردیں تو اس کا کامیاب ہونا یقینی ہے اور غریب کسان کی بہت سی مصیبتیں اس سے دور ہوجائیں گی۔

نظام حقوق آراضی

زرعی اصلاح کے لئے سب سے پہلی اور ضروری چیز نظام حقوق آراضی ہے جاگیریں اور زمینداریاں دنیا کے ہر ملک سے قریب قریب نابود ہوچکی ہیں لیکن ہندوستان میں ابھی تک موجود ہیں۔ ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں کہ نظام حقوق آراضی میں فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی فارغ البالی کے راستہ میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ یہاں سب روپیہ جائدادوں میں لگایا جاتا ہے اور بالآخر وہیں رُک جاتا ہے۔ اس لئے نہ تجارت کے کام آتا ہے نہ صنعت کے۔ مہاجن یہ خیال کرتے ہیں کہ جائداد کی کفالت پر زمینداروں کو قرض دینے سے روپیہ زیادہ محفوظ رہتا ہے رفتہ رفتہ وہ خود زمیندار بن جاتے ہیں اور ان کا روپیہ جائداد میں رُک کر رہ جاتا ہے۔ گویا منقولہ سرمایہ کے لحاظ سے ملک کو اس قدر روپیہ کا نقصان ہوتا ہے۔ بہت سے ہندوستانی بنک جو تعلقہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے کاروبار کرتے ہیں بالآخر خود بڑی ریاست کے مالک بن جاتے ہیں اور ان کا روپیہ اس میں پھنس جاتا ہے۔ پرانے تعلقہ دار اور بڑے

بڑے زمیندار عموماً نکمے اور سماج کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں وہ کوئی نفع بخش پیشہ نہیں کرتے اور ملک کی دولت میں کسی طرح اضافہ نہیں کرتے۔ جو شخص وراثتاً بہت بڑی جائداد کا مالک ہو جائے اور بلا محنت و مشقت اسے کافی آمدنی ہوتی ہو تو فطرتاً وہ بداعمالیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر ہم ملک کے بڑے بڑے زمینداروں کے حالات پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی جائیدادیں زیادہ تر ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں اور وہ اس قدر مقروض ہیں کہ ان کی حالت بہت نازک ہو گئی ہے مختلف صوبوں کے محکمہ کورٹ آف وارڈس کی رپورٹیں دیکھنے سے اس امر کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ دور اندیشی کے ساتھ اپنے کاروبار کا انتظام نہیں کر سکتے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ان میں سے بعض حضرات اپنی رعیت کی بہبودی کا خیال کرتے ہیں اور ہر دلعزیز ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ زمین قدرت کا ایک عطیہ ہے اور کسی قوم کو اسے ناجائز طریقہ پر استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم ایسا کرتی ہے تو قدرت اس سے بدلہ لئے بغیر نہیں رہتی۔ اس لئے نظام حقوق اراضی کا سب سے بہترین طریقہ وہ ہے جس کے ذریعہ سے قوم کو اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار مل سکے بہت سے ماہرین اقتصادیات نے اس طریقہ کی برائیوں اور خوبیوں پر کافی روشنی ڈالی ہے لیکن عام رائے ہے کہ زمین اس شخص کی ملکیت ہونی چاہیئے جو اس میں کھیتی کرتا ہے۔ قوم کا مفاد اسی میں ہے اور قوم کی خوشحالی کا بنیادی اصول یہی ہے جملہ ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے کہ کھیتی کرنے والا شخص اپنی جوت کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ اور ایسے کسانوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو اپنے کھیتوں کے خود مالک ہیں۔

بالشویزم مقصود نہیں

ہماری یہ تجویز نہیں ہے کہ زمینداروں کو ان کی مقبوضہ جائیداد سے جو انھیں وراثت میں ملی ہو یا انھوں نے خریدی ہو ساقط الملکیت قرار دیا جائے کیونکہ یہ ناقابل عمل ہے۔ ہم انفرادی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قوم یا ملک کے مفاد کی خاطر انفرادی مفاد کو قربان کر دینا چاہیئے۔ ہماری یہ رائے ہے کہ حکومت اور پبلک دونوں کو متواتر اور مسلسل یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ کاشتکار کو حق ملکیت پہنچ جائے حکومت کی امداد سے یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے اگر کسانوں کو کم شرح سود پر کچھ رقم مل سکے جو ان سے ۵۰ یا ۶۰ سال کے عرصہ میں تھوڑی تھوڑی کر کے واپس لی جائے اور جس زمین کو وہ کاشت کرتے ہیں اُسے مناسب قیمت پر عدالت کے ذریعہ خرید کرنے کی اجازت ہو تو فوراً بہت سے کسان اپنی زمینوں کے مالک ہو جائیں گے۔ محکمہ کورٹ آف وارڈس بھی اس کام میں امداد کر سکتا ہے۔ یعنی کوئی جائیداد نیلام کے ذریعہ سے یکجائی فروخت کرنے کے بجائے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کسانوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرے۔ حکومت کو کم از کم ساکھ والے کسانوں کو تو کم شرح سود پر روپیہ مہیا کرنا چاہیئے یہی مقصد ایک دوسرے طریقہ سے بھی حاصل ہو سکتا ہے یعنی زمین کی قیمت قسطوار وصول کی جائے کسان اپنے لگان کے ساتھ قسط بھی ادا کر دیا کرے اور مقررہ میعاد کے بعد وہ اپنی زمین کا مالک ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے زمیندار کو نقصان پہنچائے بغیر کاشتکار اراضی کے مالک ہو سکتے ہیں۔ زمیندار کی خود کاشت کے لئے کچھ رقبہ مخصوص کرنے کے بعد باقی کسانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جس کو کسان

بذریعہ عدالت جب چاہے خرید کر سکے۔ اگر کسانوں کے مالک بنانے کے اصول پر عمل کر لیا جائے اور قانون کی مدد سے اس کی ترقی کے لئے پورے زور شور سے کوشش کی جائے تو پھر کسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کسی اصلاح کی ضرورت نہ پڑے گی۔

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی زمیندار اور کسان کی تفریق ملک کے امن و امان کیلئے فرقہ وارانہ جھگڑوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر سیاسات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کسان کے ساتھ اشتراک عمل کریں تو ضابطہ لگان کے سے پیچیدہ قانون آسانی سے منسوخ ہو سکتے ہیں اور اس پیچ در پیچ نظام کا خاتمہ ہو سکتا ہے جس میں صرف زمینداروں کے مفاد کے لئے شکمی کاشت وغیرہ کو تسلیم کیا جاتا ہے زمینوں کی مقدمہ بازی بھی کم ہو جائے گی۔ کیونکہ جب کسان زمین کے خود مالک ہوں گے تو بقایا لگان اضافہ لگان اور بیدخلی وغیرہ کے مقدمات نہوں گے۔ حکومت کو بھی افسران مال اور ان کے عملہ کی فوج کی فوج ملازم نہ رکھنا ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت بھی جو کسی نہ کسی شکل میں کسانوں کو موروثی حقوق دلانے کی کوشش کر رہی ہے اسی بنا پر اس تحریک کو پسند کرے گی۔ ہندوستان کے لئے وہ کیسا خوشگوار دن ہوگا جب کسان اور زمیندار کے درمیان تمام امتیازات بالکل اٹھ جائیں گے۔ اور ہر کھیتی کرنے والا خود زمین کا مالک ہوگا۔ اگر موجودہ کساد بازاری چند سال اور جاری رہی اور کسان کو ایک مرتبہ یہ یقین ہو گیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک قیمتیں اسی طرح گری رہیں گی تو آپ دیکھیں گے کہ دو سال کے اندر اندر تڑاز بردست ایجی ٹیشن زمیندار اور ان کی سرپرستی کرنے والی حکومت کے خلاف شروع ہوگا۔ کسی جگہ ہم نے یہ لکھا ہے کہ آج کل زراعت پر پیداوار کی قیمت سے زیادہ خرچ آتا ہے اور کسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اتنا زبردست لگان ادا کر سکے۔ چند

مواضعات میں زمینداروں اور کاشتکاروں میں تصادم ہوئے بھی ہیں۔ اگر اقتصادی اصول پر لگان کم نہ کیا گیا تو یہ کشمکش بڑھتی جائے گی اور فوج اور پولیس کے باوجود حکومت فاقہ کشوں کے حلق میں امن ٹھونس نہ سکے گی۔ زمینداروں کی حالت بھی ہر جگہ بڑی قابل رحم ہوتی جاتی ہے۔ ان کا منافع بھی بہت کم ہو گیا ہے اور وہ بھی اپنے مطالبات کو ادا نہیں کر سکتے ہیں وہ بری طرح مقروض ہیں اور ان کی جائیدادیں یا تو سرکاری مطالبہ کے عدم ادائی کے لئے یا اس روپیہ کے عوض میں جو انھوں نے سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے لئے قرض لیا تھا آئے دن فروخت ہو رہی ہیں۔ قانون انتقال آراضی یا اسی قسم کے اور قوانین بستر مرگ پر دم توڑنے والے شخص کے لئے کچھ عرصہ تک سنبھالے کا کام دے سکتے ہیں۔ لیکن انھیں بچانے میں موثر ثابت نہیں ہو سکتے۔ اگر حکومت یہ اعلان کر کے کہ قرضہ کے عوض میں جائیدادیں منتقل نہیں ہو سکتیں قرض خواہوں سے زمینداروں کا تحفظ کرنا چاہتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ کسانوں کو زمین کی خریداری کا حق نہیں دیتی؟ ۔ یہ ممکن ہے کہ کساد بازاری کی وجہ سے اس وقت کسان عام طور پر زمینیں نہ خرید سکتے ہوں۔ پھر بھی محض یہ خیال کہ انھیں حق مالکانہ حاصل ہو جاتا ہے بڑی حد تک ان کے لئے ہمت افزا ہوگا۔

آبپاشی کی اصلاح

زراعت کی اصلاح کے سلسلہ میں طرح طرح کی مشینوں کو رواج دینے کے خیال کی زیادہ تائید نہیں کی جا سکتی۔ ان مشینوں کے رائج کرنے سے بہت سے لوگ بے کار ہو جائیں گے۔ جن ملکوں میں مزدور مشکل سے ملتے ہوں اور مزدوری زیادہ ہو وہاں محنت بچانے والی مشینیں البتہ مفید ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس ملک میں کسان سال میں چھ مہینے سے زیادہ

بیکار رہتا ہے یا بالفاظ دیگر بیکاری ۵۰ فیصدی تک پہنچ گئی ہو ان مشینوں کا رواج دینا۔ وقت، روپیہ اور محنت برباد کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

زراعت کی ترقی آبپاشی اور کھاد کی سہولتیں بہم پہنچانے سے ہو سکتی ہے۔ زرعی ترقی کے لئے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ نہروں سے یا دیگر ذرائع سے آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ سرکاری افسروں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ نہریں کاشتکاروں کے لئے ہیں۔ کسان کو ذریعہ آمدنی بنانے کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دینا چاہیئے۔

آبپاشی کے محصول کی شرح فصل کی مالیت اور خرچ کے لحاظ سے مقرر کرنا چاہیئے نہریں اب ایک حالت پر قایم ہو گئی ہیں اور انمیں سے اکثر سے اچھی آمدنی بھی ہوتی ہے جو کسان نہروں کی مدد سے اپنی فصل تیار کرتے ہیں وہ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں (خواہ قانوناً انھیں یہ حق نہو) کہ جب ان کی فصل کو پانی کی سب سے زیادہ ضرورت ہو فوراً انھیں مل جائے کسان کو نہ صرف آبپاشی دینا پڑتی ہے بلکہ بہت زیادہ لگان بھی دینا پڑتا ہے۔ اس طرح نہر سے آبپاشی کئے جانے والے کھیتوں کا سرکاری مطالبہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے پھر بھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ صحیح وقت پر کافی پانی مل جائے گا۔ چاہے فصل بالکل خراب ہو جائے لیکن سرکاری مطالبہ معاف نہیں ہوتا یا اگر چند روپئے چھوڑ بھی دیئے جاتے ہیں تو اس سے کسان کے کیا آنسو پونچھ سکتے ہیں کیونکہ اس کی تو ساری فصل تباہ ہو چکی ہے ملک میں بے شمار کنوئیں ہیں لیکن چونکہ پانی نکالنے کے لئے سستی قوت متحرکہ میسر نہیں ہے اس لئے وہ بیکار پڑے ہیں۔ لہذا حکومت اور پبلک کے سامنے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ کافی تعداد میں کنوئیں مہیا کئے جائیں اور سستے داموں نل سے پانی نکالنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے علاوہ نہر کے نظام میں جو نقص ہیں انھیں دور

کر دیا جائے تاکہ صحیح وقت پر کافی مقدار میں پانی مل سکے اور محصول کھیت کی آمدنی کے لحاظ سے وصول کیا جائے۔ موجودہ حالات میں اوزاروں کی اصلاح۔ بہتر بیج کی تلاش یا بڑی بڑی تنخواہوں والے ماہرین کے ذریعہ تحقیقات کا سلسلہ یہ سب گویا قوم کے روپیہ کا برباد کرنا ہے زراعت کی ترقی اور بہتری کے لئے سب سے ضروری چیز پانی اور پانی کا سہل الحصول ہونا ہے۔ اس لئے کسان کی ترقی کا جو پروگرام بنایا جائے اس میں سب سے پہلی جگہ اسی کام کو دی جائے۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ نہروں پر ۴۶ روپیہ فی ایکڑ صرف آتا ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ اس سے کم رقم میں کسی مقام پر جہاں آبپاشی کے لئے زمین کی تہ میں پانی موجود ہو آبپاشی کا زیادہ بہتر اور قابل اعتماد انتظام ہو سکتا ہے اور اس سے نہ صرف پیداوار کا تحفظ ہو سکتا ہے بلکہ اس میں معتدبہ اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

یہ محض خیال خام ہے کہ مصنوعی کھاد ہندوستان میں کبھی فروخت ہو سکے گی سرکاری افسروں اور محکمہ ریل کی سرپرستی کے باوجود امید نہیں ہے کہ کسان اسے خریدنے کو تیار ہوں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس ملک میں ہوا سے نائٹروجن حاصل کرنے کے لئے بہترین حالات موجود ہوں وہاں ابتک اس کی ذرا بھی کوشش نہ کی گئی ہو کہ پودوں کو یہ مفید خوراک بہم پہنچائی جائے۔

ہمارے یہاں شورہ اور کھار کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں اور قدرت ہر جگہ ان چیزوں کو کثرت سے پیدا کرتی ہے لیکن اکسائز اور ریلوے کے طرز عمل کی وجہ سے یہ مفید اجزا جن سے اس ملک میں نائٹروجن کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے ہمیں میسر نہیں آتے محکمہ زراعت کی مطبوعہ رپورٹوں اور رسالوں میں تلاش کرنے پر بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ

مختلف فصلوں پر ان کھادوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ہندوستان ہی میں دستیاب ہوتی ہیں لیکن پھر بھی اس امر کی کوشش نہیں کی جاتی کہ یہ سستے داموں کسان کو مل سکیں ہڈیاں ہمارے ملک میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور لاکھوں من سالانہ باہر بھیجی جاتی ہیں اگرچہ آل انڈیا زراعتی بورڈ نے ان کی برآمد روکنے کی تجویز کی لیکن ابتک ان کی اس سفارش کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے۔ سرکاری ماہرین یہ کہتے ہیں کہ کسانوں کو ہڈیاں استعمال کرنے میں مذہبی اعتراض ہوتا ہے۔ کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ آیا حکومت نے اس قسم کی کھاد رائج کرنے کی کبھی کوئی کوشش کی۔ اور کسانوں کو اس کی خوبیاں سمجھانے کی زحمت گوارا کی۔ ماہرین زراعت کی تمامتر کوششیں مصنوعی کھاد پر مرکوز ہیں اور دیسی کھاد کی طرف قطعی بے التفاتی برتی جاتی ہے یہاں یہ بتلا دینا بھی بے موقع نہوگا کہ مصنوعی کھاد کے مقابلہ میں پسی ہوئی ہڈی۔ شورہ۔ اور کھاد پر ریل کا محصول زیادہ لیا جاتا ہے۔ ہندوستانی کسان کے عملی نقطۂ نظر سے گوبر وغیرہ۔ نہایت بہتر کھاد ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی سادے قسم کی کھاد ہے اور اپنے طور پر بالکل مکمل ہوتی ہے۔ سرکاری ماہرین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن، بہتر طریقہ پر اسے سڑانے کے لئے ابتک کسی قسم کی تحقیقات کرنے کی تکلیف نہیں کی ہے۔ البتہ یہ ارشاد ضرور ہوا ہے کہ ایندھن کے طور پر اسے استعمال کرنا کسان کی حماقت ہے۔ غریب کسان پر یہ الزام جب ہی لگایا جا سکتا کہ اسے اور کوئی سستا ایندھن مہیا کیا جائے اور پھر بھی وہ گوبر کے جلانے پر اصرار کرے۔

ہندوستان میں زیادہ تعداد میں لوگ گوشت نہیں کھاتے ہیں اس لئے انکی نجات تو صرف مشترک کاشت میں ہے۔ ہمیں اپنی تمام کوششیں مشترک کاشت کو پر منفعت

بنانے پر لگا دینا چاہیئے۔ اس سے کھاد کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ دودھ دینے والے مویشی پالنا اور خانگی استعمال یا باہر بھیجنے کے لئے مکھن۔ گھی وغیرہ تیار کرنا زیادہ تر اس چیز پر منحصر ہے کہ ملک میں ملاوٹ کا قطعی انسداد کر دیا جائے۔ اس بے عنوانی کے متعلق ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں لیکن جب تک پوری قوت کے ساتھ اس کا قلع قمع نہ کیا جائے دودھ دینے والے مویشیوں اور دودھ مکھن وغیرہ کی ترقی پر روپیہ صرف کرنا بالکل بیکار ہوگا۔ مزید تحقیقات کا سوال تو کھاد اور آبپاشی کا مناسب انتظام کر دینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات میں پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ ریسرچ کا پروگرام ہی بالکل دوسرے زاویہ نگاہ سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ پیمانے کی تحقیقاتیں ان ملکوں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں جو ان کا بار برداشت کر سکتے ہوں۔ لیکن اگر کسان کو نفع پہنچانا ہے تو ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے تو فی الحال زیادہ قابل عمل ریسرچ کی ضرورت ہے

دیہی صنعتیں

سب سے آخری لیکن نہایت ضروری کام یہ ہے کہ دیہاتوں میں گھریلو صنعتیں رائج کی جائیں۔ اولاً کاتنے اور بننے کے ذریعہ سب سے زیادہ آدمی بارروزگار ہو سکتے ہیں۔ اسکے بعد دودھ گھی کے کام کا نمبر ہے۔ اگر مشترکہ کاشت کی اسکیم کامیاب نہو تو ملک کی اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں سب سے پہلی جگہ دودھ گھی کے کام کو ملنی چاہیئے۔ یقین ہے کہ یہ کام ہمارے ملک میں بہت زیادہ کامیاب رہے گا لیکن اس وقت تک کامیابی ناممکن ہے جب تک ملاوٹ کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ ایماندار آدمی اسی وقت اس کام

کو شروع کر سکیں گے۔ جبکہ ملاوٹی دودھ گھی وغیرہ بیچنا میونسپلٹیاں جرم قرار دیدیں اور اس بدعنوانی کا سختی کے ساتھ انسداد کریں اس وقت اس صنعت کی کامیابی کے بڑے امکانات ہیں اور بے روزگاری بھی اس سے بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ اس طرح اچھے مویشیوں کی مانگ بڑھ جائے گی اور لوگوں میں مویشیوں کو عمدہ خوراک بہم پہنچانے کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ ادنیٰ قسم کے مویشی خود بخود کم ہو جائیں گے اعلیٰ نسل بڑھے گی اور صحیح اصولوں پر کام شروع ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے سرکاری ماہرین غلط طریقہ پر کام شروع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ناکامی ہوتی ہے۔ حکومت کو پہلے تو ملاوٹ کا انسداد کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد اعلیٰ نسل وغیرہ کا انتظام کرنا چاہیئے۔ تمام ریلوں پر بار برداری کی اور برف میں دبا کر بھیجانے کی سہولتیں بہم پہنچانا چاہیئے کسان کی اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں اس صنعت کو ہم سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

دوسری اہم صنعت ترکاریوں اور پھلوں کا تحفظ اور ان کا ٹین کے ڈبوں میں بند کرنا ہے۔ یہ کام بڑی آسانی سے شروع کیا جا سکتا لیکن ابتک اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی حالانکہ ہندوستان میں ۶۶ لاکھ روپیہ سالانہ کی ڈبوں میں بند کی ہوئی خوردنی اشیاء باہر سے آتی ہیں۔ ہندوستان میں آم بڑی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر حکومت کو قوم کا مفاد مدنظر ہوتا تو وہ ضرور اس پھل کی طرف توجہ کرتی اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھیجنے کا انتظام کرتی جس سے کسان کو کروڑوں روپیہ کا فائدہ ہو جاتا۔ بورڈ برائے فروختگی اشیاء اگرچہ بہت تاخیر سے قایم ہوا ہے لیکن پھر بھی اس کی کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ لیکن سچ پوچھیئے تو سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی اور معمولی صنعتیں بھی جاری کی جا سکتی ہیں مثلاً

صابون۔ سریش۔ نشاستہ۔ چھلکے اترے ہوئے جو وغیرہ وغیرہ زراعت کے علاوہ پھلوں اور ریشم کی کاشت بھی بڑے اہم اور پُر منفعت پیشے ہیں اور ان سے کسان کی قلیل آمدنی میں اچھا خاصہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ حکومت اور رہنمایان قوم دونوں کو ان صنعتوں کی ترقی کے لئے متواتر کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ سرکاری ماہرین کے تجربہ اور حکومت کی مالی امداد سے بڑی بڑی زرعی صنعتیں کسان خود بھی جاری کر سکتے ہیں۔ مثلاً شکر سازی نشاستہ سازی۔ کاغذ کی دفتی بنانا وغیرہ وغیرہ بدقسمتی سے شکر کے معاملہ میں بھی غریب کسان کا مفاد قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ شکر کی درآمد پر دو سو فیصدی تک محصول لیا جاتا ہے۔ کسانوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے شکر کے سب کارخانے سرمایہ داروں نے جاری کئے ہیں اور کسان ان کے رحم و کرم پر ہے حالانکہ حکومت کا کہنا یہ ہے کہ اس نے محض کسان کے مفاد کی خاطر یہ حفاظتی تدابیر اختیار کی ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی طبی کالج لائبریری
حیدرآباد۔ دکن